ادا جعفری

جو رہی سو بے خبری رہی

(خود نوشت)

ادا جعفری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

جو رہی سو بے خبری رہی

(خودنوشت)

ادا جعفری

JO RAHI SO BE KHA'BARI RAHI

(AUTOBIOGRAPHY)

BY

ADA JAFRI

RS: 200/-

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلا ہندستانی ایڈیشن: نومبر ۱۹۹۶ء | تعداد 500 | قیمت: 200/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلی میں طبع ہوئی

صباح، صبیحہ

ماہا اور شعاع

کے نام

دریچے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بڑی حویلی

وہ جو بے چین اور بے خبر اور ہجوم میں تنہا لڑکی تھی، یہ اس کی اور میری کہانی ہے۔ میرے اور اس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا صبح و شام کے بیچ آجاتا ہے۔ میرا اور اس کا وہی رشتہ ہے جو سوچ کا آواز سے ہوتا ہے۔ سوچ کی سرحدیں نہیں ہوتیں، آواز حدود میں گرفتار رہتی ہے۔ آواز سوچ کے ساتھ چلے، کبھی ایسا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی وہ میرے پاس ہوتی ہے کبھی صدیوں کے فاصلے پر۔

میں تو اسے بہت دور پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھی تھی مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مڑ کر دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ بدلتے موسموں کی دلداری اور دل آزاری دونوں پر یقین کرنے کے لیے کبھی کبھی بھولی بسری یادوں کو چھولینا بھی اچھا ہے۔ میرے پاس ایک حیلہ یہ بھی تو ہے کہ لوگ میری ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھتے ہی رہتے ہیں۔

یہ ایک ایسی کہانی ہے جو کہانی بھی نہیں ہے۔ ہاں ایک خاص زمانے کے رنگ تہذیب، طرزِ فکر اور طریقِ معاشرت سے دوبارہ ملاقات یا تعارف کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ وہ دکھ اور سکھ جو گئے زمانوں میں برتے ان کی حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ تو اب تک رگوں میں خون کے ساتھ رواں دواں ہیں جبکہ وہ ماحول جس میں، میں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا آج ناقابلِ یقین حد تک اجنبی ہو چکا ہے۔ مرد کو تو ہمیشہ اس دنیا اور زندگی میں اپنی ترجیحات پر اختیار حاصل رہا ہے لیکن عورت نے خود اپنی جھلک دیکھنے کے لیے بڑا طویل سفر کیا ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی عمر جہاں بسر کی وہ زندگی کا ایک نہایت محدود اور محفوظ علاقہ تھا۔ وہ قدیم، روایت پسند، تغیر پذیر، عجیب و

عزیز سوتی جاگتی دنیا۔ اس لڑکی کے لیے وہ دنیا بے حد پُراسرار تھی۔

کتابِ ذات کو کھول کر پڑھ جائے' کہاں ممکن ہے۔ اس کے اوراق تو تند شوریدہ سر ہواؤں میں اتنی تیزی سے پلٹ رہے ہیں کہ کہیں کسی صفحہ کا ایک لفظ' کسی ورق کی ایک سطر ہی پلّے پڑ جائے تو بہت ہے۔

مجھے یاد ہے وہ بڑی باقاعدگی سے روزنامچہ لکھتی تھی۔ اس کا تو رہن سہن ہی کتابوں میں تھا۔ لمحوں کی انگلی تھام کر چلتی اور لفظوں میں سانس لیتی۔ جذبوں کو پہچاننا ابھی اس نے کہاں سیکھا تھا۔ ہاں وہ روز و شب جو اس کے اندر ہی طلوع و غروب ہوتے ان کا حساب درج کرتی جاتی تھی۔ ۴۷ء کے فسادات میں ایک قتل اس ڈائری کا بھی ہوا تھا اور پھر میں ایک طویل عرصے کے لیے اکیلی رہ گئی تھی۔ اس اکیلے پن اور اس اُلجھے بکھرے بالوں والی لڑکی سے دوبارہ شناسائی کا احوال میری آنکھوں میں لکھا ہوا ہے۔

سامنے جیسے ایک البم ہے، جس میں کچھ اس کی' کچھ میری اور کچھ ان بیتے دنوں کی تصویریں ہیں۔ کہیں واضح' کہیں دھندلی۔ اس البم میں تصویریں ترتیب سے لگی ہوئی نہیں ہیں، اس لیے اس کہانی کو بے ربط بھی ہونا ہے۔

میری یادوں کے اس مرقّع میں جہاں محبتیں اور شفقتیں ہیں وہیں مجبوریاں اور محرومیاں ہیں۔ وضعداریاں بھی ہیں اور کم نگاہیاں بھی۔ حویلی میں اذانوں کے اجالے تھے' دعاؤں کے سویرے تھے، مگر طاقوں میں شرافت' امارت اور روایت کے بُت بھی سجے ہوئے تھے۔

اس عہد کی جو تصویریں ہیں ان میں کچھ عکس اس تہذیب کے نظر آتے ہیں جب اہلِ علم اور اہلِ فضل اعتراف اور پذیرائی کے جھمیلوں سے بے نیاز شفقت اور محبت کی گلابی دھوپ کی طرح اپنے آس پاس اُجالے بکھیرتے تھے۔

مذہب تھا تو وہ زبان پر ہی نہیں دلوں کے اندر بھی تھا۔ عمل میں تھا۔ لوگوں کے دل اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ شادی بیاہ کے گیتوں تک میں اللہ کی چاہت سموئی ہوئی تھی۔ دولہا کا سرا پڑھا جاتا تو اس کے پہلے بول ہوتے۔

علی نوشہ بنا سہرا بندھا مُشکل کُشائی کا

جسے مراثی بڑے جوش اور جذبے سے گایا کرتے۔

میری یادوں میں کچھ تصویریں زوال آمادہ جاگیرداری نظام کی ہیں۔ جب خاندانی وجاہتیں اپنے ماضی میں زندہ رہنے کی کوششوں میں مصروف رہتیں کہ بزرگوں کی قائم کی ہوئی روایات کی پاسداری ضروری تھی اور جاگیریں نسل در نسل مقدمہ بازی کی نذر ہوتی چلی جارہی تھیں اور جہاں واقعی دولت کی فراوانی تھی وہاں اس کو لٹانے کے انتظام بھی فزوں تر تھے۔ وراثت میں ملی ہوئی دولت و ثروت کی نمایش کا انصرام و انتظام فرض تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد کی جاتیں' مجرے ہوتے کیونکہ یہ بھی شرفاء اور امراء کی شان اور پہچان کے لوازم تھے۔

اسی شہر میں زندگی کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ کم حیثیت اعزا کی کفالت اس طرح کی جاتی کہ لینے والے ہاتھ کو دینے والے ہاتھ کی خبر نہ ہوتی۔ خاندان کے صاحب حیثیت افراد گھنیرے سائبان کی طرح تھے جس کی چھاؤں میں مجبور اور نادار رشتہ داروں کو تمام آبرومندی اور وقار کے ساتھ حالات کی کڑی دھوپ اور تمازت سے پناہ مل جاتی۔

مرد تھے جن کی جنبش ابرو پر زندگی بھر کی خوشیوں یا محرومیوں کے فیصلے ہوتے تھے اور بی بیاں تھیں جو ان فیصلوں کو دین ایمان کے احکام کا درجہ دیتی تھیں۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان اس لڑکی نے جنم لیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں مجھے وہ شاعرہ اپنے وجود سے علیحدہ ایک ہستی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی میری مجبوری کبھی میری پناہ گاہ۔

اب جو اپنے کاغذات کی زنبیل دیکھی تو پتہ چلا کہ جتنا دھیان میں اپنے گھر کا رکھتی ہوں اتنی ہی بے پرواہ اپنے کاغذات کے سلسلے میں ہوں۔ پلاسٹک کے ایک تھیلے میں کچھ تراشے ہیں اور کچھ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے پرزے۔ کسی پر تاریخ درج ہے کسی پر وہ بھی نہیں کیونکہ اپنی ایک ڈائری کے ضائع ہونے کے بعد میں نے باقاعدہ روزنامچہ کبھی

نہیں لکھا۔

آج جو میں اس لڑکی کو رُوبرو دیکھنا چاہتی ہوں تو بدایوں کے اسی گھر میں اور اسی بڑی حویلی میں جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ جہاں اس نے نو سال کی عمر میں سب سے چھپ کر پہلا شعر کہا تھا اور جب ڈرتے ڈرتے اپنی امی کو سنایا تھا تو ان کی آنکھوں سے شفقت کی پھوار برسی تھی۔

بدایوں، جہاں میں پیدا ہوئی تھی اس شہر کو میں نے ایک رہتے بستے شہر کی حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تاریخی مقامات اور مزارات جن کی زیارت کی خاطر لوگ دور دور سے آتے تھے وہ میرے لیے کہانیوں کی دنیا کی طرح تھے۔ میں نے انہیں دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا۔ میرے لیے وہ اس وقت بھی شہر کی تاریخ کے کچھ حوالے تھے اور آج بھی ہیں۔

کبھی کبھی ان مزاروں پر عرس کے موقع پر خواتین گھر کے مردوں سے چھپ کر چادریں اوڑھ کر ملازماؤں کے ساتھ جاتی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں ایسے پرہجوم مقامات پر جائیں اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مجھے یاد ہے ہمارے بہت اصرار اور بڑی خوشامدوں کے بعد ایک دو بار امی ہم تینوں بہنوں کو اپنے ساتھ لے کر بھی گئی تھیں۔ مگر وہ ہمارے لیے کسی تاریخی مقام کی زیارت سے زیادہ گھر سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کی خوشی ہوتی تھی۔

عرس کے موقع پر ایک طرف زنانہ حصہ بنا دیا جاتا تھا۔ بقیہ پوری عمارت اور میدان میں مرد ہوتے۔ اس ہجوم میں دور سے کبھی کوئی گنبد کبھی سبز ریشمی چادر اور پھولوں سے ڈھکا ہوا کوئی مزار نظر آجاتا تھا۔

ہمارے لیے تو سب سے پرکشش نظارہ وہ ہوتا تھا جہاں عورتیں لمبے کالے بال کھولے اس تمام ہنگامے اور ہجوم سے بے خبر عجب محویت کے عالم میں جُھوم رہی ہوتیں۔

ان کے پاس جاکر انہیں دیکھنے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی۔ وہاں بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کے لیے بڑے 'خطرے' تھے۔ کہا جاتا کہ یہ بدقسمت خواتین جنات کے

زیر اثر ہیں۔

یہ وہی جنات تھے جن کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے یا ناآسودہ خواہشات' محرومیوں' نامرادیوں اور تلخ حقیقتوں سے فرار کے جن۔ بہرحال یہ عورتیں مکمل طور پر ان کے قبضے میں تھیں۔

بدایوں ایک چھوٹا سا شہر تھا لیکن اپنی تہذیبی' علمی' ثقافتی اور تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ روایات کے مطابق اس شہر کو بدھ نام کے ایک راجہ نے بسایا تھا اور شروع میں اس کا نام بدھ مئو یا بیدا مئو تھا جو بعد میں مسلمان سلاطین کے زمانے میں بدایوں ہوا۔

مسلمان بادشاہوں میں اسے سب سے پہلے قطب الدّین ایبک نے فتح کیا اور یہ دلّی کی سلطنت کی شمالی سرحد اور ایک اہم فوجی چوکی قرار پایا۔ قطب الدّین ایبک کے بعد بھی ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے دورِ حکومت میں اس کی اہمیت برقرار رہی۔ بدایوں کی صوبے داری کو بڑی عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دہلی کا تخت حکومت ملنے سے پہلے شمس الدین التمش اور علاؤالدین خلجی بھی بدایوں کے حاکم رہے تھے۔

امیر خسروؔ نے تاج الدّین سنجر قتلو کو بدایوں کا حاکم مقرر ہونے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔

اے ز درگاہِ شہہ اقطاع بداؤں یافتہ
مسندے بالاتر از بالائے گردوں یافتہ

سلطان شمس الدّین التمش کے دورِ حکومت میں بدایوں شہر کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس بادشاہ کی سرپرستی میں ایک عالی شان جامع مسجد بھی تعمیر ہوئی جس کا نام شمسی مسجد تھا۔ اس کے علاوہ التمش نے اس شہر میں ایسا ماحول پیدا کیا کہ دہلی کے بعد بدایوں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت سے سامنے آیا۔ علماء اور مشائخ عرب اور عجم سے یہاں آتے اور یہیں کے ہو رہتے۔ یہ بستی اس زمانے میں اہلِ کمال کی بستی تھی اور پھر اس خاک سے بھی بہت سے صوفی' عالم فاضل اور حکیم پیدا ہوئے۔

یہ شہر خواجہ نظام الدّین اولیاؒ کا مولد اور بہت سے بزرگوں کی آخری آرام گاہ ہے۔

یہ وہی خاک تھی جس کے بارے میں امیر خسرو کہہ گئے ہیں۔

زبس کز مرقد اہل بصیرت منبع جوداست
بجائے سرمہ در دیدہ کشم خاک بداوں را

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اجداد بخارا اور غزنی سے لاہور ہوتے ہوئے بدایوں پہنچے تھے اور ان کے والد سید احمد، دادا حضرت علیؒ بخاری اور نانا حضرت سید عربؒ کے مزارات یہیں ہیں۔

بدایوں میں ایک جگہ پتنگی ٹولہ کہلاتی ہے جہاں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا طفلی کا زمانہ گزرا۔ والد فوت ہو چکے تھے۔ ان کی والدہ زلیخا بی بی جو خود ایک عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں سوت کات کر گزارہ کرتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جس دن گھر میں فاقہ ہوتا تھا والدہ محترمہ ان سے کہتیں۔ "نظام الدین امروز ما مہمان خدائیم۔" یہ وہ برگزیدہ ہستیاں تھیں جو اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہر آزمایش کو اس کا عطیہ سمجھ کر قبول کرتی ہیں۔ اس کم سنی میں بھی حضرت خواجہ اپنی والدہ کا مطلب سمجھ جاتے اور صبر و رضا کا پیکر نظر آتے۔

امیر خسرو کے مولد پٹیالی کی نسبت سے بدایوں کا ایک محلّہ بھی پٹیالی سرائے کہلاتا تھا۔

بدایوں کو مدینۃ الاولیا، اور پیراں شہر بھی کہا جاتا تھا۔ یہ شہر گنج شہیداں ہے جہاں نہ صرف آبادی کے باہر بلکہ گلی گلی میں شہیدوں کے مزار ہیں۔ مصحفی کا ایک شعر ہے۔

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس کی گلی گلی میں مزار شہید ہے

تاریخ کے صفحات پر دیکھتی ہوں کہ کیسے کیسے صوفیا، اہلِ علم، اہلِ فکر اور اہلِ دل اس خاک میں آسودہ ہیں۔ عہدِ اکبری کے عالم، شاعر اور مورخ عبدالقادر بدایونی، سالار مسعود غازی کے استاد میر ملہم شہید معروف بہ میراں جیؒ، خواجہ حسن شیخ شاہی موئے تاب معروف بہ سلطان العارفینؒ۔ سلطان العارفینؒ کے بھائی شیخ بدرالدینؒ جو خواجہ بختیار کاکیؒ

"کے ہم عصر تھے اور شاہ ولایت" کے لقب سے مشہور تھے۔

شاہ ولایتؒ کے استاد شیخ حسام الدینؒ ملتانی عرف حاجی جمال ملتانی اور سات احمدوں کے مزارات جو بدایوں کے مختلف مقامات پر آسودہ خواب ہیں جن کے بارے میں شاہ عبدالحقؒ محدث دہلوی نے فرمایا ع

ہفت احمد در بدایوں خفتہ اند

اسی شہر میں ملک الشعرا شہاب الدین مہمرہ کی آخری آرام گاہ ہے اور یہی شہر خواجہ حسن سنجریؒ کا مولد و مکتب رہا اور ان کے علاوہ بھی بہت سے نامور اور بے نام شہدا۔ یہ وہ بزرگ تھے جو دور دراز کی مسافتیں طے کرکے دین کی شمع روشن کرنے کے لیے ہندوستان آئے تھے۔ کچھ نے یہاں درباروں میں بڑے بڑے مراتب بھی پائے۔ کچھ کفر و ایمان کی جنگ میں شہید ہوئے اور کچھ صرف اللہ کا نام لے کر اٹھے اور انہوں نے دلوں کو فتح کیا۔

یہاں سلطان علاؤالدین کا روضہ بھی ہے جو لودھی خاندان کا پیش رو تھا اور اس کی والدہ مخدومہ جہاں کا مزار بھی جنھوں نے اپنی پوری عمر یادِ الٰہی میں بسر کی۔

میں بدایوں کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں۔ یہ میرا مقصد بھی نہیں ہے منصب بھی نہیں ہے۔ میں تو صرف ان چند لمحوں کے نام یاد کرنا چاہتی ہوں جو اس شہر میں میرے رازداں تھے۔ اس سلسلے میں بدایوں کا تعارف ناگزیر تھا۔

میں نے بدایوں کی شمسی مسجد آج تک نہیں دیکھی اور نہ ان بزرگوں کے مزارات کی زیارت ان کے کمالات کی روشنی میں کی۔ کبھی کسی عرس کے موقع پر امی کے ساتھ گئی بھی تو یوں جیسے کسی میلے میں شرکت کرتے ہیں۔

غیر ممالک میں بے نام سپاہی کی قبر پر گئی ہوں لیکن اپنے شہر میں ان نامور سپاہیوں کو سلام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

میں نے جاپان میں وہ درخت دیکھے جن کی عمر نصف صدی سے پوری صدی تک ہے لیکن جاپانیوں کے کمالِ باغبانی نے جنہیں ننھے ننھے پودوں کے قد و قامت میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ روم میں آثار قدیمہ اور مائکل انجلو کے بنائے ہوئے مجسموں کا دیدار کیا۔ نیویارک اور پیرس کی آرٹ گیلریوں میں مصوری کے شاہکاروں کی زیارت کی۔ روس میں زار پیٹر کا مجسمہ دیکھا لیکن بدایوں میں جو قلعہ کی فصیلوں کے شکستہ آثار تھے وہ کبھی نہیں دیکھ سکی۔ میری پوری دنیا اس پھاٹک کے اندر آباد تھی جسے "ٹونک والوں کا پھاٹک" کہتے تھے۔

شہر کی واحد کشادہ سڑک کے ایک طرف محصول چنگی وصول کرنے کی چھوٹی سی کوٹھری اور اس کے مقابل دوسری جانب اونچی مغرور قلعہ نما عمارت' پتہ نہیں شہر یہاں سے شروع ہوتا تھا یا ختم ہوتا تھا۔ آگے کھیت اور میدان نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے بچپن میں میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کبھی خاندان کے لڑکوں کی طرح میں بھی اس سڑک پر پیدل چلوں اور تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ میں پوری دنیا گھوم لوں لیکن میرے قدم اس سڑک کو کبھی نہ چھو سکیں۔

یہ قلعہ نما' میری ننھیال کا گھر تھا۔ اس ایک گھر میں کئی گھر تھے۔ بڑی حویلی' چھوٹی حویلی' دیوان خانہ اور نانا کی کوٹھی۔ یہ گھرانا بدایوں میں "ٹونک والا خاندان" کہلاتا تھا۔ خاندان کے کسی بزرگ نے ریاست ٹونک میں کوئی عہدہ یا مرتبہ پایا تھا۔ وطن واپس آکر کچھ اسی نقشے پر اس گھر کی بنیاد رکھی۔

سڑک پر اس مضبوط پشتوں والی عمارت کی دیوار کے ساتھ آگے چل کر بائیں جانب ایک تنگ سی گلی ملتی تھی ۔ جو اس عمارت کے پھاٹک کے پاس پہنچتی تھی۔ یہ بہت ڈھلوان چڑھائی اور پیدل جانے والوں کا راستہ تھا۔ اسی سڑک پر کچھ اور آگے بڑھ کر ایک کشادہ گلی یا سڑک تھی۔ یہاں ڈھلوان رفتہ رفتہ کم ہو گئی تھی ، اور یہ گلی اس عمارت تک آنے جانے کا باقاعدہ راستہ تھی۔ اس گلی یا سڑک کے اختتام پر بائیں ہاتھ کو مڑتے ہی سامنے پھاٹک نظر آتا تھا۔

پھاٹک جو ہمیشہ بند رہتا تھا، جس کے لکڑی کے بھاری کواڑ پیتل کی پتریوں، کیلوں اور مختلف رنگوں کے نقش و نگار سے مزیّن تھے۔ شاید بزرگوں میں سے کبھی کسی نے ہاتھی پالا ہو تو اس کی آمدورفت کے لیے پورا دروازہ کھلتا ہوگا۔ اب تو نانا کی موٹر اور لی یوں کی سواری گزرنے کے لیے ایک پٹ ہی کھلتا تھا۔ اسی کواڑ میں ایک کھڑکی تھی جو دن بھر عام آمدورفت کے لیے کھلی رہتی تھی اور رات کو مقفل کردی جاتی تھی۔ صرف شادی کی تقریب یا کسی خاص دعوت کے موقع پر میں نے اس پھاٹک کو پورا کھلا ہوا دیکھا۔

پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا صحن اور بائیں جانب کچھ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ بلدیو چوکیدار کے رہنے کا ٹھکانا تھا۔ پھاٹک کے دروازوں کی چابیاں اسی کے پاس رہتی تھیں۔

اس سے آگے گزرگاہ کو عبور کرکے ایک نسبتاً" بڑا صحن ملتا تھا۔ اس صحن کے اندر سب حویلیوں کے دروازے کھلتے تھے۔ سامنے ایک ٹین کی چھت کا برآمدہ اور اس کے پیچھے ایک دالان تھا۔ برآمدے میں نوکروں کی چارپائیاں بچھی اور کھڑی رہتی تھیں۔ ملازمائیں گھروں کے اندر رہتی تھیں۔ دالان میں چوکیوں کے فرش پر برابر کے فاصلے سے تین ڈیسک رکھے ہوئے تھے جن کے پیچھے تین منشی بیٹھے رجسٹر کھولے ہوئے حساب کتاب میں منہمک نظر آتے تھے منشیوں میں سے دو کے نام مجھے یاد ہیں، منشی شمس الدّین اور لالہ پربھودیال۔

میں بڑی حویلی میں پیدا ہوئی۔ عجیب حقیقت ہے کہ بڑی حویلی کو اپنا گھر کہتے ہوئے ایک سفاک یاد میرے رُوبرو آجاتی ہے۔ جب مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ میں یہاں رہتی ہوں لیکن یہ میرا گھر نہیں ہے۔

ٹونک والا خاندان میں بیٹیاں بیاہ کر سسرال نہیں بھیجی جاتی تھیں۔ داماد آکر رہتے تھے یا پھر آتے جاتے رہتے۔ میرے والد مولوی بدرالحسن (مرحوم) نے شاید سسرال کا یہ اصول گوارا نہیں کیا۔ انھوں نے کانپور میں ملازمت اختیار کرلی۔ میری والدہ سال میں ایک مرتبہ بچّوں کے ساتھ اپنے شوہر کے گھر بطور مہمان جایا کرتی تھیں۔ پہلے بھی امّی مجھے

ساتھ لے کر گئی ہوں گی۔ لیکن مجھے اپنا اور امی کا آخری بار کانپور جانا یاد ہے۔ اس وقت میری عمر تین سال کی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔

مجھے وہ گھر بھی یاد ہے۔ چھوٹا سا آنگن' آنگن کے اطراف دالان اور دالانوں کے پیچھے کمرے۔ ایک پتلا سا زینہ چھت پر جاتا تھا۔ میری دونوں بڑی بہنیں' سلائی سیکھتیں یا پڑھائی میں مصروف رہتیں۔ میں ان کے کمرے میں جاتی تو مجھے باہر نکال دیا جاتا۔ کسی دوپہر امی کی نظر بچا کر میں چھت پر چلی جاتی۔ چھت کے ایک حصے پر ایک درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس درخت کے پھل یا شاید اس کے بیج تھے' املی کے بیجوں کی طرح جو ہوا کے جھونکے سے چھت پر گرتے تھے۔ میں ان بیجوں کو اکٹھا کرتی پھر ان سے کبھی ریل گاڑی کبھی گھر بنایا کرتی بلکہ گھر کا نقشہ کہنا چاہیے۔

میں نے سنا ہے کہ میرے والد نہایت متقی پرہیزگار انسان تھے۔ عالم باعمل۔ امی کہتی تھیں کہ بعض اوقات ان کے ملاقاتی بڑے عجیب و غریب قسم کے لوگ ہوتے۔ یہ سب مردانہ کمرے میں بیٹھ کر "ذکر" کرتے۔ کبھی قوالی کی محفلیں ہوتیں، کبھی کسی کو حال آجاتا۔

میرے والد اپنی پوری تنخواہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں میں بانٹ دیتے اور خود اپنی زمینوں سے جو آمدنی ہوتی اس میں گزارہ کرتے تھے۔ بدایوں کی اسی فیصد آبادی زمینداروں پر مشتمل تھی۔ کسی کے پاس سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے بھر زمین تھی تو کسی کے پاس کئی کئی گاؤں اور باغات۔ لوگوں کی آمدنی کا خاص ذریعہ زمین ہی تھی۔

تین سال کی عمر میں اپنے والد کے گھر مختصر قیام کے دوران میری ملاقات بھی ان کے ایک ایسے ہی مہمان سے ہوئی۔ مجھے ان کی شکل یاد نہیں 'بس وہ کالا کمبل یاد ہے جو وہ ہروقت لپیٹے رہتے تھے۔ گھر کے باہر ایک کھلا برآمدہ تھا۔ وہاں زمین پر بیٹھے ہوئے ہروقت اللہ ھو کہتے رہتے۔ کبھی آہستہ آہستہ کبھی زور زور سے۔ میرے والد کبھی ان کے پاس جاکر بڑے ادب سے بیٹھ جاتے۔

جب وہ صبح کو دفتر چلے جاتے تو میں وہیں برآمدے میں انہی بزرگ کے نزدیک کھیلتی

رہتی۔ میں ان کو اللہ ھو کہتی تھی۔ کبھی وہ اللہ ھو کہہ کر اشارے سے مجھے اپنے پاس بُلاتے اور تربوز کے بیج کھلاتے۔

یہ میں نے سنا ہے کہ ایک دن وہ اچانک وہاں سے اُٹھ کر چل دیے۔ ان کے پیچھے پیچھے میں بھی روانہ ہوگئی۔ اتفاق سے والد کے کسی دوست کی نظر پڑ گئی اور وہ مجھے اُٹھا کر گھر پہنچا گئے۔

یہ میری یاد میں اپنے باپ اور ان کے ایک عجیب دوست سے میری پہلی ملاقات کا زمانہ تھا۔

کچھ دن بعد میرے والد بیمار ہوگئے۔ ان کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی تھی۔ علاج ہوتا رہا اور زخم بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ناسور کی شکل اختیار کرلی۔ میرے رشتے کے چچا اور چچی بھی تیمار داری کے لیے بدایوں سے آگئے تھے۔ والد کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہیں تھے۔ پھر سب لوگ ان کو لے کر بدایوں آگئے۔

اس کے بعد میری یاد میں میرے والد کا بدایوں کا گھر ہے۔ جہاں ایک بڑے دالان میں ایک بہت بڑے پلنگ پر وہ سفید چادر اوڑھے آرام کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس وقت مجھے وہ پلنگ پورے دالان کی لمبائی کے برابر نظر آیا تھا اور وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے جسم' اس پورے پلنگ پر دراز تھا۔ اور پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور لوگ رو رہے تھے اور اَمّی نہ جانے کہاں تھیں۔ میری دونوں بہنیں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ بس بے شمار لوگ تھے اور ان کے بیچ میں تنہا میں تھی۔ پھر کسی خالہ یا پھوپھی نے گھر کے بوڑھے ملازم کے حوالے کردیا اور وہ مجھے واپس بڑی حویلی میں لے آیا تھا۔ میں رو رہی تھی' چیخ رہی تھی کہ میں اپنے گھر جاؤں گی یہ میرا گھر نہیں ہے۔ اس کے بعد کبھی مجھے وہ گھر اپنا گھر نہیں لگا۔

رات تک اَمّی بھی سفید چادر اوڑھے بڑی حویلی میں آگئیں۔ زندگی کا ایک باب ختم ہوچکا تھا۔ پھر وہ ہجوم بڑی حویلی میں آگیا اور پھر میں تنہا رہ گئی۔

میں آج بھی نہیں جانتی کہ تین سال کا بچہ کچھ واقعات کو اتنی تفصیل کے ساتھ یاد رکھ

سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عمر میں مجھ پر باپ کی جدائی کا جو سانحہ گزرا اور گھر میں بھی کئی سال تک وہی واحد موضوعِ گفتگو رہا اس نے ان تمام یادوں کو ذہن پر اس طرح مرتسم کردیا کہ ان سے چھٹکارا پانا ممکن نہ رہا۔

اس آئینے نے جو پہلی صورت دیکھی وہ جدائی کی تھی۔

حاصل کی ہوئی چیزوں کو تو بچہ خود رکھ کر بھول جاتا ہے لیکن محرومی اپنا احساس بار بار دلاتی ہے خاموشی یادوں کو بار بار دہراتی ہے۔

میں نے ایک عالم تنہائی میں لگاتار پانچ سال اپنے باپ کا انتظار کیا۔ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ علاج کے لیے سب سے بڑے حکیم کے پاس گئے ہیں۔ بڑوں کے کہے ہوئے اس مصلحت آمیز جملے کو نادان ذہن نے بہت احتیاط سے سنبھال لیا تھا' اور انتظار کے کانٹوں بھرے صحرا میں ایک طویل تھکا دینے والا سفر شروع ہو گیا تھا۔

ان آباد حویلیوں اور نانا کی جھاڑ فانوسوں سے آراستہ کوٹھی سے رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ مجھے تو وہی چھوٹے سے آنگن والا مختصر سا گھر یاد تھا جہاں چند دن اپنے والد کے سائے میں گزارے تھے۔

"جب وہ واپس آجائیں گے......" یہ صرف ایک خیال ایک یقین نہیں تھا۔ ایک مہیب سایا تھا جو ہر خوشی' ہر اُمنگ کو ڈھانپے ہوئے تھا۔

حویلی میں میری ہم عمر رشتے کی بہنیں بھی تھیں۔ لیکن اَمّی کہتی تھیں کہ اس سانحے کے بعد مجھے کسی کھیل میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بے حد خاموش 'گم صم' تنہا نشین ہو گئی تھی۔

والد کی وفات کے تین ماہ بعد میرا اکلوتا بھائی پیدا ہوا۔ طیّب حسن صدیقی' خدا سلامت رکھے۔

ایک عرصے کے بعد جب اَمّی کو گردوپیش کا ہوش آیا تو انہیں اپنی چھوٹی بیٹی کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ اور ایسے میں اسی شفیق اور مہربان ہستی نے خصوصی توجہ کی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ دی جس کے قدموں تلے جنّت اور جو سراپا عافیت ہوتی ہے۔

کھلونوں سے دلچسپی نہیں تھی' انہوں نے کاپیوں اور پنسلوں کے ڈھیر سامنے لگا دیے۔
رفتہ رفتہ انہوں نے مجھے کتابوں کی رفاقت میں رہنا سکھایا۔

اب یہ یقین دلانا آسان نہیں تھا کہ ایسے جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ چنانچہ ایک صبح امّی نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ مجھے لے کر وہاں گئیں جہاں زندگی پر موت کی فتح کے تمام آثار اپنی تمام دل آزاریوں کے ساتھ آنکھوں کے آگے موجود ہوتے ہیں۔

میں جو کرب انتظار کی طویل ترین صدیاں جھیل کر اپنے باپ کی قبر کے پاس پہنچی تھی اس وقت ایک عجیب لاتعلّقی کی کیفیت سے آشنا ہوئی۔

پھر میں نے شعوری طور پر انہیں کبھی یاد نہیں کیا۔

گوشۂ عافیت

انتظار کے عفریت سے رہائی مل گئی، مگر بچپن اپنی سوچ کی تنہائی میں اسیر ہو چکا تھا۔ چاروں جانب ایک اَن دیکھی حدِ فاصل موجود تھی۔

گھر میں محبتیں حاصل تھیں مگر میں نہ جانے کہاں تھی۔ دھیان کی دنیا میں جیتی' ہواؤں سے باتیں کرتی اور بادلوں میں گھر بناتی، جیسے اپنے آپ کو کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔

اور پھر امّی نے راہِ نجات دکھائی۔ پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہ میرے لیے گویا ایک نئی دنیا کی دریافت تھی۔

خوش قسمتی سے کچھ عرصے بعد ہی اپنی زندگی کی پہلی لائبریری تک میری رسائی ہوئی۔ ٹونک والا پھاٹک کے اندر صرف دیوان خانے کی عمارت اپنا علیحدہ وجود رکھتی تھی۔ بقیہ تمام حویلیاں اور نانا کی کوٹھی علیحدہ علیحدہ مکان کی حیثیت رکھنے کی باوجود ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانے کے لیے دروازے کے بجائے صرف زینہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ان تمام مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے سے ملحق تھیں اور ان چھتوں پر بھی کئی چھوٹے چھوٹے مکان نما حصّے بنے ہوئے تھے جنہیں دوسری منزل نہیں بلکہ دوسری منزل پر بنے ہوئے مکانات ہی کہا جا سکتا ہے۔ مختصر سے صحن کو گھیرے ہوئے دالان' ایک دو کمرے وغیرہ جو مہمانوں کی آمد کے ساتھ آباد ہوتے تھے۔ ایسے ہی کسی کسی گوشۂ تنہائی کو گھر کے جوان لڑکے مطالعہ گاہ کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ چھوٹی حویلی کی چھت پر ایک نسبتاً" کشادہ اور خوبصورت سا گھر بھی تھا۔ دو کمرے اور آگے لکڑی کے کٹاؤ دار محرابی دروں اور ستونوں

والا برآمدہ۔ برآمدے کے سامنے صحن' اور صحن کے مقابل ایک اور دالان۔ اس دالان سے بھی ایک زینہ چھوٹی حویلی میں جاتا تھا اور آگے دیوار میں جو مختصر سی کھڑکی تھی وہ اس کو بڑی حویلی کی چھت سے ملاتی تھی۔

یہ محرابی دَروں اور منقّش ستونوں والا برآمدہ میرے لیے غیر معمولی دلچسپی کا مرکز بن گیا تھا۔ اس برآمدے کے ایک کونے میں زمین پر کتابوں' رسالوں اور مخطوطوں کا ایک ڈھیر تھا۔ کچھ کرم خوردہ' کچھ درست حالت میں اور کچھ صرف زرد رنگ کے پھٹے ہوئے بکھرے ہوئے کاغذ کی صورت میں، گردو غبار کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے خوابیدہ خوابیدہ۔ ویسے بھی میرے اس اوّلین کتاب گھر کا ماحول کچھ خوابناک سا تھا۔ عموماً اس حصّے کی طرف گھر والوں میں سے کوئی نہیں آتا تھا۔ دونوں کمرے مقفّل تھے اور میں نے کبھی ان کمروں کو کُھلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہاں زنجیرِ دَر کو بھی دستک کی اجازت نہیں تھی اس لیے بڑی پُراسرار اور دل پذیر سی خاموشی بکھری ہوئی تھی۔

میں وہیں زمین پر بیٹھ جاتی۔ ڈھیر میں اردو' فارسی اور انگریزی کی کتابیں تھیں۔ شاید ترکی زبان کی بھی ہوں۔ میں پڑھنے کے لیے بڑی کوشش سے اردو کی کسی آسان سی کتاب کا انتخاب کرتی لیکن شروع شروع میں ان کتابوں کو پڑھنے میں بہت دِقت ہوتی تھی۔ پوری کتاب پڑھ جاتی اور سمجھ میں کچھ نہیں آتا، پھر دوبارہ اسی کتاب کو پڑھتی۔ اکثر تین تین' چار چار بار ایک کتاب کو پڑھتی، کچھ لفظوں کے معنی پھر بھی سمجھ میں نہ آتے۔گھر کے کسی بڑے سے لفظ کے معنی پوچھنے میں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں میری اس نودریافت لائبریری میں میرا جانا ہی موقوف نہ ہو جائے اور پھر یہ بھی تھا کہ یہ تو میرا اپنا راز تھا میں اس میں دوسروں کو شریک کیوں کرتی۔

پھر کسی لغت کے پھٹے ہوئے اوراق میرے ہاتھ لگ گئے۔ اس سے بڑی مدد ملی مگر یہ تھوڑے سے ورق تھے۔ ان اوراق میں جتنے الفاظ تھے چند دنوں میں میں نے وہ سب حفظ کر لیے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ قافیہ پیائی کے بجائے میری شاعری کی ابتدا نظم گوئی سے ہوئی اور امی کی اجازت سے ایک دو نظمیں شائع بھی

ہو چکی تھیں۔

اب مجھے یہ بھی خیال تھا کہ کسی شعر میں زبان و بیان کی غلطی نہ رہ جائے۔ مجھے ایک لغت کی سخت ضرورت تھی۔ بزرگوں سے فرمائش کرنے کا تصوّر میرے ذہن میں نہیں تھا اور مشکل یہ تھی کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ کتاب خرید سکوں۔

ویسے تمام ضروریات بطریقِ احسن پوری ہوتیں۔ بچّوں کے لیے بزرگ جن چیزوں کی ضرورت محسوس کرتے فوراً مہیا ہو جاتیں۔ جیب خرچ ملنے کا دستور نہیں تھا۔ عید' بقرعید پر یا انعام کی صورت میں ہماری آمدنی ہوتی تھی اور وہ کتاب "لغات کشوری" جو میں خریدنا چاہتی تھی اس کی قیمت میری قوتِ خرید سے بہت زیادہ تھی۔ میں نے اس کتاب کا اشتہار کسی رسالے میں دیکھا تھا۔

میری خوش قسمتی کہ انہیں دنوں نانا نے میرا امتحان لینے کا فیصلہ کیا اور مزید خوش قسمتی یہ کہ جس لفظ کے معنی انہوں نے دریافت کیے وہ لغت کے ان صفحات میں موجود تھا جو میرے ہاتھ لگے تھے۔

نانا کی شفقتیں اور محبتیں لا انتہا تھیں۔ ہماری ہر خوشی انہیں عزیز تھی۔ ایک دن بڑی حویلی میں آئے تو مجھے بلایا، کہنے لگے۔

"اب آپ کا کلام رسالوں میں چھپ رہا ہے۔ ابھی تک ہم شاعروں سے بڑے مرعوب ہوا کرتے تھے کہ یہ لوگ بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ہم سے زیادہ علم و دانش رکھتے ہیں، اب آپ شاعرہ ہیں۔ ہاں تو شاعرہ صاحبہ! آپ ہمیں ایک لفظ کے معنی بتایئے۔"

دل میں دعائیں مانگتی میں ان کے پاس آئی۔ انہوں نے "تبخال" کے معنی پوچھے۔ یہ ان الفاظ میں سے ایک تھا جن کے معنی میں رٹ چکی تھی۔ میں نے بڑی روانی سے بولنا شروع کیا۔

"بخار کے بعد جو کبھی ہونٹوں پر چھالا سا پڑ جاتا ہے اس کو "تبخال" یا "تبخالہ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ تپ خال سے بنا ہے۔"

بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

"اب فرمایئے کیا انعام چاہیے"

اس طرح نانا نے مجھے "لغات کشوری" خرید کر دی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس امتحان میں فیل ہو جاتی تو وہ خود لغت کی ضرورت مجھے سمجھاتے اور خرید کر دیتے۔

بدایوں سے آخری بار رخصت ہوتے وقت یہ کتاب ساتھ لینا میں نہیں بُھولی تھی۔ آج بھی میرے پاس ہے۔

میں جب نانا کہتی ہوں تو میری مراد اپنی نانی کے بھائی مولوی ظہور حسن سے ہوتی ہے جن کی شفقتیں اور محبتیں ہم بھائی بہنوں کے لیے بے پایاں تھیں۔

میرے جو حقیقی نانا تھے انہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ سنا ہے کہ میری پیدائش سے بہت پہلے انہوں نے دوسری شادی کرلی تھی اور "ٹونک والا پھاٹک" کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا۔

پھاٹک کے اندر کئی گھر تھے اور سب ان کے قریبی رشتہ دار' لیکن دوسری شادی کے بعد وہ کبھی کسی گھر میں نہیں آئے اور نہ میرے علم میں کبھی کسی نے ان کے بارے میں گفتگو کی۔

میری نانی کے والد مختلف ممالک کی سیر اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے ملک سے باہر گئے تھے۔ ان کا سفرنامہ نانا کے پاس محفوظ تھا جس کے کچھ حصے ہم لوگوں نے سنے تھے۔

ترکی میں انہوں نے وہاں کے ایک معزز خاندان میں شادی کی جن کا شجرہ نسب اپنے ساتھ لائے تھے۔ پہلی خاندانی بیوی موجود تھیں جن سے اولاد نہیں تھی۔

دوسری بیوی دو بچوں کی ماں بنیں لیکن کہا جاتا تھا کہ خوش نہیں رہیں۔ شاید اس زمانے کے رسم و رواج کی بھاری زنجیروں سے ان کا سمجھوتا نہیں ہو سکا۔ یا شاید اپنے شوہر کے گھر میں تمام عمر ایک اجنبی کی طرح رہنا راس نہ آیا ہو۔

چھوٹی حویلی کی چھت کے اوپر جو لکڑی کا برآمدہ میری خفیہ لائبریری بن گیا تھا وہ اور اس کے پیچھے دو کمرے جو میں نے ہمیشہ مقفل دیکھے انہیں کے لیے تعمیر ہوئے تھے۔ میری پرنانی وہاں رہتی تھیں۔ اپنے وطن اور اپنے ماضی کی خوشبو سے ہزاروں میل دور۔ نہ جانے کن تنہائیوں اور کتنی جدائیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ تنہا۔ اور اب ان کی اولاد میں سے ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی اپنے آپ میں کھوئی ہوئی اور اپنی ہی دنیا میں اکیلی اس الگ تھلگ گوشے میں آپہنچی تھی۔

اپنے بزرگوں سے چھپ کر دوستی اور رفاقت کی تلاش میں کتابوں کے پاس جانا بڑی دلکش اور محبوب مصروفیت تھی۔ شاید کبھی انہوں نے بھی اسی طرح دوستی اور رفاقت تلاش کی ہو۔ یہ کتابیں جن کے اوراق وقت کی سنگین بے حسی نے بوسیدہ کر دیے تھے میرے لیے محبت بھرے لمس کا اثر رکھتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ۱۹۶۸ء میں واشنگٹن میں جب ہماری میزبان نے کہا یہ "لائبریری آف کانگریس" ہے تو میں نے اس عمارت کو ممنون شکر گزار نگاہوں سے دیکھا تھا۔ بچپن میں کتابوں نے میرے ساتھ مسیحائی کا کام کیا تھا۔ میں نے حرف کی سرگوشیاں سنی تھیں۔ لفظ کو اپنے بھید بتائے تھے۔ میں نے کتاب کو انسان کے مقابلے میں حیات سے قریب تر دیکھا تھا۔ جب میں اندھیروں کے جنگل میں کھو گئی تھی اور میں نے جگنوؤں سے اُجالا چاہا تھا تو یہ میرے رہنما ستارے بن گئی تھیں۔

دنیا کے اس پہلے یا دوسرے نمبر پر سب سے بڑے کتب خانے کی عمارت کو دیکھتے وقت دل عقیدت اور محبت کے جذبات سے اُمنڈ رہا تھا۔

وہ اُلجھے سلجھے بالوں والی لڑکی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور میں جو دنیا گھومنے نکلی تھی اس بے خبر سے اپنا پتہ پوچھ رہی تھی۔

بیتے ہوئے سادہ اور بے رنگ لمحوں کے نقوش قدم بھی کبھی کبھی دل میں لَو دے اُٹھتے ہیں۔ واشنگٹن میں نور کا ای ڈی آئی (اکنامک ڈوِلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ) کا کورس مکمل ہونے کے بعد واپسی سے پہلے میں نے نور سے فرمایش کی کہ لائبریری آف کانگریس کی جو عمارت ہماری امریکن میزبان نے ہمیں باہر سے دکھائی تھی' جہاں سارے گزرے ہوئے

زمانے آج بھی اپنے تمام جلال و جمال کے ساتھ موجود ہیں میں اس ماحول کا تاثر اپنے ذہن اور دل کے کسی گوشے میں محفوظ کرلینا چاہتی ہوں۔ کتابوں کا جیتا جاگتا وجود میری زندگی کا اولین تجربہ تھا۔ اور جب اس پُر شکوہ عمارت کے اندر قدم رکھا اس وقت کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے ماضی کے تمام لمحے مجسم ہو کر سامنے آجائیں گے۔

"لے سانس بھی آہستہ..."

پوری عمارت میں احترام آمیز سکون و سکوت چھایا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے ہی قدِ آدم سے اونچے خوبصورت تراشیدہ ستون پر بجلی کا قمقمہ روشن تھا۔ لوگ دبے قدموں چل رہے تھے۔ مختلف کمروں میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مطالعے میں منہمک اور عملے کے اراکین اپنے دفتری کام میں مصروف تھے۔ کشادہ ہال میں گٹن برگ بائبل کا نسخہ شیشے کے ایک خاص خول میں نمائش کے لیے رکھا ہوا تھا۔ یہ دنیا کی اوّلین طبع شدہ بائبل ہے۔

محرابی دروازوں والی جس شاندار عمارت میں ہم داخل ہوئے تھے۔ اور عموماً" سیاح وہاں جاتے ہیں' اس کا نام ٹامس جیفرسن بلڈنگ ہے۔ اس کے علاوہ آدمس بلڈنگ اور میڈیسن بلڈنگ دو اور عمارتیں بھی اس لائبریری کے لیے مخصوص ہیں یہ تینوں عمارتیں خود کار زینوں اور زیرِ زمیں راستوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملحق ہیں۔ دو عمارتوں میں کتابیں محفوظ رکھی جاتی ہیں جن کے شیلف کی مجموعی لمبائی پانچ سو میل سے زیادہ ہے۔ تیسری عمارت میں مخطوطوں' پرانی کتابوں اور اخباروں کو مائکرو فلم اور دوسرے ذرائع سے محفوظ رکھنے کا کام ہوتا ہے۔

جیفرسن بلڈنگ سے برقی ذرائع سے جسے کتابوں کا خاص زینہ یا راستہ کہا جا سکتا ہے فرمائشیں متعلقہ عمارت یا ڈیسک تک روانہ ہوتی ہیں اور اسی راستے کے ذریعے مطلوبہ کتب تقریباً" فوراً" ہی مہیا کردی جاتی ہیں۔ ان گنت موضوعات پر معلومات حاصل کرنے یا تحقیقی کام اور مطالعے کے لیے ہر نسل اور قوم کے لوگ اس لائبریری سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ممبر ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے۔

لائبریری کی تینوں عمارتوں کے اندر بائیس (۲۲) کمرے مطالعہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ خاص مطالعہ گاہ ٹامس جیفرسن بلڈنگ کی پہلی منزل میں ہے۔ جس کی چھت مدور ہے اور مصوری کے نادر نمونوں سے آراستہ۔ اس ہال اور گیلری میں جگہ جگہ سنگ تراشی کے شاہکار بھی استادہ ہیں۔ بڑے ہال اور کئی کمروں میں لکڑی کی دیواروں اور الماریوں میں بے شمار خانے تھے۔ جن میں کتب اور مصنفین کے نام کے کارڈ حروف تہجی کے اعتبار سے رکھے ہوئے تھے۔ اور کچھ لوگ اپنی مطلوبہ کتب کے کارڈ اور نمبر تلاش کر رہے تھے۔

لائبریری کے مختلف حصے دیکھ کر ہم دوبارہ اس طرف واپس آئے تو نور بھی کتابوں کے نام کی پرچیاں دیکھنے لگے اور پھر ایک کارڈ مجھے دکھایا۔ کچھ یوں لگا جیسے اجنبی دیس میں اپنے آپ سے ملاقات ہو گئی۔

میرا شعری مجموعہ "شہر درد" اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔ پہلے مجموعۂ کلام اور اس کے درمیان سترہ طویل سال تھے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۷ء تک۔ یہ شاعرہ کا دوسرا جنم تھا۔ شاعری کے صد رنگ دشتِ بیکراں میں دوسری بار پہلا قدم۔ یہ کتاب مجھے بہت عزیز تھی۔ یہ تو میرے ہونے کا ثبوت بن گئی تھی اور یہ بات نور جانتے تھے۔

پھر ہم نے پاکستان کے کچھ اور ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کے کارڈ بھی تلاش کر لیے اور اب میری بیٹی صبیحہ اقبال کی کتاب بھی جو معاشیات کے موضوع پر ہے اس لائبریری میں موجود ہے۔

اس دن ہم دونوں لائبریری آف کانگریس کے دروازے سے باہر آئے تو میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ امریکہ میں یہ اطمینان رہتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں بیٹھیں، جو لباس چاہیں زیب تن کریں۔ جی چاہے تو ننگے پاؤں سڑک پر چلیں کوئی متعجب یا معترض نگاہ آپ کی طرف نہیں اٹھے گی۔ لندن اور یورپ میں کوئی حرکت قاعدہ اور دستور کے خلاف سرزد ہو جائے تو مقامی لوگوں کی نگاہوں میں اعتراض ہی نہیں تحقیر بھی چیختی پکارتی ملے گی۔

میں اس عظیم کتب خانے کی سیڑھیوں پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی اور میرا خیال قرنوں کے فاصلے پر چھوٹی حویلی کی چھت پر بنے ہوئے اس لکڑی کے ذروں والے برآمدے میں بال فشاں تھا جہاں پہلے پہل میری جان پہچان کتابوں سے ہوئی تھی اور یہ پہلی لائبریری تھی جو میری پر شوق نگاہوں نے دریافت کی تھی۔ میں وہاں یوں جاتی تھی جیسے کوئی عبادت گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو سونپنے اور نجات حاصل کرنے کے لیے۔

بارہ تیرہ سال کی عمر میں کتابوں کے علاوہ روشنی کی جو دوسری کرن میری زندگی میں داخل ہوئی وہ ننھے منے بچے تھے۔ کسی کے بھی ہوں۔ میں نے گھر کی مہترانی کے بچے بھی نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا کر گود میں کھلائے ہیں۔

آسمانوں سے دل پر اترتے ہوئے حرف اور مسکراتے ہوئے ننھے بچے میں مجھے آج بھی ایک مشابہت نظر آتی ہے۔ دونوں کس قدر معصوم اور کتنے سچے ہوتے ہیں۔

اس وقت یہ دوستی لاشعوری تھی۔ لیکن اس قلعہ نما عمارت میں ان دو خوبصورت سچائیوں نے مجھے خوش رہنا سکھا دیا تھا۔

ہاں اس زمانے میں ہوا اور بادل سے میرا بڑی یگانگت کا رشتہ تھا۔ آسمان کے کبھی گہرے نیلے، کبھی سُرمئی اور مٹیالے کینوس پر تصویریں بناتی۔

بڑی حویلی میں گرمیوں کی راتوں کھلے آنگن میں زمین پر چھڑکاؤ ہوتا پھر شفاف سفید چادروں والی چارپائیاں بچھتیں۔ ایک جانب لکڑی کی گھڑونچی پر تین چھوٹے گھڑے یا صراحیاں رکھی ہوتیں۔ گھڑوں کے منہ پر چاندی کے چمکتے ہوئے کٹورے اور گلے میں بیلے کی موٹی موٹی کلیوں کے ہار جو رات بھیگنے پر کھلتیں اور خوشبو کی سوغات بانٹتیں۔

ایسی راتوں میں ہوا کے ہاتھ سے بادل کے ٹکڑے جوڑ کر کیسے کیسے شاہکار تخلیق کرتی۔ درخت اور مکان اور دور تک ڈھلکتی ہوئی چادریں اوڑھے ہوئے پیکر۔ کہیں سے ان تصویروں میں رنگ بھرنے چاند بھی آنکلتا۔ ستاروں سے چراغ جلالیتی۔ چاند کبھی بدلیوں سے آنکھ مچولی کھیلتا کبھی کہیں اور چلا جاتا۔ ستارے بھی کسی رات کہیں دور نکل

جاتے۔ لیکن ہَوا نے میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ ایسے میں وہ سرگوشیاں کرتی رہتی اور پھر میں سو جاتی۔

ہَوا نے شاید اب بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ میری رہائی کا پروانہ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ ۸۲ء میں ایک نظم کہی تھی جس کے چند مصرعے ہیں ؎

میں اکثر ہواؤں کے بے تاب جھونکوں میں تھی
کہ تسکینِ جاں کے لیے
قربِ محبوب کے لمس سے آشنا ہو سکوں
اور کبھی وحشتِ دل کی خاطر
چٹانوں سے اور کوہساروں سے باتیں کروں

دس بارہ سال کی عمر میں جب شعر کہنا شروع کیا تو آنگن بھر آسمان کی یہ تصویر سازی چھوڑنا پڑی۔ اب رات کو سرہانے کاپی پنسل ہوتی۔ بادل راستے میں جیسے کسی شناسا کی طرح مل کر رہ جاتے۔ بڑی حویلی سے اب میری صلح ہو گئی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ نادانیوں کے کمال بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ مگر خوابوں اور دنوں کو اُجالنے کے بہت سے نئے حیلے اور بہت سی سہولتیں بھی دے گیا۔ ہَواؤں اور بادلوں سے تعلقِ خاطر اب بھی تھا مگر تصویروں نے اپنا کینوس بدل لیا تھا۔ میری شاعری نے مجھے بڑا سہارا دیا تھا۔ زیادہ تر نظمیں اور کبھی کبھی غزلیں بھی لکھتی۔ سویرا' ایشیا' ادبِ لطیف' افکار' اور شاہکار' وغیرہ اس وقت کے تمام قابلِ ذکر جرائد میں اشعار شائع ہوتے۔

مجھے اپنے ان سوتے جاگتے دنوں کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔ بڑی حویلی کے آنگن کے اوپر چاروں طرف چھجا تھا۔ چھجے کی منڈیر پر بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف قسم کے پودے لگے ہوئے تھے۔ اسی چھت پر سے ہو کر میں چھوٹی حویلی کی چھت پر ایک چھوٹی سی کھڑکی سے گزر کر کتابوں کے پاس جاتی تھی۔ ایک دن حسبِ معمول گھر والوں کی نظر بچا کر جب میں اوپر پہنچی تو حیران رہ گئی۔ نارنگی کے بُوٹے کی شاخ

شاخ شگوفوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ منظر جمال ابھی تک میری نگاہوں سے اوجھل کیسے رہا اور کیوں رہا۔ میں ٹھٹک کر رہ گئی پھر دہیں ان کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مجھے خوشبو کا تحفہ دیا۔ میری حیرانیوں نے نظم لکھی۔ اس نظم کا عنوان تھا "شگوفے"۔

پودوں اور پیڑوں سے آدمی کا ایک ان کہا' ان جانا رشتہ ہوتا ہے۔ رحمتی کے گھر میں جو نیم کا درخت تھا اس سے میری ملاقات بہت مختصر رہی لیکن اب' اس وقت اس کا اصرار ہے کہ جو چند گھڑیاں اس کی چھاؤں میں گزاری ہیں ان کو بھی یاد کیا جائے۔

والد کے انتقال کے بعد جن دنوں میں بالکل کھوئی کھوئی اور اکیلی ہو گئی تھی تو کبھی کبھی امی سے اجازت لے کر رحمتی مجھے اپنے گھر لے جاتی تھی۔ یوں تو جب وہ ہمارے یہاں رہتی تھی تو اپنے گھر ایک آدھ بار ہی جاتی تھی۔

رحمتی شروع سے ہی میری دیکھ بھال کے لیے نوکر رکھی گئی تھی لیکن اس کی نوکری کا دھاگا ٹوٹتا اور جڑتا رہتا تھا۔ کبھی وہ طویل عرصے کے لیے غائب ہو جاتی اور پھر اچانک ایک دن آکر اپنا کام اور مقام دونوں حاصل کر لیتی۔ وہ ہمیشہ لٹی پٹی اُجاڑ صورت لیے دروازے سے داخل ہوتی۔ کبھی آنکھ کے اوپر نیل ہوتا' کبھی منھ سوجا ہوا' کبھی ہاتھ پاؤں زخمی۔ گھر میں سب کو معلوم ہو جاتا کہ شوہر نے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے کیونکہ جو پیسہ اس نے کمایا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ رحمتی کے ساتھ اس کی دو لڑکیاں بھی ہوتیں جن میں ایک میری ہم عمر اور دوسری مجھ سے بڑی تھی۔ رحمتی گھروں میں کام کرنے والی عام سی عورتوں کی طرح تھی لیکن اس کا حلیہ غیر معمولی تھا۔ گہرا کالا رنگ اور سامنے کے دو دانت ابھرے ہوئے اور نمایاں۔ جو کچھ خندۂ بے جا کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ لیکن وہ مجھے اچھی خاصی خوبصورت نظر آتی تھی اور بہت عزیز تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بلا شرکتِ غیرے میری تھی یا شاید یہ اس کے کردار کا حسن اور تقدّس تھا جو بچپن کی معصوم نگاہوں پر ہی آشکارا ہوتا ہے۔

وہ آتے ہی گھر میں کام شروع کر دیتی۔ اور جب کوئی کام نہیں ہوتا تو امی کے پیر دبانے بیٹھ جاتی اور دھیرے دھیرے باتیں کرتی رہتی۔ اس گفتگو کا خاص پہلو یہ تھا کہ

اس کے شوہر کی بدسلوکی کا تذکرہ اس میں کہیں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر امّی پوچھ ہی لیتیں کہ یہ چوٹ کیسے آئی تو بڑی صفائی سے گھڑونچی کے پاس پاؤں پھسل جانے یا اندھیرے میں کسی پتھر سے ٹھوکر لگنے کی داستان سنانے لگتی۔ شوہر جوا کھیلتا تھا۔ (یہ میں نے بعد میں سنا تھا۔) ظاہر ہے بیوی کی جمع پونجی کتنے دن اس شوق کا ساتھ دے سکتی تھی۔ پیسے ختم ہو جاتے مزید جوا کھیلنے کی استطاعت نہ رہتی تو وہ بیوی کو مجبور کرتا کہ حویلی میں جاکر کام شروع کردے۔ ادھر وہ تھی کہ ہر حال میں رُوکھی سُوکھی کھا کر بھی اپنے شوہر اور بچیوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اور شوہر تھا کہ اس کو اپنی لت پوری کرنے کے لیے روپیہ چاہیے تھا۔ خواہ کسی طرح بھی حاصل ہو۔ خود کوئی کام کرنے اور کمانے سے کہیں زیادہ آسان بیوی کی نوکری تھی۔ لڑائی جھگڑا ہوتا اور آخر رحمتی مجبور ہو کر اپنی ملازمت پر واپس آجاتی۔ پھر وہ خود کسی لکڑی کی ٹال پر جُزوقتی عارضی ملازمت کرکے اپنا پیٹ بھرنے کا انتظام کرلیتا۔

شروع کے دو تین مہینے رحمتی بھی اپنے گھر اور شوہر کی کوئی خبر نہیں لیتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب اس کے پاس تھوڑی رقم جمع ہو جاتی تو گھر اور شوہر کی یاد ستاتی اور کسی کسی دن امّی سے اجازت لے کر چند گھنٹوں کے لیے اپنے گھر چلی جاتی۔ امی تاکید کرتیں کہ اپنا روپیہ بچیوں کے لیے سنبھال کر رکھے تو وہ اپنے شوہر کی کمائی اور ساتھ ہی بچیوں کے ساتھ اس کی محبت اور سخاوت کی کہانیاں سنانے لگتی۔ جب اس کے پاس خاطر خواہ رقم جمع ہو جاتی' جو وہ امّی کے پاس ہی رکھوا دیتی تھی اور دو تین چاندی کے زیور' چوڑیاں وغیرہ انعام میں وصول ہو جاتیں تو رو دھو کراتی سے رخصت لیتی۔ اور حویلی سے کئی مہینوں کے لیے غائب ہو جاتی۔

جن دنوں وہ امّی سے تھوڑی دیر کے لیے چُھٹی لے کر اپنے گھر جاتی تھی تو ایک دوبار مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔ وہ گھر ایک تصویر سا ہے جو اَب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ایک دروازہ جس میں کواڑ نہیں تھے۔ سامنے صحن جو نیچی نیچی کچّی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک کوٹھری' کوٹھری کے آگے چھپر اور چھپر کے نیچے ایک کونے میں

چولھا بنا ہوا۔ ایک آدھ برتن ادھر اُدھر پڑا ہوا۔ اور بس۔ ہاں آنگن صاحب ثروت تھا۔ ایک چھتنار نیم کا درخت جس کی شاخیں بڑے وقار سے وجد کی کیفیت میں تھیں۔ کبھی جھومنے لگتیں کبھی تھم جاتیں۔ اور اس نیم کی ایک موٹی سی شاخ میں جھولا پڑا ہوا تھا۔

رحمتی گھر پہنچتے ہی جُھولا میری تحویل میں دے دیتی اور اپنی دونوں لڑکیوں کو میری نگہبانی کا فریضہ سونپ کر پہلے جھاڑو پکڑتی اور صفائی میں مصروف ہو جاتی۔ اس کام سے فارغ ہوتی تو دیوار کے پاس اینٹیں رکھ کر ان پر کھڑی ہو کر کچھ دیر اپنی پڑوسن سے باتیں کرتی۔

"ٹونک والوں کی چھوٹی بٹیا آج میرے ساتھ آئی ہوئی ہیں"

وہ بڑے فخر سے پڑوسن کو بتارہی ہوتی اور ساتھ ہی اپنی لڑکیوں کو ہدایت کرتی جاتی

"دیکھو جھولے کو زور سے پینگ نہ دینا۔"

اور نیم کی گھنی چھاؤں میں جُھولے کی پینگیں اونچی اور اونچی ہوتی جاتیں۔ ہرے پتّوں اور ہری اور پیلی نمکولیوں سے لدا ہوا نیم متانت سے استادہ رہتا اور شاخیں جُھولے کے زیر و بم سے ہم آہنگ ہو جاتیں۔ دو پیر تھے جو اونچی سے اونچی شاخ کو چُھو لینے کی کوشش میں آگے بڑھتے جاتے۔ کبھی بڑی جرأت سے جُھولے کی رَسّی کو بازو کے حلقے میں لے کر ایک ہاتھ آگے بڑھتا اور کچھ پتّیاں اپنی گرفت میں لے کر واپس آتا۔ کبھی کوئی نمکولی اچانک گود میں آگرتی تو جیسے کوئی انعام مل جاتا۔ تین بے ساختہ قہقہے بلند ہوتے۔

پڑوسن سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد رحمتی کچھ تازہ دم ہو جاتی۔ اور پھر چولھے کے پاس جاکر لکڑیاں سُلگاتی۔ ہانڈی چولھے پر چڑھاتی اور آٹا گوندھنے لگتی۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز آتی "آؤ بٹیا پہلے کھانا کھالو' پھر جُھولا جُھولنا۔"

جتنی دیر میں جُھولے سے اترنے پر میں آمادہ ہوتی وہ بان کی چارپائی وہیں نیم کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بچھادیتی۔ اور چارپائی پر کھانا رکھتی۔ چنگیر میں روٹی اور مٹّی کی رکابی میں پیلے رنگ کے شوربے میں آلو کے قتلے۔ اور نیم کی شاخیں پنکھا جھلتی ہوئی اور کوئی شریر پتا بالوں میں الجھا ہوا۔ بڑی حویلی میں ایسا کھانا کبھی نہیں ملا تھا۔

واپسی پر کبھی امّی نے پوچھا بھی نہیں اور میں نے بتایا بھی نہیں کہ میں نے رحمتی کے گھر کھانا کھایا تھا۔ ہاں ایک بار امّی سے فرمایش ضرور کی تھی کہ وہ مجھے رحمتی کو دے دیں میں اس کے گھر میں رہوں گی۔

بدایوں کے شام و سحر

بدایوں "پیراں شہر" اور "گنج شہیداں" کہلاتا تھا۔ ٹونک والا خاندان پیر کے معاملے میں بھی خود کفیل تھا۔ یہ "ماموں بھانجے" کا مزار کہا جاتا تھا۔ کہتے تھے کہ یہ دونوں بزرگ سالار شہید غازی کے ہمراہیوں میں سے تھے اور حق و باطل کے معرکے میں شہید ہوئے۔

دیوان خانے کے صحن میں ایک چبوترے پر برابر برابر دو قبریں تھیں جن کے سرہانے موتیا کے پودے لگے ہوئے تھے۔ پائنتی ایک چھوٹا سرسبز درخت تھا۔ جس کی شاخیں اور پتے ان مزاروں پر سایہ کیے رہتے۔ میں ۴۷ء تک بدایوں میں رہی ہوں لیکن نہ تو کبھی اس درخت کی کوئی شاخ کاٹی گئی اور نہ وہ قد و قامت میں بڑا ہوا۔ چبوترے کے چاروں طرف ڈیڑھ دو فٹ اونچا تاروں کا جنگلا تھا۔ نوکر اس چبوترے پر جھاڑو دینے کے لیے جاتے تھے۔ بچوں کو جنگلے کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

مجھے معلوم نہیں کیوں لیکن یہ دستور تھا کہ بدایوں میں جب کسی گھر میں ولادت ہوتی تو چلّہ نہا کر ماں اور بچہ سب سے پہلے اس مزار پر حاضر ہوتے۔ یہ حاضری عشاء کی نماز کے بعد ہوتی تھی۔

ٹھیلا خواتین کے استعمال کی عام سواری تھی۔ ڈولی بھی استعمال ہوتی تھی۔ جسے دو کہار اٹھا کر چلتے لیکن اس میں گنجایش کم ہوتی تھی۔ ٹھیلا ایک دو پہیوں کی گاڑی تھی جس کے پچھلی طرف لکڑی کا تختہ اور تین جانب کپڑے کا پردہ لگا ہوتا۔ پیچھے سے ہینڈل پکڑ کر چلایا جاتا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد ماں اپنے بچے کو لے کر کسی بزرگ خاتون اور بڑے بچوں کے ساتھ اس مزار پر آتی۔ ایک دونے میں بتاشے یا مٹھائی اور کبھی کبھی پھول بھی ہوتے جو

وہاں رکھ دیا جاتا۔ مزار سے خالی ہاتھ واپس جانا ماں اور بچے کے لیے برا شگون سمجھا جاتا۔ پھاٹک کے اندر جو پہلا دروازہ تھا وہ بڑی حویلی کا تھا۔ اس لیے ساتھ آنے والا کوئی بچّہ ایک کپڑا یا رومال ہاتھ میں لیے ڈیوڑھی سے اندر آتا۔ گھر کی کوئی بی بی باورچی خانے میں جاتی اور کنوردان میں جتنی روٹیاں ہوتیں ان میں سے ایک برکت کے لیے بچا کر بقیہ اس رومال میں لپیٹ دی جاتیں۔ جسے لے کر بچّہ واپس چلا جاتا۔ یہ تمام رسم انتہائی خاموشی سے ادا ہوتی۔ کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آنے والی کس گھر سے آئی تھی۔

مجھے یاد ہے شام کو میری نانی روٹی پکانے والی سے کہتیں۔

"روٹیاں ذرا زیادہ ڈالنا۔ شاید کوئی مرادوں والی آئے"

جس شام کوئی تقدیر والی نہیں آتی، صبح یہ روٹیاں پکانے والی کو دے دی جاتیں۔ یہ مزار چونکہ چار دیواری کے اندر تھا اس لیے شاید خواتین کو یہاں حاضری دینے میں سہولت رہتی ہوگی۔

بزرگوں اور مزارات کے تمام تر احترام کے باوجود یہ گھرانا ضعیف الاعتقاد نہیں تھا۔ بے غرض اور بے مراد تو یہ لوگ بھی نہیں تھے۔ طلب اور آرزو کے تانے بانے سے ہی زندگی کی قبا بُنی جاتی ہے۔ یہ بھی تھا کہ جہاں جائداد تھی وہاں مقدمہ بازیاں بھی تھیں۔ جن میں ہارنے کے اندیشے اور جیتنے کی زبردست خواہشیں بھی یقینی ہیں۔ لیکن میں نے اپنے بزرگوں میں سے کسی کو اس مزار پر منت مانتے نہیں دیکھا اور نہ خاندان میں پیدا ہونے والے کسی بچّے کو اس مزار پر لے جایا گیا۔ ہمارے یہاں ایسے موقع پر دستور یہ تھا کہ گھر کی کوئی بزرگ خاتون عشاء کی نماز کے بعد ماں اور بچّے کو لے کر کسی قریبی مسجد میں جاتیں۔ ٹھیلے کے ساتھ ساتھ ایک نوکر بھی ہوتا۔ وہاں بچّے کی ماں دو رکعت شکرانے کی نماز پڑھتی اور صندوقچی میں چراغی کی رقم ڈالتی۔ اس خاندان میں خاص خاص دعائیں مانگنے کے لیے عشاء کی نماز کے بعد چالیس مسجدوں میں نفلیں پڑھی جاتیں۔ منّت عموماً مسجد میں چراغ جلانے کی مانی جاتی۔ ویسے بھی گھروں سے موذن کے لیے کھانے کے علاوہ

چراغ کے تیل کی رقم بھی پابندی سے جاتی تھی۔ لبوں پر اللہ رسولؐ کا ذکر تھا اور دلوں میں خوف خدا بھی۔

اٹھارویں صدی میں افریقہ کے قبائل میں اپنے خالق سے نوزائیدہ کے تعارف کا بڑا دلکش طریقہ تھا۔ الیکس ہیلے نے اپنے مورث اعلیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آٹھ دن کا تھا جب ۱۷۵۰ء میں گمبیا (مغربی افریقہ) کے ساحلی گاؤں جفرے میں اس کا نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی۔ نئے چاند کی پہلی رات تاروں کی چھاؤں میں بچے کے سیاہ فام باپ نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ تین بار بچے کے کان میں اس کا نام لیا۔ پھر وہ نام (کنتا) جو بچے کے قابلِ فخر دادا کے نام پر رکھا گیا تھا اس کی ماں کو بتایا۔ پھر کھلے صحن میں دونوں ہاتھوں پر بچے کو اپنے سر سے اونچا اٹھا کر کہا۔

"دیکھو تم سے بڑی ایک ہی طاقت ہے"

یہ اللہ اور بندے کا راست رشتہ تھا۔

اگلے وقتوں میں برصغیر میں ہم سب کے گھروں میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے بندے کا رشتہ بڑا واضح اور آجکل کے مقابلے میں زیادہ آسان بھی تھا۔

وماجعل علیکم فی الدین من حرج (سورہ حج)

(اور دین میں اس نے تم پر کچھ تنگی بھی نہیں رکھی)

وہ سیدھے سادے مگر سچے لوگ تھے۔ دین کی سچائیوں کو حقوق اللہ سے لے کر حقوق العباد تک پہچانتے تھے۔ وہ لوگ صرف اسلام پسند نہیں تھے۔ قول اور عمل دونوں کے لحاظ سے صاحبِ یقین تھے۔ اس وقت تک مذہب سیاست نہیں بنا تھا۔ اس لیے فرمانِ الٰہی اور نظامِ مصطفےٰؐ کی پیروی ان کے لیے کوئی مہم نہیں تھی۔ وہ تو خون میں رچی ہوئی تھی۔ اور ماں باپ سے بچوں کو سب سے بڑا ورثہ یہی ملتا تھا۔

بدایوں کی چند محبوب یادوں میں سے ایک میری نانی کی یاد ہے۔ جس آواز سے ہر صبح ہماری آنکھ کھلتی وہ ان کی تلاوتِ کلام پاک کی خوش لحن، مدھم، شیریں آواز تھی۔ دالان کے ایک در میں ان کی نماز کی چوکی بچھی رہتی جس پر سفید شفاف دوپٹے سے اپنے

سفید شفاف بال بڑی احتیاط سے ڈھانکے ہوئے۔ انہیں تلاوت میں مصروف دیکھنا ہمارے لیے گویا صبح کی آمد کا اعلان ہوتا تھا۔

سادگی، نیکی اور خیر کو اگر کوئی شخص انسانی پیکر میں دیکھ سکتا ہے تو وہ میں نے اپنی نانی کو دیکھا۔ ہر شخص کی ہر قسم کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار۔ فصل کے موقع پر گاؤں سے اناج وغیرہ آتا تو حاجت مندوں میں جھولیاں اور گھڑے بھر بھر بانٹتیں۔ خود کہیں نہیں جاتی تھیں۔ دن بھر گلی محلّے کی غریب عورتیں ان کی پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔ اپنی اپنی پریشانیاں انہیں سناتیں۔ مالی امداد کے علاوہ اپنے گھریلو معاملات میں ان سے رائے مشورہ بھی لیتیں۔ وہ ان عورتوں کے دکھ درد میں دل سے شریک تھیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی ذکر کرتی رہتیں، ان کی مجبوریوں اور محرومیوں پر افسوس کرتیں۔ ان کا برتاؤ ان عورتوں کے ساتھ مشفقانہ بھی تھا اور برابری کی سطح پر بھی۔ ان کے یہاں غریب، امیر، بڑے، چھوٹے کا کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ اناج ہی نہیں محبتیں بھی جھولیاں بھر بھر بانٹنا جانتی تھیں۔ وہاں نئی اور جوان ہوتی ہوئی نسل کو انسانیت کا درس لینے کے لیے کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

نانی فارغ اوقات میں قصص الانبیا پڑھتی رہتیں۔ لکھنا نہیں جانتی تھیں۔

میری حقیقی خالہ ایک ہی تھیں۔ ان کا نام صفیہ تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن ان کا شمار لڑکیوں میں ہوتا۔ ہم لوگ بھی انہیں سہیلی کا درجہ دیتے تھے اور غالباً" وہ لڑکیوں اور بچیوں کے ساتھ ہی خوش رہتی تھیں۔ میں نے دیکھا ہے کوئی بچہ بیمار ہوتا، روتا تو وہ اسے رات رات بھر گود میں لیے ٹہلاتی رہتیں۔ درزی سے خواتین کے لباس تیار کروانے کا رواج نہیں تھا۔ زیادہ تر سلائی کے کام میں وہی مصروف نظر آتیں۔ دوپٹوں کو رنگنا بھی ان کا ایک مشغلہ تھا۔ گھنٹوں بڑے خوبصورت خوش رنگ لہریے دار دوپٹے ہمارے لیے رنگتی رہتیں۔ برسات میں پچھنج کی کڑی میں جھولا ڈالا جاتا تو پکوان کی فرمائش انہیں سے ہوتی۔ چھوٹے بچے ان کی گود میں بیٹھ کر جھولا جھولتے۔

ان کا ایک جملہ مجھے آج تک یاد ہے۔ جب باجی کی شادی طے ہوئی جو خاندانی روایات کے خلاف خاندان سے باہر ہو رہی تھی تو انہوں نے باجی سے پوچھا تھا۔

"بلقیس تمہیں کیسا لگ رہا ہے"

اس جملے میں محض تجسّس تھا یا عمر بھر کی حسرتیں۔ کون بتا سکتا ہے۔

بدایوں میں ہمارے گھر رمضان کا مہینہ بڑی شان و شوکت سے آتا تھا۔ شعبان کے دوسرے تیسرے ہفتے ہی سے رمضان کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ سویاں اور کچھ دوسرے پکوان بڑے اہتمام سے تیار کروائے جاتے۔ ساتھ ہی روزہ کے فضائل کا تذکرہ رہتا۔ بزرگوں کی نمازیں طویل ہو جاتیں۔ رمضان میں عموماً" گھر کے چھوٹے بڑے سب روزہ رکھتے تھے۔ محلّے کی مسجد میں روزانہ افطاری جاتی۔ پورا مہینہ احترام اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ گزرتا۔ لیکن عید بدایوں میں ہمارے گھر کبھی اپنے روایتی انداز سے نہیں آئی۔ سویاں بھی پکتیں' دیگر لوازمات بھی ہوتے' گھر کے سب لوگ نئے کپڑے پہنتے' مرد عید کی نماز کے لیے جاتے۔ ہمیں عیدی بھی ملتی لیکن اس انتظام میں خوشی سے زیادہ گہرا رنگ رازداری کا ہوتا۔

یہ ٹونک والا پھاٹک کے اندر سماجی مجبوری تھی خاندان کے کسی بزرگ کا انتقال عید کے دن ہوا تھا۔ انتقال کو طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ یہ واقعہ میری پیدائش سے پہلے کا تھا۔ ان کی اولاد اب جوان ہو چکی تھی لیکن دیوان خانے میں عید کے دن ان کا غم ضرور منایا جاتا تھا۔ فاتحہ خوانی ہوتی' فقراء میں کھانا تقسیم ہوتا اور اعزا و اقارب بڑی پابندی سے جمع ہوتے۔ چنانچہ ہمارے گھر کے لوگ بھی صبح کو گھر کے اندر چپکے چپکے عید منا کر دوپہر سے پہلے سادہ کپڑوں میں دیوان خانے شرکتِ غم کے لیے جاتے۔

دیوان خانے کے ذکر سے ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ میرے بھائی طیب اور خالہ زاد بھائی صدیق مرحوم کی عمر اس وقت پانچ چھ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ایک شام دونوں بے حد پُرجوش و پُرخروش آئے اور اعلان کیا کہ "آج ہم نے اللہ میاں کو دیکھا۔" جب لڑکوں کو احساس ہوا کہ بزرگ ان کے اس کارنامے پر کچھ مسرت کا اظہار

نہیں کر رہے ہیں تو وہ دونوں تفصیل بتانے لگے۔

"ہم نے انہیں اوپر دیکھا۔ وہ بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی داڑھی بھی بالکل سفید تھی اور بہت گورے تھے۔ جب ہم نے دیکھا وہ آنگن سے کمرے میں جا رہے تھے۔"

آنگن اور کمرے کے حوالے سے بات لوگوں کے ذہن میں آئی۔ دیوان خانے کی دوسری منزل کے ایک کونے میں الگ تھلگ مختصر آنگن کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں امی کے تایا مولوی میاں (وزیر احمد) نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ مقررہ وقت پر ان کا خاص نوکر کھانا لے جاتا تھا۔ گوشت' لہسن' پیاز ان کے کھانے میں نہیں ہوتا تھا۔ مولوی میاں کو چھوٹے بچوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سنا ہے ترکِ دنیا کے بعد شروع میں برادری پڑوس میں شرکتِ غم کے لیے جاتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے گھر کی دو ملازمائیں اونچی آواز میں لڑ رہی تھیں۔ ایک نے دوسری سے کہا۔

"خدا کرے تیرے گھر مولوی میاں آئیں۔"

کسی طرح بھنک ان کے کان تک پہنچ گئی۔ ملازم کھانا لے کر پہنچا تو زنان خانے میں پیغام بھجوادیا کہ آئندہ غمی کے موقعوں پر بھی شرکت کے لیے ان کے پوتے جایا کریں گے۔ بیٹے کا اِنتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کے آخری چالیس سال تنہا نشینی اور عبادات میں بسر کیے۔

طیّب اور صدقی نے حویلی کی چھت پر سے اتفاقاً" ان کی جھلک دیکھ لی تھی۔

رمضان کی طرح محرم کا مہینہ بھی ہمارے گھر میں خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ خوشی کی کوئی تقریب کسی مجبوری کے تحت بھی اس مہینے میں نہیں ہو سکتی تھی۔

ماہِ محرّم کا یہ احترام بدایوں شہر کے عمومی مزاج میں شامل تھا۔ پورے مہینے نیا کپڑا نہ خریدا جاتا نہ کوئی نیا جوڑا پہنا جاتا۔ عشرہ تک شوخ رنگ کے لباس استعمال کرنے پر

بزرگوں کی جانب سے پابندی رہتی۔ عشرے کے دن جب تک محلّے کے تعزیے اُٹھ نہ جاتے ہمارے گھر میں چُولھا نہیں جلتا تھا۔

بدایوں میں تعزیہ داری بڑے اہتمام سے ہوتی تھی جس میں دونوں عقیدے کے لوگ حصّہ لیتے تھے۔ بڑے بڑے مرصّع تعزیے تیار کیے جاتے جن کے جلوس طے شدہ تاریخوں پر مقرر کردہ راستوں سے گزرتے۔ ہر چوراہے پر نئے تعزیے کے ساتھ نئے گروہ شامل ہوتے جاتے۔ ان راستوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شربت کی سبیلیں ہوتیں۔ محرّم کی سات تاریخ کو تعزیوں کے عقب میں بیل گاڑیوں کی ایک لمبی قطار بھی ہوتی جن میں پلاؤ اور زردے کی دیگیں رکھی ہوتیں۔ یہ لنگر پورے راستے تقسیم ہوتا۔ یہ لنگر سُنّی مذہب کے محنت کش لوگوں کی جانب سے ہوتا تھا جس کے لیے وہ سال بھر پیسہ جوڑا کرتے تھے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں کے گھروں میں بھی نذر نیاز کا سلسلہ رہتا۔ کوئی بزرگ بچوں کو واقعہ کربلا کی تفصیل اور اہمیت سمجھاتے۔ رات میں آس پاس کے شیعہ عقیدہ رکھنے والے لوگوں کے گھروں سے نوحے اور ماتم کی آوازیں سنائی دیتیں۔

مجھے یہ تو یاد ہے کہ کسی محرّم میں لکھنؤ سے افسوسناک خبریں آتیں لیکن جہاں تک میری یادداشت کا تعلّق ہے بدایوں میں مسلمانوں کے درمیان عقیدے کے نام پر کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔

بدایوں کے شب و روز کی یاد کے ساتھ بادل خاں کا ہیولا بھی سامنے آجاتا ہے۔ بادل خاں چھوٹی حویلی اور بڑی حویلی کے باورچی خانوں کے نگران اعلیٰ تھے۔ جب میں نے انہیں دیکھا بوڑھے ہو چلے تھے۔ ڈھلتا ہوا رنگ۔ لحیم شحیم۔ اودھ کے رہنے والے تھے۔ بیٹے سے کسی بات پر ناراض ہو کر آئے تھے اور پھر مڑ کر نہیں گئے۔ بیٹا کئی بار منانے کے لیے آیا لیکن وہ اس کا سامنا نہیں کرتے۔ جیسے ہی اطلاع ملتی گھر کے کسی کونے کھدرے میں ایسے روپوش ہوتے کہ ڈھونڈتے نہ ملتے۔ تنخواہ البتہ ہر مہینے بڑی پابندی سے پوتی پوتوں کے لیے بھیج دیتے تھے۔

عجیب و غریب زبان بولتے تھے جسے لکنت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بعض حروف کی صحیح

ادائیگی سے معذور تھے لیکن بولتے فرّاٹے سے تھے۔ کوئی نیا آدمی ان کی بات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ گھر میں اتنے عرصے سے تھے کہ مطلب بہرحال سب کو سمجھا دیتے۔

غلّہ کی کوٹھری کے انچارج تھے۔ ہر صبح چاول، دالیں، آٹا، گھی ترازو میں تول کر پکانے کے لیے دیتے۔ روٹی پکانے والی سے خاص طور پر لڑائی رہتی۔ کیا مجال کہ وہ مقررہ وزن سے چٹکی بھر زیادہ آٹا ترازو کے پلڑے میں ڈال سکے۔ کھانا تیار ہو جاتا تو ہانڈیوں کے ڈھکن اتار کر معائنہ کرنا بھی ضروری سمجھتے۔ روٹی کا کٹوردان بھی کھول کر ضرور دیکھتے۔

گھٹنوں کے نیچے کمربند سے بندھا ہوا چابیوں کا وزنی گچھا لٹکا رہتا تھا۔ غلّہ کی کوٹھری میں ایک تالا پڑتا جس کی ظاہر ہے کہ ایک ہی چابی ہو گی لیکن نہ جانے کہاں کہاں سے ان گنت چابیاں جمع کر رکھی تھیں جو اُن کی پوشاک کا حصہ بن چکی تھیں۔

دیگچیوں کے معاینے کے دوران میں خاموش رہنا گوارا نہیں تھا۔ گھر کے سب ملازم پرانے تھے۔ وفادار بھی اور ایمان دار بھی۔ لیکن ان کی کسی نہ کسی حرکت سے بادل خاں کو ہمیشہ چوری کا ثبوت ملتا رہتا تھا۔ کبھی خود ہی کہہ سن کر خاموش ہو جاتے۔ کبھی مالکوں تک رپورٹ پہنچانا ضروری سمجھتے۔ مجرم کو قرار واقعی سزا نہ ملتی تو لاکھ کے گھر کو خاک کرنے کے ملال کا اظہار برملا کرتے۔ انہیں گھر کی خواتین کے احساس ذمہ داری سے بڑے شکوے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس لہجے اور جن الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے اس کا نتیجہ اور جواب ہمیشہ زیرِلب تبسم ہوتا تھا۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ بی بیوں کا احترام بھی لازم تھا۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے کبھی کوئی ملازمہ یا ملازم بددل نہیں ہوا نہ کسی نے کبھی اس کی شکایت کی۔ جس کی بڑی وجہ ان کی غرابت گفتار تھی۔

نماز کے سخت پابند تھے اور ہمیشہ بلند آواز سے پڑھتے۔ عربی الفاظ کی قرأت ایسی کہ سننے والے کو روز قیامت بھی یاد آتا اور ہنسی روکنا بھی دشوار ہوتا۔

حویلیوں میں زندگی رواں دواں تھی اور بادل خاں کی موجودگی سے خاصی بشاشت بھی کہ ایک غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

ان دنوں نانا نے صدیق کو چھرّے والی چھوٹی سی بندوق خرید کر دی تھی، اور اب ننھا

شکاری تھا اور اس کا اشتیاق۔ سارا سارا دن نشانہ لگانے کی مشق جاری رہتی اور شکار کی تلاش بھی۔ مگر کسی چڑیا یا کوّے نے اس شوقِ بے پایاں کی پذیرائی معقول اور معروف طریقے سے نہیں کی۔ ادھر صدقی نشانہ باندھتے ادھر پرندہ مائل پرواز ہو جاتا۔ ایک دن سامنے کبوتر تھا۔ بادل خاں ادھر سے گزرے اور ٹھٹک گئے۔ اپنی زبان میں جو ہم لوگ سمجھ لیتے تھے کہنے لگے۔ کبوتر کو مارنا جائز نہیں ہے کیونکہ کبوتر روضہ رسولؐ پر حاضری دیتے ہیں۔ یہ انہیں کسی حاجی نے بتایا تھا۔

آخر بچوں کی ضد کے آگے کبوتر کو بچانے کے لیے وہ خود ہدف بننے پر تیار ہو گئے۔ دیوار کی طرف منھ کرکے کھڑے ہوئے اور اپنی پیٹھ برہنہ کردی۔ اب یہ سوچ تھی کہ پیٹھ کے کس حصے پر نشانہ آزمایا جائے۔ عین اس وقت جب اس کا فیصلہ ہو گیا بادل خاں نے مڑ کر تاخیر کا سبب جاننا چاہا۔ چھرّا بندوق کی نالی سے آزاد ہو چکا تھا۔ ان کی آنکھ کے نیچے پیوست ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ہم سب تماشائیوں کا بھی خون خشک ہو گیا کہ اب نانا کو علم ہو گا اور خیر نہیں ہے۔ ہوا یہ کہ نانا نے ان کے چہرے پر پٹی بندھی دیکھی اور سبب پوچھا تو انہوں نے اپنا پیر پھسلنے اور کسی گستاخ اینٹ پتھر کے بارے میں اتنی طویل تقریر کی کہ گھبرا کر نانا نے کچھ سمجھنے یا ہمدردی کرنے کی کوشش ہی ترک کردی۔ بندوق کا چھرّا ان کے جبڑے کو زخمی کر گیا تھا۔

زخم کے معالج وہ خود ہی تھے چنانچہ بخار آگیا اور ایسا کہ کئی دن پلنگ پر پڑے رہے۔ گھر والوں نے ان کا علاج تو کروایا لیکن ایک فروگزاشت ایسی ہوئی جو بادل خاں کی شان کے خلاف تھی۔ ان کے آرام کے خیال سے گھر کی کسی بی بی نے غلّہ کی کوٹھری کی دوسری چابی چند دن کے لیے ایک پرانی ملازمہ کو دے دی۔ اس سانحہ کا انکشاف جس دن ان پر ہوا اسی رات وہ بغیر اطّلاع ہمارے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔

جہاں میں تھی

بڑی حویلی میں گرمیوں کی دوپہر میرے لیے سب سے خوبصورت وقت ہوتا۔ جب گرمی اور لُو کی شدت سے بچنے کے لیے دالانوں کے پردے کھینچ دیے جاتے خس خانوں میں پانی چھڑکا جاتا اور بوڑھی نوکرانی چھت سے لٹکے ہوئے پنکھے کی ڈوری کھینچنا شروع کردیتی۔ بی بیاں' چھوٹے بچّوں کو سُلا کر' لڑکے لڑکیوں کو آرام کرنے کی ہدایت دیتیں اور خود بھی چوکیوں کے فرش یا پلنگ پر لیٹ کر سو جاتیں۔ نوکرانی کو بھی نیند آنے لگتی اور پنکھے کی جنبش میں وقفے بڑھتے جاتے۔ ایسے میں اکیلی میں یا ساتھی بھی ہوتے' چُپکے سے باہر آجاتی۔ اکیلی ہوتی تو چوبی سہ دری میں یا دھوپ کی سنہری چادر جو سامنے بچھی ہوتی اس کے کنارے تھوڑے فاصلے پر سائے میں بیٹھ جاتی اور شعر سوچتی یا کوئی کتاب پڑھتی۔ ساتھی ہوتے تو ہم زیادہ تر گھومتے رہتے۔ ایک چھت سے دوسری چھت اور ایک صحنچی سے دوسری صحنچی تک۔ بدایوں کے مئی جون کے مہینوں کی دھوپ اس زمانے میں ہمارے لیے اتنی فرحت بخش اور راحت افزا ہوتی کہ ہم ننگے پَیر بھی ہشت پہلو ترشی ہوئی اینٹوں کے تپتے ہوئے فرش پر چل لیتے تھے۔ ان سنسان دوپہروں میں بڑی حویلی کی سب سے اونچی چھت کی گُمٹی سے فاختہ کی آواز وقفوں سے آتی رہتی۔ میں اکیلی ہوتی تو اس وقت وہاں اس کی موجودگی کتنی طمانیت کا باعث بنتی۔ آواز کے رشتے وہ اتنی پاس ہوتی جیسے صرف یہی نغمۂ مسرت مجھے سنانے کے لیے وہ بھی سب سے چُھپ کر باہر آنکلی ہے۔ اس آواز کی لہریں مجھے کتنے اجنبی جزیروں تک پہنچا دیتیں۔ کیسے کیسے جادو جگاتیں دل خوشی سے سرشار ہو جاتا۔

آج اتنے سال یا شاید صدیاں ان بھید بھری دوپہروں کو بیتے گزر چکی ہیں۔ اب اس

بچھڑے ہوئے دوست کی آواز بھی کہاں سننے کو ملتی ہے۔ ہاں اسلام آباد میں ایک گھر ایسا ملا تھا۔ اس گھر کی خواب گاہ کے سامنے ایک چھوٹا سا پختہ صحن تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا اور گھنا بیری کا درخت تھا۔ اس درخت کی سب سے اونچی شاخ پر کبھی کبھی فاختہ آکر بیٹھتی۔ پکارتی تو اس کی آواز جیسے دل کے پار ہو جاتی۔

از کجای آید ایں آوازِ دوست

اس آواز میں جادو تو اب بھی تھا مگر یہ اداس' تنہا' دکھ بھری آواز پچھلے وقتوں میں نویدِ شادمانی اور پیامِ آشنائی کیسے بن جاتی تھی۔ بزرگ کہتے تھے وقت وقت کی بات ہوتی ہے اور جادو برحق ہے۔ بات سچی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آئینوں میں پرتو اور عکس زاویے بدلتے رہتے ہیں کبھی سامنے' کبھی اوجھل' کبھی بولتے ہیں' کبھی چپ رہتے ہیں۔۔ وہاں خوشبو تو یہاں شبنم۔ اس خاک دان میں آنے والی ہر روح اپنے حصے کا جادو بھی ساتھ لے کر آتی ہے اور جہاں یہ طلسم ساتھ چھوڑ جائے وہیں آدمی دم توڑ دیتا ہے۔ عمر چاہے کتنی ہی پائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"ٹونک والا پھاٹک" کے اندر وہ تمام حویلیاں' دیوان خانہ اور کوٹھیاں جو کبھی ایک ہی مالک کے زیرِ سایہ آباد رہی ہوں گی وقت کے ساتھ ورثا کے علیحدہ علیحدہ گھروں کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ لیکن جائیداد کی تقسیم کے باوجود خاندانی روایات اور رسوم ہر وارث کے حصے میں پوری پوری پہنچی تھیں۔ مردوں کے لیے روایت شعار اور خود اپنا طرفدار ہونا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہوتا۔ اس کی قیمت تو ہمیشہ عورت نے ادا کی ہے۔

شہر کے جو قابلِ ذکر خاندان تھے ان میں مردوں کے لیے عربی اور خصوصاً" فارسی زبان پر عبور حاصل ہونا لازمی تھا کہ یہ شرفا کی پہچان تھی۔ جو صاحبِ ثروت تھے ان کے ذاتی کتب خانوں میں نادر کتابوں اور مخطوطوں کے ذخیرے ہوتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ ان کی اگلی نسل نے اس خزینے کو ردی کاغذ کے انبار سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدایوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کو بھی تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اب بھی لڑکیوں کے لیے اسکول کالج کا ہر دروازہ بند تھا۔

میری امی کے تایا مولوی وزیر حسن بدایوں کے پہلے گریجویٹ تھے۔ میرے تین ماموں تھے جن میں دو مولوی خلیل احمد اور مولوی عبدالرؤف وکیل تھے۔ بڑے ماموں مولوی محمد مسعود جائداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

منجھلے ماموں مولوی خلیل احمد ہم بھائی بہنوں کے لیے باپ کی جگہ تھے۔ انہوں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ جائیداد اور آمدنی کی رحمتوں اور زحمتوں دونوں سے وہ آگاہ تھے اس لیے اپنی تمام خوشیاں اور محبتیں صرف بیوہ بہن اور ان کے چاروں بچوں کے لیے وقف کردیں مالک حقیقی ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

ہمارے گھر اور خاندان کے سربراہ نانا مولوی ظہور حسن تھے۔ نانا روشن خیال تھے اور ساتھ ہی بے حد غنی طبیعت کے مالک۔ اس وجہ سے اب ہمارے لیے رفتہ رفتہ بہت سی پابندیاں ختم ہوتی جارہی تھیں۔ نانا بچوں کے ساتھ پچیسی بھی کھیل لیتے' بیت بازی کے مقابلے بھی ہوتے۔ مردانہ کوٹھی میں کبھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گنجفہ کھیلتے نظر آتے۔ کبھی بڑے بڑے رجسٹر سامنے رکھے لکھتے پڑھتے ہوئے اور کبھی ٹہلتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ان کا مستقل قیام مردانہ کوٹھی میں ہی رہتا تھا کھانا وہ صرف ایک وقت کھاتے تھے دوپہر میں بارہ اور ایک بجے کے درمیان۔ یہ کھانا وہ چھوٹی حویلی کے دالان میں چوکی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر کھاتے۔ ایک بوڑھی نائن اس خدمت پر معمور تھی اور اس کے ذمّے صرف یہی ایک خدمت تھی۔ مقررہ وقت پر وہ دسترخوان بچھا کر کھانے کی قابیں رکھتی۔ ادھر باورچی خانے میں ملازمہ روٹی پکانا شروع کردیتی۔ نائن گرم روٹی ان کی پلیٹ میں رکھتی۔ ایک دو نوالوں کے بعد تازہ گرم روٹی آجاتی اور پہلی روٹی ہٹا دی جاتی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہتا۔ نانا بہت کم خوراک تھے اس دسترخوان کا بچا ہوا کھانا نائن کا حصہ ہوتا۔ پھر شام سے رات گئے تک احباب کے ساتھ چائے کا دَور جاری رہتا جو دوسرے ملازم کی ذمہ داری تھی۔ نانا کے کھانے کے وقت ایک اَن کہے حکم کے مطابق بچہ بڑا کوئی چھوٹی حویلی کے اس دالان میں نہیں جاتا تھا۔ اگر اتفاق سے ہم میں سے کوئی وہاں پہنچ جاتا تو نانا اس کو فوراً" کھانے میں شریک کرتے لیکن ان کے ساتھ کھانا کھاتے

ہوئے ایک عجیب سی پریشانی لاحق رہتی۔ البتہ بعد میں اس کا ذکر آپس میں بڑے فخر سے کیا جاتا۔

روایات اور رسوم سے اَٹے ہوئے اس ماحول کو ان کے مہربان وجود نے خوشگوار بنا دیا تھا۔ وہ ایک عجیب دنیا تھی۔ ماں کی کوکھ کی طرح گرم' آرام دہ اور محفوظ۔ لیکن روشنی اور رنگ سے محروم۔ بند آنکھوں کے لیے بے شک اتمام نعمت کی طرح۔

نانا بچوں کے ساتھ کبھی کبھی بچوں کے ہم عمر بن جایا کرتے تھے۔ جب بہت خوشگوار موڈ میں ہوتے تو ہم لوگوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے۔ بدایوں میں موٹر سب سے پہلے انہوں نے خریدی تھی جس کی چھت خاکی رنگ کے کپڑے کی تھی۔ پکنک کو جاتے ہوئے کبھی ہم شدید بارش میں گھر جاتے تو یہ چھت باقاعدہ ٹپکتی تھی۔

ہمارے گھروں میں تہہ خانے بھی تھے۔ رہائشی عمارتیں انہیں کے اوپر تعمیر ہوئی تھیں۔ یہ تہہ خانے عام استعمال میں نہیں آتے تھے کچھ کمروں میں سامان' غلّہ وغیرہ رکھا جاتا تھا اسی تہہ خانے کا ایک کمرہ موٹر گیراج بنا دیا گیا تھا۔ اس کا دروازہ بدایوں کی اسی واحد کشادہ سڑک پر کھلتا تھا جس پر چلنے کی مجھے آرزو رہی۔ جس کے آگے شہر ختم ہو کر میدان' کھیت اور درخت شروع ہو جاتے تھے۔ آسمان سے گرتی ہوئی دھوپ اور زمین پر بچھے ہوئے سائے' کہیں دھول اور کہیں سبزہ اور حد نظر تک جاتی ہوئی وہ سڑک۔

جس سڑک پر میں پیدل کبھی نہیں چل سکی اس پر نانا کی موٹر میں بہت بار گزری۔ کسی پاس کے گاؤں میں پکنک یا باغ کی سیر کے لیے۔ اس کی ہمیں اجازت حاصل تھی اور اس زمانے میں بھی اپنے گاؤں کے کسانوں سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بی بیاں گھر کے نوکروں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی کئی پشتیں اسی ڈیوڑھی پر گزری تھیں۔ ان کی وفاداری مسلّم تھی۔ یا شاید یہاں بھی طبقاتی تقسیم کا احساسِ برتری کار فرما تھا۔ گویا ان کا شمار عام انسانوں میں نہ ہو۔ لیکن اسی تہذیب کا تقاضا یہ بھی تھا کہ بوڑھے نوکروں کا درجہ گھر کے بچوں کے لیے اپنے بزرگوں جیسا ہوتا تھا۔ وہ تنبیہہ بھی کرتے اور ان کا ادب لحاظ بھی کیا جاتا۔ ہم لوگ خاص طور پر ڈرائیور کو خوش

رکھنا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ یاد نہیں نام کیا تھا۔ اسے "غلام اَچھے" کہا جاتا تھا۔

موٹر کی سیر کے لیے شرط ایک ہی تھی کہ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کوئی ایک معمّر خاتون ضرور ہوں۔ برادری کی ایک بزرگ خاتون جنہیں ہم بی بی کہتے تھے ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتیں۔ انہیں بچّوں کے لیے "محافظ فرشتہ" مقرر کیا گیا تھا۔

بی بی دبلی پتلی چھوٹے قد کی بیوہ خاتون تھیں۔ لڑکیوں کے گروہ میں دور سے ان کی پہچان مشکل تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمیشہ سفید دوپٹہ اوڑھتی تھیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی کسی لڑکی نے سفید دوپٹہ اوڑھا ہو۔ غالباً یہ بدشگونی سمجھی جاتی تھی۔ بی بی اور ہم سب چھوٹے بڑے آٹھ دس لڑکے لڑکیاں بڑی فراغت سے اس موٹر میں سماجاتے۔ موٹر کی پچھلی نشست کے سامنے گدّے اور رضائیاں بچھاکر نشست کے برابر اونچا کرلیا جاتا اور ماچس کی ڈبیا میں تیلیوں کی طرح ہم سب کے لیے بڑے آرام سے گنجایش نکل آتی۔

نانا سے موٹر میں سیر کرنے یا پکنک پر جانے کی اجازت حاصل کرنا آسان تھا لیکن موٹر حاصل کرنے سے پہلے ہمیں ایک دلچسپ مرحلے سے گزرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی خاص وجہ نہ ہوتی تو نانا ہماری درخواست فوراً منظور کرلیتے لیکن ساتھ ہی حکم جاری ہوتا کہ موٹر میں پیٹرول آپ لوگ خود ڈلوائیں گے۔ پیٹرول کی قیمت اس زمانے میں کیا تھی یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ہمیں اس وقت تین روپئے کی ضرورت ہوتی تھی اتنی بڑی رقم ہم لوگ بہ ہر طور نانا سے ہی وصول کرنا چاہتے۔ وہ ہمارے ارادوں کو پہچانتے تھے۔ تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں رکھتے۔ پھر کہتے اچھا یوں کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ پچیسی کھیلیے اگر آپ ہم سے جیت جائیں تو تین روپئے انعام ملیں گے۔

پچیسی زیادہ سے زیادہ چار لوگ ایک وقت میں کھیل سکتے ہیں۔ چنانچہ تین تین لڑکے لڑکیوں کی ٹیمیں ان کی مہارت کے لحاظ سے تیار ہوجاتیں۔ پہلی ٹیم سامنے آتی۔ بڑی احتیاط سے سوچ سمجھ کر کھیلتی اور ہار جاتی۔ پھر دوسری ٹیم نانا کے مقابل آتی اور اپنی تمام کوششوں کے باوجود ہار جاتی۔ تیسرے مقابلے تک مایوسی کا عالم طاری ہوچکا ہوتا۔ اب پے بہ پے غلطیاں ہوتیں۔ لیکن نانا کی طرف سے اور بڑی غلطیاں ہوتیں اور آخر کار وہ

ہار جاتے۔ ہمیں اپنی کوششِ پیہم کے بعد کامیابی سے جو مسرّت حاصل ہوتی وہ بھلا پہلی ہی بار جیت جانے میں کہاں ممکن تھی۔

مجھے ماموں صاحب کے ساتھ شکار پر جانا بھی یاد ہے۔ کبھی کبھی جب وہ شکار کے لیے قریب کے کسی علاقے میں جاتے جہاں سے شام تک واپسی آسانی سے ہو سکتی تھی تو وہ باری باری ہم لوگوں کو ساتھ لے جاتے تھے۔

بدایوں میں زمیندار گھرانوں کے مرد بالعموم شکار کے شوقین تھے۔ شکار موسم کے مطابق ہوتے تھے جب مرغابیوں اور صحرائی بطخوں کا شکار ہوتا تو اس کے لیے ماموں صاحب کئی دن کے لیے گھر سے جاتے تھے۔ غالباً" یہ شکار علی الصبح یا غروبِ آفتاب کے وقت ہوتا تھا۔ ہم صرف ہرن اور نیل گائے کے شکار میں ساتھ جا سکتے تھے۔

مجھے گاؤں کا وہ منظر یاد ہے۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں دری بچھا کر ہم تین چار لڑکے لڑکیاں بیٹھ جاتے کھانے پینے کا سامان ہمارے ساتھ ہوتا تھا اور اس کے علاوہ کھیلوں کا سامان بھی۔ لوڈو' تاش وغیرہ۔ تھوڑی دیر میں گاؤں والوں کو ہماری آمد کی خبر ہو جاتی تو عورتیں اور بچے شہر والوں کو دیکھنے آس پاس جمع ہو جاتے۔ نانا کو سب لوگ میاں کہتے تھے۔ میاں کے خاندان کے کم عمر لڑکے لڑکیاں بھی ان کے لیے بڑے محترم ہوتے۔ فاصلے قائم رکھے جاتے' پھر دیہاتی عورتیں گُڑ کے لڈو اور باجرے کی ٹکیاں کچھ ہچکچاتے ہوئے پیش کرتیں۔ ہمیں پہلے سے ہدایت ہوتی کہ سوغات میں ملی ہوئی یہ نعمتیں قبول تو کرنا ہیں لیکن ان چیزوں کو کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر آ کر یہ تحفے نوکروں میں تقسیم کر دیے جاتے۔

ہمارے خاندان میں لڑکے لڑکیوں کی نسبت طے ہونے کا جو طریقہ تھا وہ بھی اپنی جگہ ایک نہایت لطیف رسم تھی۔

خواتین کے لیے قاصد کا کام نائن کرتی تھی۔ شادی بیاہ' دعوت کے بُلاوے' غمی خوشی کی اِطّلاع دینا یہ سب اس کا کام تھا۔ نائن کا لباس بھی خاص ہوتا تھا۔ چُوڑی دار پاجامہ' لمبا کُرتا اور اس کے اوپر پشواز اور پورے جسم پر ایک بڑی سی دبیز چادر اوڑھے ہوئے۔

ان عورتوں کے بارے میں کبھی کوئی ناگفتنی خبر نہیں سنی گئی۔ گلی محلّے کے لوگ خواہ وہ کسی مزاج اور عمر کے ہوں ان نامہ بر عورتوں کا لحاظ کرتے تھے۔ یہ عورتیں پیغام رسانی کا کام بھی کرتی تھیں۔ اور کوئی تقریب ہوتی تو مٹھائی وغیرہ لکڑی کے بڑے سے خوان میں سر پر رکھ کر محلّے محلّے بانٹتیں۔ بدایوں میں شادی کا کھانا کبھی کبھی سات قسم کا ہوتا جسے تورہ بندی کہا جاتا تھا۔ یہ کھانا گھر گھر پہنچانا بھی نائنوں کی ذمّہ داری تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ دستر خوان بچھتا' مہمانوں کے سامنے ان کے افرادِ خانہ کے حصّے بھی چُنے جاتے۔ مہمان نے جو کھایا، وہ کھایا بقیہ تمام کھانا نائن ان کے گھر پہنچا دیتی۔تورہ بندی کے لیے مٹّی کی کوری رکابیاں اور پیالے استعمال ہوتے تھے۔

یہ سب کام اپنی جگہ لیکن نائن کا اہم فریضہ لڑکے اور لڑکیوں کی نسبت طے کرواتا ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر گھر کی خواتین کی جانب سے باقاعدہ سلسلہ جُنبانی سے قبل مطلوبہ رشتے کے بارے میں فریقِ ثانی کا ارادہ اور رائے معلوم کرنا نائن کا کام ہوتا تھا۔ اس میدان میں وہ سادہ لوح بھی کسی آزمودہ کار سیاست داں سے کم لیاقت کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔ کُھل کر بات کیے بغیر رشتہ کی خواہش کے اظہار سے لے کر بغیر الفاظ عندیہ معلوم کرنے تک کے تمام مراحل یہ نائن بڑی خوش اُسلوبی سے عبور کر لیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ مہینوں چلتا تھا۔ رشتے بہت کم عمری میں طے کیے جاتے تھے اس لیے فریقین کو بھی عجلت نہیں ہوتی تھی کئی مہینے مطلوبہ گھر کے چکّر لگانے کے بعد ایک دن بڑی خوش' دروازے سے ہی مبارکباد دیتی ہوئی گھر میں داخل ہوتی۔

"اے بی بی ممارخ (مبارک) ہو۔ آج انہوں نے مجھے الائچی والا پان کھلایا۔"

پان تو ہر آئے گئے کو کھلانے کا دستور تھا۔ لیکن اس تواضع میں حفظِ مراتب کی بڑی اہمیّت تھی۔ بزرگوں اور دوستوں کو ہمیشہ تمام لوازمات کے ساتھ پورے پان کی گلوری بنا کر خاصدان میں رکھ کر پیش کی جاتی۔ برابر والوں کے لیے پورا پان نصف تہہ کیا ہوا تھالی میں رکھا جاتا۔ ایک طرف چھالیہ' دوسری طرف تمباکو الائچی وغیرہ۔ رُتبے میں چھوٹے لوگوں کو کُھلا ہوا آدھا پان حسبِ ضرورت چھالیہ تمباکو ڈال کر ہاتھ میں دے دیا

جاتا۔ اس وجہ سے تائن کے پان میں الائچی کی شمولیت اہمیت رکھتی تھی۔ یہ گویا لڑکی والوں کی جانب سے رضامندی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بعد گھر کی بی بیوں کی طرف سے باقاعدہ پیغام جاتا تھا۔ یہ سادہ سادہ تکلفات تھے' وضع داریاں تھیں' رکھ رکھاؤ تھا۔

غالباً" ۸۲ء تھا جب میں نے جیلانی بانو سے خاص طور پر بدایوں کی خیریت دریافت کی۔ یوں تو ہندوستان سے آنے والے ہر مہمان کے ساتھ بدایوں کی خوشبو بھی آجاتی ہے لیکن ان کا آبائی وطن بدایوں ہے۔ ان کے بزرگوں نے حیدر آباد دکن میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

معلوم ہوا کہ دستور ساز زمانہ کے خلاف یہ شہر وقت کے ساتھ بڑھنے اور پھیلنے نکھرنے کے بجائے اپنی ہی حدود میں کچھ اور سمٹ کر رہ گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ بدایوں اب تک ایک خوبصورت صنعتی شہر کا درجہ تو حاصل کر ہی چکا ہوگا۔ اجالے ہی اجالے ہوں گے۔ دکھ ہوا کہ وہ تو اور بھی دُھندلا گیا ہے۔ شاید اس شہر کا مزاج اس کا سبب رہا ہو۔

جو بدایوں میں نے دیکھا اور جتنا بھی دیکھا اس میں قدامت پسندی تھی۔ بے لچک اصولوں کی پابندی تھی اور ایک طرح کی بے ساختہ سی خود ساختگی۔ ورنہ یہ وہی شہر ہے جو ایک زمانے میں ثقافت کا مرکز تھا۔ اس کی خاک سُرمۂ چشم بصیرت تھی۔ اب جو اس کی رونقیں بڑھنے کے بجائے گھٹیں تو اس کا ایک سبب اس کے مذہبی پس منظر کا گہرا رنگ بھی رہا ہوگا۔ پرانے لوگ آباد گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے اور نئے آنے والوں کے لیے یہ ماحول نامانوس تھا۔ یہاں رہنے بسنے میں ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔

میں ایک بار ۴۹ء میں اور دوسری بار ۵۵ء یا ۵۶ء میں ہندوستان گئی تھی۔ دہلی' لکھنؤ' آگرہ اور بدایوں۔ اس کے بعد سے آج تک باوجود دعوت ناموں کے نہیں گئی۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر جاؤں اور بدایوں نہ جاؤں یہ گوارا نہیں اور ایک بار پھر خوبصورت یادوں کو مجروح سسکتا ہوا دیکھنے کی ہمت نہیں۔ میں جب گئی ہوں اس وقت تک وہ گھر موجود تھا لیکن اس گھر کے مکین وہاں نہیں تھے۔ صرف دیوان خانے میں چند رشتہ دار رہ گئے تھے۔ اب تو وہ رشتہ دار بھی نہیں رہے اور وہ گھر بھی نہیں رہا۔ کسی نے

بتایا تھا کہ جس جگہ بڑی حویلی تھی وہاں اب کئی فلیٹ تعمیر ہو چکے ہیں۔ چلتے وقت دیواروں پر ہاتھ کا جو لمس چھوڑا تھا وہ بھی نہیں رہا تو اب کس کے پاس جاؤں۔

ماضی کا دور کتنی ہی دشواریوں میں گزرا ہو کتنی ہی محرومیاں اور مجبوریاں اس وقت مقدر بن گئی ہوں' یادوں کے آئینے میں سجی ہوئی ہر تصویر حسین بھی ہو جاتی ہے اور عزیز بھی۔ اب کبھی بڑی حویلی کا ذکر آجائے تو محبتوں کی پھوار میں بھیگ جاتی ہوں۔ وہ محبتیں جو اس وقت بھی بہت قیمتی تھیں' آج اور بیش قیمت معلوم ہوتی ہیں۔ ساری پابندیاں جن پر دل دُکھا کرتا تھا بے حقیقت نظر آتی ہیں۔ وہ شب و روز جن سے اس زمانے میں شکایتیں بھی ہوئیں آج اتنی دور سے دیکھتی ہوں تو دلکشا اور دلربا نظر آتے ہیں۔

وہ روز و شب بھی کہ جن سے شکایتیں تھیں بہت
اب اتنی دور سے دیکھا تو دل کشا ٹھہرے

بڑی حویلی کے دیوٹ پر ایک دیا اور بھی تھا وہ ہماری اَماں تھیں۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب انہیں اَماں کہتے تھے۔ مجھے یاد نہیں امّی نے کبھی اپنے بچوں پر غصہ کیا ہو۔ لیکن اَماں کی ڈانٹ ہم سب نے بہت کھائی ہے۔ نابینا تھیں لیکن بڑی آن بان سے رہتیں۔ کہنے کو تو وہ ملازمہ تھیں مگر تمام نوکروں اور سب بچوں پر ان کا حکم چلتا تھا خاص طور پر بچوں کی تربیت وہ اپنا بہت بڑا فرض سمجھتی تھیں۔ انہوں نے میری والدہ کی پرورش کی تھی۔ پوری زندگی اسی ایک چوکھٹ پر گزار دی۔ اب بڑھاپے میں ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا ہی نہیں' ادب کرنا بھی ہم سب پر لازم تھا۔ سانولا رنگ' دُبلی پتلی' ہڈیوں پر کھال چپکی ہوئی کبھی لانبا قد رہا ہو گا مگر جب سے میں نے دیکھا لاٹھی کے سہارے جُھک کر چلتی تھیں۔ عمر میں اس خاندان کے ہر فرد سے بڑی تھیں اور اپنی اس بڑائی سے بخوبی واقف۔ وہ کچھ بھی کہہ دیں گھر میں ایسا کوئی نہیں تھا جو پلٹ کر انہیں جواب دے۔ تنخواہ ہر مہینے بڑے ٹھسّے سے وصول بلکہ قبول کرتیں۔

امّی کو بیٹا کہتیں تھیں۔ ان کی تنبیہہ سے بچنا امّی کے لیے بھی مشکل تھا۔ نوکرانیاں

ان سے ڈری سہمی رہتی تھیں لیکن بچے کسی نہ کسی طرح حساب چکاتے رہتے۔ کبھی ان کی لاٹھی چھپا دی کبھی بڑوں کی آنکھ بچا کر ان کی گٹھری پوٹلی کھول دی۔ ہماری شرارتیں ٹال بھی جاتیں لیکن ہمارا ایک قصور ایسا تھا جو ناقابلِ درگزر ہی رہا۔ سردیوں کے موسم میں وہ اپنے بیٹے سے گاؤں کا خالص گھی منگواتیں اور اس میں زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی ذکی مرچیں اور چینی ڈال کر کسی نوکرانی کو حکم دے کر اپنے دبدبے کی نگرانی میں پکواتیں۔ یہ ملغوبہ ایک مٹی کی ہانڈی میں ڈال کر ان کے پلنگ کے سرہانے بڑے طاق میں رکھ دیا جاتا۔ ہر صبح وہ ٹٹول کر ہانڈی اتارتیں' انگلیوں کی مدد سے جمے ہوئے گھی کا ایک حصہ نکال کر کھاتیں۔ ایک بار ہم لوگوں سے کسی بات پر خوش ہو کر اس ناشتے کا راز بتا دیا کہ اس کے کھانے سے کوئی بیماری پاس نہیں پھٹکتی۔ ساتھ ہی بڑی سختی سے تاکید کی کہ اگر کسی نے اس ہانڈی کو ہاتھ بھی لگایا تو اچھا نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیلنج تھا اور بچے ہمہ وقت ہر چیلنج قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ صحت اور بیماری سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی۔ بات دھمکی کی آن پڑی تھی۔ موقع پاتے ہی ہانڈی میں سے مٹھیاں بھر بھر کر یہ مقدّس غذا یا دوا برآمد کر لی گئی مگر جب انتہائے شوق میں اس لذیز حلوے کو کھایا گیا تو مرچوں نے وہ حال کیا کہ اس چوری کی اطّلاع دینے یا امّی سے شکایت کرنے کی انہیں ضرورت نہیں پڑی۔ ہمارے چہرے خود ہی اعلانِ جرم اور اعترافِ جرم دونوں کا اشتہار بنے ہوئے تھے۔ وہ وقت تو خیر جیسے تیسے گزر گیا لیکن آئندہ کے لیے ہم اتنے محتاط ضرور ہو گئے کہ جب بھی امّاں سے ان کی کسی زیادتی کا بدلہ لینا ہوتا ان کا مرچوں کا حلوہ چُراتے ضرور تھے لیکن دوبارہ اسے کھایا کبھی نہیں۔

آخری عمر میں جب نقاہت کی وجہ سے لاٹھی کے سہارے بھی چلنا مشکل ہو گیا تو اپنے بیٹے کو بُلا کر روتی دھوتی سب کو دعائیں دیتی گاؤں چلی گئیں۔ گھر سے ان کی پنشن مقرر کی گئی لیکن انہوں نے کہا کہ وہ کفن اپنے بیٹے کی کمائی کا پہننا چاہتی ہیں۔

بدایوں میں ٹونک والا خاندان کے علاوہ بھی کئی بڑے زمیندار گھرانے تھے۔ صاحب ثروت بھی اور صاحب علم و فضل بھی مگر مجھے تو یہی بے نام و نشاں ہستیاں یاد ہیں جنہیں

میں نے کھلی کتاب کی طرح پڑھا۔ جن کے چہروں پر صبر و رضا کی تنویریں تھیں اور جن کے طریقوں میں اہل حیا کی تعبیریں۔

بڑی حویلی سے میں جنوری ۴۷ء میں رخصت ہوئی اور بدایوں سے مارچ ۴۸ء میں۔

بدایوں اور بڑی حویلی جہاں اُونچی اُونچی چھتوں کے نیچے چھاؤں ہی چھاؤں تھی اور سرخ اینٹوں سفید پتھروں والے آنگن میں دھوپ ہی دھوپ۔

آئینہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایے

ابھی تک یاد ہے مجھ کو
کہ جب چلنا مرے پیروں نے سیکھا تھا
مرے پَیروں میں زنجیریں تھیں
زنجیریں جنھیں آسائشِ تہذیب اور پازیب کہتے تھے

ٹونک والا پھاٹک کے اندر اسلاف کی بنائی ہوئی ایک خود آشنا اور خود ساختہ دنیا آباد تھی۔ اس خاندان کی لڑکیاں بڑے بوجھل نصیب قسّام ازل سے لے کر آتی تھیں۔ سنا تھا کہ ایک زمانے میں تو اس گھر کی لڑکیوں کا بزرگ خواتین کی معیت میں اور ہزار پردوں کے ساتھ بھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنا ممنوع تھا۔ کسی رشتہ دار کے گھر تک نہیں جاسکتی تھیں۔ برادری کے جو لوگ پھاٹک سے باہر رہتے تھے ان کا آنا جانا رہتا لیکن گھر کی لڑکیاں صرف ان کی لڑکیوں کے نام سے واقف ہوتیں اور بس۔ صورت آشنا ہونا ممکن نہیں تھا۔ شادی ہوجاتی تو ملاقات ہوتی۔ غیر خاندان کی خواتین جب گھر میں آتیں تو کنواریوں کے لیے ان سے بھی پردہ کرنا لازم تھا۔ خواہ کتنی ہی عمر ہو چکی ہو ان کا شمار بہ ہر حال لڑکیوں میں ہوتا۔ صرف نو عمر بچیوں کو آزادی سے سانس لینا نصیب تھا۔ وہ بھی کتنے دن۔ میں جن دنوں کو یاد کر رہی ہوں اس وقت بھی اس خاندان میں غیر شادی شدہ معمّر خواتین موجود تھیں۔ ایک تو میری اپنی خالہ تھیں جس چہاردیواری کے اندر وہ پیدا ہوئیں وہی ان کی کُل کائنات تھی۔ ان آنکھوں نے فصیل نما دیواروں اور آنگن پر تنے ہوئے آسمان کے شامیانے کا ایک محدود ٹکڑا ہی ساری عمر دیکھا۔ پتہ نہیں ان آنکھوں میں کبھی کوئی خواب بھی آیا یا وہ بھی ان کی دست رس سے دور ہی رہا۔ کئی محرومیوں سے

نجات کتابوں کے وسیلے سے بھی مل جاتی ہے۔ ان کے لیے یہ در بھی بند تھا۔

یہ عجیب فیصلے تھے کہ شادی صرف خاندان کے اندر ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے بھی بہت سی شرائط موجود تھیں جن میں سے ایک کڑی شرط گھر دامادی تھی۔ زمینوں اور جائیدادوں والے لوگ تھے۔ وراثت پر عورت کا شرعی حق تسلیم شدہ تھا لیکن بھرپور زندگی پر وہ کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔ غیر شادی شدہ خاتون اس معاشرے میں اپنی کوئی رائے کوئی وقعت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ جیتی جاگتی زندگی سے دست برداری کا یہ محضر نامہ ان دیکھی روشنائی سے لکھا لکھایا دست بہ دست چلا آرہا تھا۔ وہ تو اس پر اپنے دستخط ثبت کرنے کی بھی مجاز نہیں تھی۔

وہ بی بیاں واقعی چراغ خانہ تھیں۔ طاق میں رکھے ہوئے دیے کو اپنے ہی اجالے کے لیے کسی اور ہاتھ کا منتظر رہنا پڑتا ہے کہ جب چاہا جلا لیا جس کو چاہا بُجھا دیا۔ اور پھر بجھے ہوئے چراغ کی بساط ہی کیا ہوتی ہے' وہ آنسو جو آنکھ سے دل میں ٹپکا کس نے دیکھا ہے۔

اس پھاٹک کے اندر شادی شدہ خواتین کا مقام بھی قابلِ رشک نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بھی اپنی زندگی کا اثاثہ اپنے میکے کی روایتوں اور رواجوں پر قربان کرنے پر مجبور تھیں۔ شادی کے بعد بیٹیوں کو رخصت کرنا گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ بے شک داماد کی عزت ہمیشہ کی جاتی اور مدارات بھی۔

ایک عظیم گھرانے کی قدیم روایات کے سامنے اپنا ایک علیحدہ گھر بسانے کی آرزو دم توڑ دیتی ہوگی یا شاید اگلے وقتوں میں آرزو پیدا ہی نہ ہوتی ہو۔ وہاں تو سامان نمود نمائش' زیور اور قیمتی لباس ہی کو ایک مکمل زندگی کا درجہ حاصل تھا۔ یہ تمام آسائشیں مہیا ہوتیں خدمت کے لیے خادمائیں موجود تھیں۔ خواتین کی محدود ضروریاتِ زندگی احسن طریقے سے پوری ہوتیں۔ خریداری کے لیے کپڑوں کے تھان بازار کی دکان سے منگوا کر پسند کیے جاتے۔ زیورات کے سیٹ منشی کی نگرانی میں گھر آجاتے۔ سنار خود ڈیوڑھی میں آکر زیورات کے ڈیزائن اور نگینوں کے بارے میں ہدایات حاصل کرتا۔

اس پھاٹک کے اندر بزرگ خواتین کا اپنا ایک دائرہ کار تھا اور وہ اس میں مگن رہتی

تھیں۔ گھر اور برادری کے اندر ان کا مرتبہ مُسلّم تھا۔ رشتہ داروں میں عزت حاصل تھی۔ برادری میں کہیں بھی ساس بہو یا نند بھاوج کی چپقلش ہوتی تو منصفی کے لیے بی بیاں یہیں آتیں اور ان کے فیصلوں کو قبول بھی کیا جاتا۔ یہ بھی ایک اَن لکھا قانون تھا اور اگلے وقتوں سے چلا آرہا تھا۔ غرض ہر کام خاندان کی روایت اور وقار کے مطابق انجام پا رہا تھا اور ایسا نسل در نسل ہوتا چلا آیا تھا۔

خواتین کے لیے دل بہلانے کے اور بھی مشغلے موجود تھے۔ منگنی' شادی' چوتھی' چالے کے علاوہ عقیقہ' بسم اللہ' آمین' گود بھرائی' کَن چھیدن وغیرہ کی تقاریب بڑے اہتمام سے منعقد ہوتیں۔ تائن ہفتوں پہلے گھر گھر بلاوا دینے جاتی۔ تقریب کی رونق کئی کئی دن رہتی میراثنیں ڈھولک پر گیت گاتیں۔ ولادت کے موقع پر دنوں زچہ گیریاں گائی جاتیں جن کے بول بہت دلچسپ ہوتے تھے۔

مردوں کے مشاغل اور ان کی دنیا سے الگ یہ زنان خانے کی زندگی تھی۔ محدود اور محفوظ' مسرور و مغموم جس کے اصول و ضوابط طے شدہ تھے۔ بیٹے جوان ہو جاتے تو ماؤں کو ان کے سامنے لَب کُشائی کا حوصلہ نہ ہوتا۔ اور شاید پرانے وقتوں میں اس کی ضرورت محسوس بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ خواتین بہرطور اور بہ ہرحال زمانے کی دست بُرد سے حصار دَر حصار محفوظ و مامون تھیں۔ گرم موسموں کی آندھیوں سے بچاؤ کے لیے دیواریں اتنی اونچی کروی گئی تھیں کہ تازہ ہواؤں کا گزر ممکن نہیں رہا تھا۔ دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لیے دروازے دریچے مقفّل ہوئے تو نگاہیں چاندنی کے لمس سے بھی محروم ہوئیں۔ جب تک احساس محرومی نہیں تھا زندگی آسان رہی سہل کٹ گئی اور یہی اس صورت حال کا سب سے خوشگوار پہلو تھا۔

روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

اپنی ہی روایات کے تانے بانے میں جکڑے ہوئے اس گھرانے میں زندگی بسر کرنے کے آداب طے شدہ تھے۔ یہ فیصلے بزرگوں نے کیے تھے جو قرنوں سے بغیر کسی تامّل قبول کیے جارہے تھے لیکن وقت کی رفتار جاری تھی۔ منظر تبدیل ہو رہے تھے اور لاشعوری

طور پر رفتہ رفتہ اس خاندان کی سوچ بھی تغیّر قبول کررہی تھی۔ تاش، پچیسی، گنجفہ وغیرہ سے دلچسپی کم ہورہی تھی۔ مقدمہ بازی اور رعیت پر احکام صادر کرنے کے علاوہ اپنے اختیار اور دوسروں کی مجبوری کے نظارے بھی اپنی کشش کھوتے جارہے تھے۔

میرے ہوش سنبھالنے تک ٹونک والوں کی محدود دنیا اور بدایوں شہر میں قابلِ فہم تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اب یہ برداشت کرلیا گیا تھا کہ لڑکے علی گڑھ جاکر انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن کسی بھی محکمے میں کسی بھی عہدے پر ملازمت کا تصوّر اس خاندان کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔

بے شک جائداد موجود تھی لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ اس پر جو فخروناز تھا وہ اس جائیداد سے کہیں زیادہ تھا۔

لڑکیوں کے لیے اسکول کالج کے تمام دروازے ابھی تک بند تھے۔ خواتین قرآن مجید کے بعد اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی تھیں اور ان کے لیے گویا حصول علم کے تمام مراحل طے ہوجاتے تھے۔ گھر کے مرد تعلیم یافتہ بھی تھے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے بھی تھے لیکن جو خاندانی خودساختہ بے لچک اصول تھے ان کی پاسداری بہرحال فرض تھی۔

بدایوں دل والوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ وہاں کے صوفیا، علماء کے تذکرے موجود ہیں۔ شاعری تو بدایوں کی مٹی میں گندھی ہوئی تھی۔ اس شہر کے ناخواندہ لوگ بھی شعر کی تاثیر سے آشنا تھے شہر میں عام مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے تھے۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر کبھی کوئی محفل مشاعرہ منعقد نہیں ہوئی لیکن شعروادب کا ذوق اس خاندان میں بھی کم نہیں تھا۔ نانا کے پاس ادبی رسائل بھی آتے تھے اور مردانہ کوٹھی میں اہلِ علم اور اہلِ سخن کی دعوتیں بھی ہوتیں۔ دوسرے شہروں سے جو شعرا بدایوں آتے ان کی پذیرائی بہت عزت و تکریم سے کی جاتی۔ مجھے یاد ہے نانا کی کوٹھی میں ساغر نظامی یا جگر مراد آبادی کے ترنّم کی لہریں سامعہ نواز ہوتیں تو بی بیاں بند دروازوں کے پیچھے اشعار سننے کے لیے اکٹھی ہوجاتیں۔ ایسے مواقع پر مجھے طیّب اور صدقی پر کیا کیا رشک آتا۔ کئی دن تک وہ ان محفلوں کا آنکھوں دیکھا حال سنا سنا کرلڑکیوں کو شدید

احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے۔

بدایوں کے کئی گھرانوں کے مرد رفتہ رفتہ روزگار کے سلسلے میں علی گڑھ' الہ آباد وغیرہ دوسرے شہروں میں مقیم ہوئے تو برادری کی نکتہ چیں نگاہوں سے دوری ان کی لڑکیوں کے حق میں نعمت ثابت ہوئی۔ اپنے شہر کے نیم تاریک نیم روشن گھٹے ہوئے ماحول سے نجات ملی تو انہیں لڑکیوں کی تعلیم معیوب نہیں نظر آئی لیکن ابھی تک ایسے خوش نصیب لوگ بہت کم تھے۔

زندگی کے احکامات کو کچھ مدت کے لیے ٹالا جاسکتا ہے لیکن قطعی مسترد کردینا ممکن ہی نہیں ہے۔ وقت کی بلند آہنگ دستک تو بندی خانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہوا یہ کہ اندھیروں کی عادی آنکھیں اب دیکھنا سیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ یہ آسان نہیں تھا لیکن اب عورت اپنی زندگی خود بھی جینا چاہتی تھی۔ اس بے جان ہیولے میں شعور کی چنگاری جنم لے چکی تھی۔ یہ صورت حال پہلے سے زیادہ الم ناک تھی۔

زمانہ بہت بدل چکا تھا لیکن میرے چھوٹے ماموں جو وکیل تھے اور جائداد اور زمین کے بکھیڑوں سے اکتا کر حیدر آباد دکن چلے گئے تھے اور اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق بسر کرنا چاہتے تھے اپنی بیوی اور اکلوتی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانے پر اب بھی قادر نہیں تھے۔ میری یہ ممانی ایک رشتے سے میری خالہ بھی تھیں اور خاندان کے دستور کے مطابق اپنے میکے کے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کی بیٹی زہرہ میری ہم عمر تھی۔ زہرہ بے حد حسّاس' ذہین اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ اس بھرے پُرے آسائشوں والے گھر میں کن محرومیوں کا شکار تھی۔ مجھے تو میری ماں نے ڈوبنے سے بچالیا تھا۔ میرے لیے خوش رہنے اور زندگی سے ہم سخن ہونے کے وسیلے پورے خاندان کی مخالفت مول لے کر بھی فراہم کردیے تھے۔ زہرہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکا۔ کیونکہ خود اس کی والدہ کو یہ احساس تھا کہ زہرہ کے والد نے پردیس میں ملازمت کا پیشہ اختیار کر کے اس خاندان کے وقار کو زک پہنچائی تھی۔ حالانکہ انہوں نے کالج میں تدریس کے قابل قدر شعبے سے وابستگی اختیار کی تھی۔ وہ سال بھر کے بعد ایک مہینے کے لیے بدایوں آتے

اور ہر مرتبہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں ناکام ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔ ادھر ممانی اپنے ہی دکھوں کو بہلانے اور بھلانے میں مصروف و مبتلا رہتیں ادھر زہرہ اپنے آپ کو ایک عجیب بے پناہ احساسِ کمتری کی لہروں کے سپرد کرتی چلی گئی۔

ممانی سارا سارا دن میز پوش' پلنگ پوش اور تکیہ کے غلافوں پر پھول پتیاں کاڑھتی رہتیں۔ ان کپڑوں کو وہ کبھی برت نہ سکیں۔ بے رنگ زندگی میں ریشم کے دھاگوں سے رنگ بھرنے کی کوشش میں صندوق بھرتے چلے گئے۔ بڑے آرزو مند لہجے میں کہا کرتیں۔ "جب میں تمہارے ماموں کے پاس جاکر رہوں گی تو اپنے گھر کو ہر رنگ کے اصلی اور نقلی پھولوں سے سجادوں گی۔"

خوش رنگ مخمل پر کچے ریشم یا سنہری روپہلی سلما ستاروں سے کشیدہ کاری کرتیں۔ کبھی کوئی منظر بنتا' کہیں کوئی شعر لکھا ہوتا۔ پھر مخمل کے ان ٹکڑوں کو فریم کرواتیں۔ یہ سب اہتمام وہ اپنے گھر کی آرائش کے لیے کر رہی تھیں۔ وہ گھر جہاں اپنی تمناؤں کے مطابق وہ کبھی نہیں جاسکیں۔ اپنے ان بہلاووں کی مصروفیات میں انہیں یہ احساس ہی نہیں ہو سکا کہ امید و بیم کے جس دوراہے پر انہوں نے اپنی جوان ہوتی ہوئی لڑکی کو کھڑا کردیا ہے وہاں سے اس عمر میں اگر آگے جانے کی راہ نہ ملے تو واپسی کا بھی کوئی راستہ نہیں رہتا۔ آپی بیوہ ہوئیں تو ان کے پاس عہد گزشتہ کی بازیافت کا کوئی خواب بھی نہیں رہ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی بے آس زندگی کو اپنے بچوں کی راہوں سے کانٹے چننے کے لیے وقف کردیا اور میری ممانی کو ان کی امیدوں نے لہولہان کیا۔

یہ نظم میں نے اسی زمانے میں لکھی تھی۔

بیزاری

زیست اک خوابِ طرب ناک و فسوں ساز سہی
رس بھرے نغموں کی اک دل نشیں آواز سہی
فرشِ مخمل بھی زر و سیم کی جھنکار بھی ہے

جنّت دید بھی ہے عشرتِ گفتار بھی ہے
چشمِ سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خواب طرب ناک و فسوں ساز سہی!
قہر ہے اف یہ تسلسل' یہ تواتر' یہ جمود
یہ خموشی' یہ تسلّی' یہ گرانبار سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعت روح کا در باز نہیں
جسم آسودہ سہی روح مگر ہے بے تاب
ایک بے نام تغیر کے لیے
درد کی ٹیس سہی' لذتِ جاوید نہیں
نغمۂ امید نہیں
قہر ہے اف یہ تسلسل' یہ تواتر' یہ جمود
سوچتی ہوں کہ کوئی حجلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل
یہ حیات جامد
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں 'کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اُداس
نور و نکہت سے گریزاں' مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش' ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی
اور بھولے سے کبھی

کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آ نکلے
ایک لمحے کے لیے
میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہو جائے!

میں ان دنوں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پرائیویٹ طور پر دینے کی تیاری کر رہی تھی جب زہرہ اعصابی شکست و ریخت کا شکار ہوئی۔ زہرہ اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں باپ کی آرزوؤں اور امیدوں کا آخری ستارہ خلاؤں میں گم ہو رہا تھا اور سب بے بس تھے۔ اسی زمانے میں اس کی منگنی بھی کر دی گئی کہ شاید اس سہارے وہ زندگی کو قبول کر لے۔ اور پھر وہ زندہ رہتے ہوئے بھی ہماری دنیا سے گزر گئی۔ اس کے منگیتر کے ساتھ اس کی خالہ زاد بہن کی شادی کر دی گئی۔ یہ ۴۵ء یا ۴۶ء کا واقعہ ہے۔

برسوں بعد میری یہ ممانی اپنے شوہر کے گھر گئیں۔ لیکن خالی ہاتھ۔ دل بھی خالی تھا کہ اب اس میں اجالے کی کوئی کرن نہیں تھی۔ اس وقت گئیں جب اجازت دینے والے اس دنیا میں نہیں رہے تھے اور کلاہ خسروی اور ناز کج کلاہی دونوں پر وقت کی گرد جم چکی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر میں بسر کیے۔

سرکاری ملازمت سے وابستہ تو میرے والد بھی رہے لیکن ان کا تعلق ذاتی طور پر ٹونک والا پھاٹک کی زندگی سے اتنا قریبی نہیں تھا کہ ان کی ملازمت اس خاندان کے لیے توہین یا ناراضگی کا سبب بنتی۔ لہٰذا امی کو کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ان کے پاس جاکر رہنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ میرے والد خود پھاٹک کے اندر رہنے کے لیے کبھی نہیں آئے۔

یہ وہ ماحول تھا جہاں میں نے شعر کہے اور چھپوائے بھی۔ برصغیر میں اس قسم کے حالات کم و بیش ہر گھرانے کی خواتین پر گزرے ہیں۔ اور مدتوں صرف زنداں کا طول و عرض مختلف تھا۔ جو خاندان خود اپنی نگاہوں میں جتنا زیادہ معتبر تھا خواتین پر اتنی ہی زیادہ پابندیاں تھیں۔

زر، زمین اور زن تینوں کی حقیقت ایک ہی تھی۔ ملکیت۔ تینوں کا ذکر بھی ایک ہی سانس میں ہوتا رہا ہے۔

جب میری شاعری کی ابتدا ہوئی اسی زمانے میں چند خواتین کا کلام رسائل میں شائع ہو رہا تھا۔ تین نام مجھے یاد ہیں۔ حیا لکھنوی، صفیہ شمیم ملیح آبادی اور نجمہ تصدق حسین۔ اور بھی کئی شاعرات ہوں گی جن کے نام بھول گئی ہوں۔ یا جن کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ صفیہ شمیم سے قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی۔

یہاں اہمیت صرف ناموں کی نہیں ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ بند لبوں نے جراتِ سخن کی۔ شدید حبس میں سانس لینے کی کاوش، بسیط خلا میں سوچنے کی صلاحیت۔ بے شک یہ صدائے احتجاج نہیں تھی۔ لیکن اہم بات یہی ہے کہ ان تمام خواتین کا تعلق روایتی مشرقی گھر آنگن سے تھا۔

اور میں۔ میں اپنی شاعری کو اس ماحول اور اس عصر سے بغاوت کہنا تو چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں سکتی۔ بغاوت اجازت کی تابع نہیں ہوا کرتی۔ مجھے اپنی ماں کی اجازت حاصل تھی۔ شاید یہی احساس ممنونیت تھا کہ میں آج تک تھکی نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ طویل مدت تک عورت کے سفرِ حیات کی داستان پوری دنیا میں کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ مجھے انیسویں صدی کی خواتین کے کچھ اشعار یاد آرہے ہیں۔ دکھ اپنے اپنے عہد کے حوالے سے ہیں مگر کتنے جانے پہچانے۔

روس کی شاعرہ کیرولینا پاولووا (۱۸۰۷ء۔ ۹۳) کہتی ہے۔

"مجھے جینے کو صرف آدھی زندگی مِلی
مجھے آقا ملا
جبکہ ضرورت ایک دوست کی تھی
صرف شبہ
اور میں کتنی شدت سے یقین کی آرزومند ہوں

لیکن امید' اعتماد اور محبت کی قیمت
مجھ پر آشکار ہو گئی!"

فن لینڈ کی شاعرہ لیرین ییرا سکی (۱۹۰۴-۱۸۳۳ء) کہتی ہے۔
"کیا مجھے رب کائنات نے بنایا
کیا میں اسی کی تخلیق ہوں؟"

اور انگلستان کی مشہور ناول نگار اور شاعرہ ایملی برانٹے (۴۸-۱۸۱۸ء) کہہ رہی تھی۔
میں چلوں گی لیکن پرانے سورماؤں کے نقشِ قدم پر نہیں
اور نہ بلند اخلاقیات کے راستوں پر
اور نہ ان چہروں کے درمیان جن کی شناخت ادھوری ہے
(اور جو) گزرے زمانوں کی تاریخ کے دھندلے ہیولے ہیں"

اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی غیر روایتی اور غیر معمولی شاعرہ ایملی ڈکنسن (۸۶-۱۸۳۰ء) جس کو شعر کہنے اور جینے کے لیے انیسویں صدی ملی تھی لیکن جس کے اشعار کو شہرت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی' سوچ رہی تھی۔

"میں اتنی بھوکی تھی
کہ میں پیدا ہی نہیں ہو سکی"

روشنی کی لکیر

جب ان حیران آنکھوں نے
اُجالے اور اندھیرے دیکھنا سیکھا
اندھیرے باادب خدّام کی صورت تھے استادہ
اُجالا ماں کی پلکوں پر دَھرا تھا

میں بند دروازے کے آگے کھڑی ہوئی تھی۔ دستک دینے کی اجازت بھی نہیں تھی اور جرات بھی نہیں تھی۔ دل آرزو مند بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔

پھر ایک مہربان ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ بند کواڑوں نے راستہ دے دیا تھا اور دو روشن اور مستحکم نقوشِ قدم میری رہ نمائی کر رہے تھے۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر رہنے والے ایک طے شدہ ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں روایت شکن قسم کے فیصلے مرد خود اپنے لیے نہیں کر سکتے تھے وہاں عورتوں کے لیے تو سانس لینے کے آداب تک مقرر تھے۔ ایسے میں وہ ہستی صرف ماں کی تھی جس نے نسل در نسل بڑی استقامت اور صبر کے ساتھ اپنی بیٹیوں کے لیے ایک خاموش اور مسلسل جہاد کیا۔

مدّتوں برِّصغیر میں مرد کے پندارِ برتری نے عورت کو علم و آگہی کے ورثے کے قابل ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور مدّتوں عورت احساسِ محرومی سے بھی محروم رہی تھی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ ٹونک والا پھاٹک کے اندر زمرد کا گلوبند ادراکِ حیات سے زیادہ قیمتی تھا۔ یوں بھی جاگیرداری نظام میں یہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زیرِ نگیں مخلوق کو کس حد تک شرف دینا چاہتا ہے۔ اور مرد کو عورت کے ذہن یا اس کے علم کی کچھ ایسی

ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن ہرماں اپنی عمر بھر کی فرماں برداری کے صلے میں اتنی کامیابی ضرور حاصل کرتی رہی کہ اس کی بیٹی کا نقشِ قدم اس رہ گزارِ حیات میں نسبتاً" اونچی اور ہموار سطح پر ہو۔ برِصغیر میں اگلے زمانوں کی عورت نے اپنی تمام محرومیوں کا معاوضہ اتنا ہی چاہا کہ اس کی اگلی نسل کو سانس لینے کے لیے تھوڑی سی اور کھلی فضا میّسر آجائے۔ وہاں ایک دو نفس کی اجازت مل جانا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ بے شک اس کوشش میں وہ شاد کام رہی۔ عورت نے جینے کے لیے بڑا طویل سفر کیا ہے۔

ٹونک والا خاندان میں خصوصاً" آدم کی بیٹیوں کا یہ سفر اور بھی دشوار گزار بنا دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ لیکن میری ماں کے زمانے تک آتے آتے وقت بھی کچھ تیز رفتار ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نسل کی ماں قابلِ شمار رکاوٹوں کو عبور کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ آج کے دوڑتے بھاگتے بلکہ پرواز کرتے ہوئے وقت میں اس ٹھہرے ہوئے اور منجمد دَور کا تصوّر شاید ممکن نہ ہو۔ وہ رینگتا ہوا وقت۔ گھر کی بساط پر کچھ خانے بنے ہوئے۔ ایک شطرنج جس کا ہر مہرہ اپنی جگہ پر قرینے سے رکھا ہوا۔ ایک طویل تسلسل ایک طے شدہ یکسانیت۔ سوچنے، سمجھنے اور دیکھنے کے تمام دریچے بند۔ دبیز دُھند کی چادر اوڑھے ہوئے ارض و سما۔

میری ماں کے سامنے ابھی تک کئی سنگین فصیلیں موجود تھیں۔ انہوں نے اپنے بچّوں کی خاطر حالات اور روایات سے شکست تسلیم نہیں کی۔ ان مہربان، ناتواں ہاتھوں نے پتّھر کی دیوار میں شگاف تراشا۔ اور اس روزنِ دیوار سے تازہ ہَوا کے جھونکے اور روشنی کی لکیر دونوں کو گھُٹے ہوئے اندھیرے دالانوں میں اذنِ باریابی مِلا۔ امّی کی دُور اندیشی اور فراست کے ساتھ نانا کا محترم اور مہربان وجود بھی تھا جو ہمارے لیے گھنے سایہ دار شجر کی طرح تھا جہاں رواج اور ماحول کی تمام تمازتوں سے ہر ممکن پناہ حاصل رہی۔ نانا طبعاً" فراخ دل، روشن خیال اور خاندان پرَور تھے۔ امّی نے اس زمانے کی روِش سے ہٹ کر اور خاندان کی قدیم روایات سے رُوگردانی کرتے ہوئے جو دانش مندانہ فیصلے کیے ان فیصلوں کو نانا کی تائید حاصل رہی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہا لیکن یہ

فیصلے آسان نہیں تھے۔

امّی بہت کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اندازاً" تیس پینتیس سال کی عمر میں۔ مالی پریشانی نہیں تھی۔ اپنا علیحدہ گھر بسانے کی کبھی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔ لیکن بیوگی کی سفید چادر جن کلفتوں اور ظلمتوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے ان کا بوجھ اُٹھانے کے ساتھ ساتھ ایک نومولود بیٹے اور تین کم سن بیٹیوں کی پرورش' پرداخت اور تربیت کی چٹانیں بھی سامنے سر اُٹھائے کھڑی تھیں جنہیں سر کرنا تھا۔ باپ کے سائے سے محروم بچّوں کو اپنی زندگی' اپنی ہی دھوپ اور اپنی ہی چھاؤں میں بسر کرنا سکھانا تھا۔ اور اس ماحول میں جہاں آہ بھرنے کے لیے بھی اجازت درکار تھی۔ ان کے سامنے صرف اپنی زندگی گزارنے کا سوال نہیں تھا۔ اپنے بچّوں کا حال اور مستقبل سنوارنے کے مراحل بھی تھے جو بڑے حوصلے اور مستقل مزاجی کے ساتھ انہوں نے طے کیے۔

میری عبادت گزار کم گو اور صابر ماں غم کی آگ میں تپ کر بے شک کُندن ہو گئی تھیں۔ پورے خاندان کے لیے ان کا وجود ایک رحمت تھا۔ ہم نے ہمیشہ انہیں مصروف دیکھا۔ گود کے بچّوں کا علاج معالجہ ہو یا گھرداری کے انتظامات۔ خاندان میں کوئی بھی بیمار ہو امّی تیمارداری کرتی نظر آتیں۔ گھریلو فیصلے ان کے مشورے سے انجام پاتے ہاں اپنے تمام معاملات انہوں نے اللہ کے سپرد کر دیے تھے۔ میں نے انہیں افسردہ یا اداس نہیں دیکھا۔

انتقال سے چند دن پہلے میرے والد نے ان سے کہا تھا۔

"میری تینوں بیٹیاں اپنا اپنا نصیب لے کر آئی ہیں۔ تم ان کے لیے پریشان نہ ہونا۔ اور میں اُسے نہیں دیکھ سکوں گا لیکن تم اپنے بیٹے کی بہت خوشیاں دیکھو گی"

شاید انہیں جملوں کے سہارے وہ کھڑی تھیں۔ ان جملوں کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ طیّب والد کی وفات کے تین مہینے بعد پیدا ہوئے تھے۔ امّی نے طویل عمر پائی۔ طیّب کے ساتھ ہی رہیں۔ میری بھاوج سعیدہ نے ان سے بیٹیوں سے زیادہ محبت کی۔ ان کے بچّے فوزیہ' فراز' شاداب اور اسماء امّی کی زندگی بھر کی محرومیوں کے صلے کی

طرح ان کے پاس رہے۔ آخری بیماری میں ان کی خدمت کی سعادت بھی سعیدہ کے حصّے میں آئی۔

اس زمانے اس ماحول اور اس گھر کے لحاظ سے اَمّی یقیناً" ایک غیر معمولی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے جو فیصلے کیے وہ بڑے دور رس نتائج کے حامل تھے۔ بے شک نانا کی حمایت انہیں حاصل رہی' لیکن آج جب میں سوچتی ہوں تو مجھے ان کی پیش بنی پر حیرت ہوتی ہے۔ جیسے وہ واقعی وقت کے قدموں کی چاپ کو سن رہی تھیں۔ انہیں اپنے بچوں کے مستقبل کا جو دھیان تھا وہ مامتا کا محض ایک خواب بن کر نہیں رہ گیا۔ انہوں نے اپنے خوابوں کو جیتی جاگتی حقیقت بنانے کی اپنے مقدور بھر اور طویل عرصے تک جدوجہد بھی کی۔ جس کے لیے بڑی ہمت اور استقامت کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے وسائل محدود تھے اور اختیارات محدود تر۔

سب سے پہلا اہم فیصلہ انہوں نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں کیا۔ اگرچہ قدم قدم پابندیوں کی وجہ سے بہت سی آرزوئیں نہ ہماری پوری ہو سکیں نہ ان کی۔ لیکن رکاوٹوں کا مقابلہ تو انہوں نے کیا۔ اپنے اس حق کی اہمیت کا احساس تو حلقۂ خواتین میں بیدار کیا۔

جہاں لڑکیوں کے لیے مروّجہ تعلیم حاصل کرنے کے تمام دروازے بند تھے وہاں اَمّی نے سب سے پہلے میری بڑی بہن کو ایک عمر رسیدہ استاد سے فارسی پڑھوائی اور ساتھ ہی ایک ہندو ٹیوٹر سے انگریزی بھی۔ ٹیوشن کا سلسلہ پردہ کے مکمّل انتظام کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود خاندان کے کئی بزرگ خفا ہوئے۔ مخالفت زیادہ تر خواتین ہی کی جانب سے شدید تھی۔ لڑکیوں کو انگریزی پڑھانا خصوصاً" ناقابلِ درگزر واقعہ یا سانحہ تھا۔ میری ماں نے حالات کا تحمّل سے سامنا کیا لیکن اندھیروں سے سمجھوتے پر راضی نہیں ہوئیں۔ پہلا قدم اٹھایا جا چکا تھا۔ پہلا قدم جو راہِ سفر کا تعیّن کرتا ہے۔ ان کی پوری زندگی ایک تکلیف دہ اور مصنوعی طرزِ حیات کے خلاف خاموش لیکن پر اثر اور نتیجہ خیز احتجاج تھی۔ وقت کے احکام بھی اٹل تھے۔ دیکھتے دیکھتے تعصّبات کی بوسیدہ فصیلیں تڑخ رہی

تھیں۔ مخالفتیں دَم توڑ گئیں۔ اور پھر اس خاندان کی دوسری لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے خود بخود کھُلتے چلے گئے کہ اب ایک نئی روایت جنم لے چکی تھی۔

امّی نے اسکول میں پڑھنے کی میری خواہش بھی پوری کی۔ بدایوں میں اس زمانے میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے امتحانات میں شریک بھی ہوئی لیکن مجھے باقاعدہ کالج میں داخل ہو کر تعلیم حاصل نہ کرسکنے کا دکھ بہت رہا اور بہت دنوں رہا۔ وہ زمانہ 'علی گڑھ یونیورسٹی' گرلز کالج ---- وہ خواب تھا جو کبھی پورا نہیں ہوا۔

میرا جو دکھ تھا اس کا مداوا مولا کے کرم سے میری بیٹی صبیحہ نے کیا۔ جب وہ راولپنڈی میں کالج میں داخل ہوئی تو ان فضاؤں میں سانس' میں لے رہی تھی۔ جب اس نے میری لینڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا تو نصرت و کامرانی مجھے حاصل ہوئی۔

ہاں شاید ابھی تک ایک دلربا رشک کی اصرار کرتی ہوئی کیفیت سے مکمل چھٹکارا نہیں مل سکا ہے' اور چھٹکارا میں چاہتی بھی کب ہوں۔ امریکہ بچّوں کو دیکھنے جاتی ہوں اور ہربار ایمرسٹ اور بوسٹن کی شہرۂ آفاق جامعات کی زیارت مجھ پر لازم آجاتی ہے۔ ہارورڈ' ایم آئی ٹی' یونیورسٹی آف میساچیوسٹس وغیرہ۔ اب تو عزمی کا گھر اسی نواح میں ہے اس لیے یہ پھیرا اور آسان ہوگیا ہے۔

ان ہواؤں میں سانس کتنی نکہت بیز لگتی ہے۔ ارض و سما کا یہ مخصوص حصّہ کتنا پاکیزہ کتنا مقدّس نظر آتا ہے۔ ہر ملک' ہر قوم اور ہر مذہب کی نوجوان نسل کے دمکتے ہوئے اجلے اجلے چہرے۔ یہ خود آشنا اور خود اعتماد چہرے' یہ خوش نصیب چہرے جن کے آئینوں کے آگے کوئی انسان ساختہ دیوار نہیں ہے۔ کتاب اور قلم کی حرمتوں سے آشنا یہ نوجوان جنہیں ان کی اپنی مرادیں ہی پروان چڑھاتی ہیں۔ ان کی امنگوں کے راستوں میں کوئی سنگ گراں حائل نہیں ہوتا۔ اگر مالی حیثیت مستحکم نہیں ہے۔ ماں باپ مجبور ہیں یا مزید اخراجات برداشت کرنا نہیں چاہتے تو چند ماہ کے لیے کوئی سی بھی ملازمت اختیار کرلی۔ پیسے جمع کیے اور اگلی میقات کے لیے دوبارہ داخلہ لے لیا۔ اس میں وقت لگتا ہے مگر اپنی اپنی تشنگی ہے اور اپنی اپنی سیرابی۔

قابل رشک تو ہر ملک ہر قوم اور ہر مذہب کی وہ پرانی نسل بھی ہے جو صدیوں اور قرنوں سے نئی نسل کی راہوں میں چراغ سے چراغ جلاتی چلی آرہی ہے۔ قلب مطمئنہ کا حق دار بھلا ان سے زیادہ کون ٹھہرے گا۔

میرے دیس کے کسی چھوٹے سے گاؤں کا وہ مدرّس جو پیڑ کی چھاؤں میں ٹوٹی پھوٹی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس چند بچّوں کو پڑھاتا نظر آتا ہے، وہ بھی اسی عالمگیر برادری کا ایک معزز رکن ہے۔ مگر آج میرے شہروں کو کیا ہوگیا ہے۔ تدریسی اداروں کی زندگی بخشنے والی ہواؤں میں زہر کس نے گھول دیا ہے۔ میری آنکھوں میں آج کراچی کا تعلیمی ماحول بھی ہے جہاں نوخیز ہاتھوں سے قلم چھین کر خوں آشام ہتھیار تھما دیے گئے ہیں۔ جہاں سال میں آٹھ مہینے فسادات کی وجہ سے درسگاہیں بند رہتی ہیں۔ سلامتی اور آشتی کی وراثت کے امین دھوئیں اور شعلوں میں اپنا چہرہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آج ہمارے بچّوں کی آنکھوں سے خوبصورت خواب تک چھین لیے گئے ہیں۔ مگر انسان انسان سے مایوس کیسے ہوجائے۔ جو ہو رہا ہے انسانی تاریخ میں ایسا بھی ہوتا آیا ہے ہمیشہ ظلمتوں کی کوکھ سے ہی دمکتا ہو آفتاب جنم لیتا ہے۔ اور اجالا باغ و راغ کو نہیں دیکھتا، اور آنکھیں اجالوں کا انتظار کرنا جانتی ہیں۔

جب زہرہ بیمار ہوئی ان دنوں ہم سب لڑکے لڑکیاں چودھویں کے چاند سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اتار چڑھاؤ حیرت انگیز طور پر چاند کے عروج و زوال سے مربوط تھا۔ پونم کی رات اس کی حالت بے انتہا خراب ہوتی تھی۔

ہمیں اس سے محبت تھی۔ دل دُکھتا بھی تھا اور خود اپنی دماغی صحت کی جانب سے ہزار ہا بدگمانیاں دل میں جنم لیتی تھیں۔ ایسے میں اگر انی نے پڑھنے لکھنے کی لگن پیدا نہ کی ہوتی یا اس کو پنپنے کا موقع نہ دیا ہوتا تو شاید ہمارا اعتماد زندگی کی خوش آئندگی پر سے ہمیشہ کے لیے اٹھ جاتا۔ میرے لیے تو میری موزونیٔ طبع اور شوقِ سخن کی بنیاد پر انہوں نے ایک نئے اور انوکھے افق کو لبیک کہنے کی آسائش بھی مہیا کردی تھی۔ جیسے مجھے دو دنیاؤں کی قومیت اور شہریت مل گئی ہو یا جیسے زندگی نے سوتے سوتے اچانک آنکھیں کھول کر

گرد و پیش کا جائزہ لیا ہو۔ ان دنوں کی ایک نظم کا عنوان ہے۔ "افق کے پار" چند مصرعے یاد آگئے۔

یہ زندگی کہ۔ شکست دوام کہیے جسے
طلسم بندگیٔ صبح و شام کہیے جسے
یہ رہ گزر مرے پائے جُنوں کو راس نہیں
یہ تیرگی میری تعمیر کی اساس نہیں
افق کے پار ستاروں کی خواب گاہوں میں
جہاں رواج کی زنجیرِ کہنہ گلتی ہے
جہاں یقین کے سانچے میں آہ ڈھلتی ہے
وہیں لطیف بہار آفریں پناہوں میں
فسوں بدوش نظارے بُلا رہے ہیں مجھے
حیاتِ نو کے اشارے بُلا رہے ہیں مجھے

یہ احساس برصغیر میں اس وقت کے سماجی' سیاسی اور ادبی تناظر میں ایک اجتماعی حقیقت بھی رکھتا تھا۔

بہ ہر حال یہ ہر طور دن گزر رہے تھے۔ وقت کچھ نہ کچھ سکھا بھی رہا تھا۔ اور پھر میرے فارسی کے استاد ناراض ہوگئے۔ ان بزرگ کا نام عبدالستار تھا۔ غالبا" لڑکوں کے اسکول یا کالج میں مدرّس تھے۔ اثر لکھنوی کی ایک رباعی کے معنی پر اختلاف اس ناراضگی کا سبب تھا۔ رباعی اردو کی تھی۔ ایک مصرعے میں جو ترکیب استعمال کی گئی تھی اس کی وضاحت کے لیے ان سے رجوع کیا تھا اور پھر ان کی تشریح کے ماننے سے انکار کردیا۔ اب سوچتی ہوں کہ اختلاف رائے کے باوجود میں احتراما" خاموش بھی رہ سکتی تھی۔ شاید ہر وقت کے اپنے ہی تقاضے ہوتے ہیں۔ خصوصا" کچی عمر میں خود شناسائی کی خواہش بھی بہت سے حیلے تراشتی ہے۔ ایک اقرار کے لیے کئی انکار بھی لازم آجاتے ہیں۔

ماسٹر عبدالستار نے تدریس کا سلسلہ آگے جاری رکھنے سے انکار کردیا اور میں نے ایک بار پھر براہِ راست کتابوں سے اپنا تدریسی سلسلہ جوڑ لیا۔ بعد میں یہی واقعہ اثر لکھنؤی سے میرے تعارف کا وسیلہ بنا۔

بقیہ نصاب کے لیے ہندو ٹیچر تھے۔ پہلے بابو رام اور پھر سدرشن لال۔ جن سے اپنے نصابی مضامین کے علاوہ میں نے ہندی پڑھی اور کچھ عرصہ سنسکرت بھی۔ رامائن شروع کی تھی۔ لیکن خالص ہندی زبان جتنی موہنی ہے سنسکرت کے الفاظ اتنے ہی ثقالت زدہ ملے تلفظ قطعی غیر شاعرانہ۔ دل نہیں لگا۔

بدایوں میں نظامی پریس سے اخبار "ذوالقرنین" شائع ہوتا تھا یہ اخبار اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ نانا کے پاس "ذوالقرنین" مدینہ (بجنور) اور انگریزی روزنامہ "پانیر" آتا تھا اور ایک دو ادبی رسالے بھی۔ رسائل میں میری نظمیں شائع ہوئیں تو پھر میرے پاس تمام قابلِ ذکر ادبی رسائل کے اعزازی شمارے آنے لگے۔ اب میں اپنے خفیہ کتاب گھر سے کتابیں نیچے لے آتی تھی۔ اور بڑی بات یہ کہ تازہ مطبوعات کے وی پی پارسل منگوانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ خریداری منظور شدہ تخمینے کے اندر ہی ہو سکتی تھی۔ مگر میرے سروسامانِ بے اختیاری میں اتنے اختیار کا سرمایہ بھی بہت تھا۔

وہ جدید شاعری اور مختصر افسانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہمارے ادب میں پہلی بار حقیقی زندگی اپنے تمام تاریک اور روشن چہروں کے ساتھ بے نقاب ہوئی تھی۔ اردو شعروادب کی تاریخ کے نئے ابواب تحریر ہو رہے تھے اور ساتھ ہی نئے نئے مباحث بھی چھڑے ہوئے تھے جو برسوں الجھتے سلجھتے رہے۔ شاید اب بھی کسی کونے کھدرے میں موجود ہوں۔

کتابیں تو میں کم ہی خرید سکی لیکن رسالے میرے پاس باقاعدگی سے آرہے تھے۔ اس عہد میں نئے لکھنے والوں کے لیے تنقید بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس وقت تک کتابوں اور مصنفوں کی رُونمائی کی بدعت شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ مضامین محض اخلاقاً یا مصلحتاً نہیں لکھے جارہے تھے۔ اور ناقدیہ مضامین انتقاماً بھی نہیں لکھتا تھا۔ اس

کے پیش نظر فنی محاسن و معائب کا ابلاغ ہوتا تھا کوئی ذاتی رنجش نہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال عندلیب شادانی کے وہ مضامین ہیں جو ساقی میں شائع ہوئے تھے۔ جن میں حسرت، جگر، اصغر اور دوسرے اساتذہ کے اشعار میں خالص فن کے حوالے سے کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی تھی ان موشگافیوں سے ان بزرگوں کا تو کچھ نہیں بگڑا کہ شاعری محض فن نہیں ہوتی۔ صرف موزوں الفاظ کا مجموعہ بھی نہیں ہوتی۔ ماورائے حرف و صوت بھی ہوتی ہے اور بہت کچھ ہوتی ہے۔ البتہ نئے لکھنے والے کے سامنے فنی تقاضوں کے بہت سے پہلو آ رہے تھے اور وہ کچھ نہ کچھ سیکھ ہی رہے تھے۔

اس زمانے میں تنقید نگار حضرات کے جتنے مضامین میری نگاہ سے گزرے میں نے ان سے زبان و بیان کے بارے میں یقیناً" بہت کچھ سیکھا۔ گھر میں آس پاس ساتھیوں یا بزرگوں میں مجھے اس سلسلے میں مشورہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ میں تو جیسے ابھی ابھی ایک بند کوٹھری سے نکل کر ایک وسیع و عریض صحن میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں اکیلی بھی تھی اور نگاہوں کے سامنے بھی تھی۔

ہمارے گھروں میں گنجائش کے باوجود لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرہ نہیں ہوتا تھا۔ میری پوری سلطنت میرا پلنگ تھا اور اب جو اَمّی کی مہربانی سے کتابوں تک رسائی ہوئی تو اس بستر کے ایک کونے میں خود ہوتی بقیہ ہر طرف کتابیں بکھری رہتیں۔ میں آج تک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کے اسلوب سے آگاہ نہیں ہو سکی ۔ آج بھی وہی پلنگ کا ایک کونا یا میری لائبریری کے فرش کا ایک مخصوص گوشہ۔ چاروں طرف بکھری ہوئی کتابیں، ہاتھ میں قلم اور سامنے کاغذ۔ یہی میری مسند ہے اور یہی میری جاگیر۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر ایک اور انقلاب آفریں فیصلہ اَمّی نے باجی کی شادی کے موقع پر کیا۔ اس خاندان میں میری بڑی بہن پہلی لڑکی تھیں جن کی شادی غیر خاندان میں ہوئی اور جو ٹونک والا پھاٹک سے رخصت ہوئیں۔

میرے بہنوئی ڈاکٹر مقبول الحق جنرل عتیق الرحمن کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان دنوں وہ بنارس میں میڈیکل آفیسر تھے۔ باجی شادی کے بعد بنارس جا کر رہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم الحق جو کراچی میں ہیں اور اسلم حق جو انجینئر ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ دونوں ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔

بے شک امّی کے فیصلوں میں اللہ تعالٰی کا فضل و کرم شامل رہا امّی کے اختیار میں جو کچھ تھا انہوں نے اس سے بہت زیادہ ہمارے لیے کیا یہ تمام فیصلے اتنے آسان نہیں تھے۔ مرّوجہ دستور کے خلاف چلنے کی سکت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ میری امّی نے اپنے بچّوں کی راہوں کے تمام کانٹے چُن کر اپنی جھولی میں رکھ لیے ان کی انگلیاں کیا کیا زخمی نہ ہوئی ہوں گی۔ اس روایت پرست خاندان میں مجھے انہوں نے نہ صرف شعر کہنے بلکہ چھپوانے کی بھی اجازت دی۔ صبر، جراَت اور رہنمائی کے جتنے موسم ہیں وہ سب میں نے اس ہستی میں دیکھے جو آج اس دنیا میں نہیں ہے مگر اُجالے کے استعارے کی طرح اپنی اولاد کے ذہن اور دل میں سکونت رکھتی ہے۔

مدّتوں بعد جب میں نے عامر کے نام ایک نظم لکھی اس وقت بھی شاید میرے دل اور ذہن کے کسی گوشے میں میری ماں موجود تھیں۔ اس نظم کا عنوان ہے "شجرِ نازاں" اس کے چند اختتامی مصرعے ہیں ۔

گھنیری چھاؤں جل جائے
تو موسم کی تمازت ہار جاتی ہے
دِلوں میں پھول کھِل جائیں
تو ویرانوں کی شدّت ہار جاتی ہے
مرے بچّے!
مجھے جب دیکھنا جب سوچنا چاہو
تو بس اپنی طرف دیکھو
تمہارے لب پہ جو حرفِ صداقت ہے
یہی میں ہوں

تمہارے دل میں جو نازِ جسارت ہے

یہی میں ہوں

نگاہوں میں جو اِک طرزِ عبادت ہے

یہی میں ہوں

محبّت کی طرح میں بھی ہوں بے پایاں

کبھی ظاہر، کبھی پنہاں

جہاں تم ہو وہاں تک میری خوشبو ہے

وہاں میں ہوں!

سفر ہے شرط

کسی سوچنے والے نے پوچھا

"میں کون ہوں؟ اور کیوں ہوں؟"

"میں کہاں ہوں؟"

کوئی جواب نہیں مِلا۔ آس پاس کوئی تھا ہی نہیں۔ پھر وہ جو اپنے ہی سوال کے نشتر سے گھائل ہوا صائب جواب کے مرہم کی جستجو میں غلطاں رہا۔ آخر رختِ سفر اور سفر کا ارادہ باندھا۔

اہلِ قریہ سے سنا تھا کہ اگلے گاؤں میں ایک بزرگ آشنائے رازِ بصارت اور صاحب رمزِ بصیرت قیام پذیر ہیں۔ بستی کے لوگ ان بزرگ کا نام جانتے تھے۔ دیکھا انہیں کسی نے نہیں تھا۔ اپنے سوال کا بوجھ اٹھائے مسافر اگلے گاؤں پہنچا۔ بزرگ کی زیارت کے لیے بے تاب تھا۔ لیکن جس کے آگے بھی اُن کا نام لیا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس اسم سے موسوم کوئی شخص اس گاؤں میں نہیں تھا۔ ہاں قصبے میں ان بزرگ کی موجودگی کے بارے میں سُنتے وہ لوگ بھی آئے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ حاجت مند دوانہ ہوتا ہے۔ سو اس مراد والے نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ گلی گلی نکڑ نکڑ گھوم کر خود ہی کھوج لگانے کی نیت کی۔

کتنی ہی سردیاں، گرمیاں، برساتیں گزر گئیں۔ نہ سوال کی خلش کم ہوئی نہ جواب کی آسودگی حاصل ہو سکی۔ چلتے چلتے جُوتیاں ٹوٹ گئیں۔ سامنے موچی کی دوکان تھی جا کر کھڑا ہو گیا۔ موچی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"تم نے بڑی دیر لگادی"

نہ جانے آنکھوں نے کہا یا لفظ ہونٹوں سے ادا ہوئے۔ پھر موچی گویا ہوا "تم صرف نام کی جریب تھام کر سرگرداں رہے۔ میں کون ہوں؟ میں تو یہی سوئی دھاگا کیل اور ہتھوڑی ہوں۔ نام میرا وہی ہے جس نام سے پکارنے والا پکار لے۔ میرے پاس تمہارے سوال کا اتنا ہی جواب ہے۔ اب تم اگلی آبادی کی طرف کوچ کرو۔ شاید وہاں تمہارے دل کو کچھ کشادگی نصیب ہو۔"

سفر جو مسافر کے لیے ختم ہی نہیں ہوا تھا ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ماہ و سال کی گردشیں مکمل ہوتی رہیں اور وہ نامکمل تلاش جاری رہی۔ اس بار کسی نام کا موہوم سا سہارا بھی ساتھ نہیں تھا۔ چلتے چلتے تھک کر ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دہقان جو پانی کی نالیاں درست کر رہا تھا پاس آیا۔ کٹورا بھر ٹھنڈا پانی پلایا کہنے لگا۔

"چٹیل زمین پر ہل چلاتا ہوں۔ مٹی نرم ہو جائے تو بیج بوتا ہوں۔ پانی دیتا ہوں۔ نلائی کرتا ہوں۔ کوئی دانہ پھوٹتا ہے کوئی مٹی میں دفن رہ جاتا ہے۔ جسے اختیار ہے اس سے سبب پوچھنے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہاں جتنا پسینہ بہاتا ہوں اتنا ہی ثمر پاتا ہوں۔

مسافر کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ اگلی منزل کی طرف گام زن ہوا۔ دن مہینے ' برس گزر گئے۔ کھیت کھلیان میدان عبور کرتا ہوا بڑھتا رہا۔ چلتا رہا۔ سامنے شہر کے آثار تھے۔

سفر کا آخری حصہ تاروں کی چھاؤں میں کاٹا تھا۔ اذان کی آواز کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ نہروں کی طرح بہتی ہوئی کشادہ سڑکیں ' بلند و بالا ایوان ' جگمگاتے کاخ و کو۔ تھوڑا دن چڑھا تو بازار کی رونق نے دل لبھایا۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہوا ' خلقت اُمڈی ہوئی۔ دوکانیں زر و جواہر سے آراستہ ' اطلس و کمخواب سے پیراستہ۔ دامانِ دل کھینچنے کا ہر سامان بہم تھا۔ باہر کا تماشا دیکھ کر اندر کی لٹک اور تپک بھول ہی گیا۔

انہیں حالوں کئی موسم بیتے۔ گھومتے گھومتے پاؤں کے چھالے گنتی میں جلووں کے لشکاروں سے بڑھ گئے تو اپنا آپا یاد آیا۔ جیسے سوتے سے جاگا۔ جگمگاتے بازار سے رخ موڑ کر ایک پتلی سی ' اندھیری سی گلی میں داخل ہوا۔ یہاں کچھ کارخانے تھے۔ گاہک کے لیے

بیش قیمت سامان کی تیاری کے مراحل تھے۔ ایک جگہ قالین بُنے جا رہے تھے۔ تھکا ڈرماندہ ایک کونے میں جا بیٹھا۔ قالین باف کہ بشرے سے مرد بزرگ نظر آتا تھا متوجہ ہوا۔ کمال مہربانی سے اپنے پاس بلایا۔ کھانے پینے کو پوچھا سفر کی غایت دریافت کی۔ غور سے روداد سنی' توجہ سے نگاہ کی۔ فرمایا۔

"یہ اونی دھاگوں کی ڈھیریاں دیکھ رہے ہو؟ یہاں ہر رنگ کا دھاگا موجود ہے۔ ساتوں رنگ اپنے ہر امکان کے ساتھ ان دھاگوں میں موجود ہیں۔ گہرا' ہلکا' شوخ' مدھم' ہر رنگ۔ بُننے والے ہاتھ آزاد ہیں۔ جو رنگ جہاں چاہیں لگا دیں۔ مگر آزاد نہیں ہیں۔ ہر رنگ کا اپنا ایک مقام ہے۔کوئی ڈیزائن' کوئی نقشہ موجود ہے۔ جس کی پابندی لازم ہے۔ ورنہ تمام رنگ بے معنی ہو جائیں گے۔ ساری محنت اکارت جائے گی۔ سکھانے والا دھاگے پرونا سکھاتا ہے اور بس۔ رنگ کو تو دیکھنے والی آنکھ ہی پہچان سکتی ہے۔"

سنا گیا کہ مسافر نے اپنی بقیہ عمر اسی کوچے میں بسر کی۔ کہ اصل سفر تو اب شروع ہوا تھا۔

رنگ رنگ کے اُون کا ایک لچھا تو ہر ہاتھ میں ہے۔ جو سرا سرا اُلجھا ہوا بھی ہے۔ کوئی آخری سرے کی تلاش میں ہے۔ کوئی پہلا ہی سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے جی ہار جاتا ہے۔

مگر یہ حکایت میں نے کہاں چھیڑ دی۔ یہ بہت دور کی جھلکیاں ہیں۔ میں تو ایک نہایت غیر اہم کہانی کے کچھ ٹکڑے جوڑ رہی تھی۔ ایک ایسے سفر کی رُوداد جو کسی عام سے گھر کے کسی نیم روشن سے گوشے کے طول و عرض تک محدود تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب تک ہر سفر سے اگلے سفر کی بشارت ملتی رہے انسان خستہ و دَرماندہ نہیں ہوتا۔ بے یقینی بھی پاس نہیں پھٹکتی۔ مقصودِ نگاہ مقدر ہو نہ ہو' مژگاں اُٹھانے کی آرزو بھی کچھ کم محترم نہیں ہوتی۔

جو مصور ہوتی تو ہر رنگ سے ہمیشہ ایک ہی تصویر بنائی ہوتی۔ کھاڑیوں' گھاٹیوں' میدانوں میں سرگرداں کوئی راہی۔ چھالوں سے بھرے ہوئے تلوے' گرد میں اٹا ہوا سراپا اور آنکھوں میں بسے ہوئے ستاروں کی تابانیاں۔ ایک بار کہا تھا۔

زنجیرِ بیاباں مرے پیروں میں پڑی ہے۔

اور وہ جو نیم تاریک اور نیم روشن گوشہ تھا اسے میں بھول جاؤں تو پھر یاد بھی کون کرے گا۔

میرا پہلا شعری مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" جو میں نے ۴۷ء میں اپنی شادی سے قبل ترتیب دے کر ناشر (نیا ادارہ لاہور) کے سپرد کر دیا تھا' میرے بہنوئی جمال احمد رضوی کے نام معنون ہے۔ شعر گوئی کی اجازت اسی سے مل گئی تھی۔ لیکن میرے اس ذوق کی اصل پذیرائی اور پرداخت انہوں نے کی تھی۔ یہ انتساب اسی حقیقت کا اعتراف تھا۔ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر عجلت میں کیا تھا۔ (یہ مجموعہ شائع تین سال بعد ۵۰ء میں ہوا) مسوّدہ ناشر کے حوالے کرنے کے بعد مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ نئے روز و شب میں اگر کبھی میں اپنے آپ سے بچھڑ گئی تو اس کمزور سے رشتے کو تھام کر شاید دوبارہ خود سے مل سکوں۔ میرے جانے پہچانے سانجھ سویروں کے اُجلے' دُھندلے نقوش کہیں نہ کہیں تو موجود رہیں گے۔ یہ چند پُرزے بکھرنے سے بچانا ہی تھے۔

میری درخواست پر اس کتاب کا دیباچہ قاضی عبدالغفار نے تحریر کیا اور ہفتہ دس دن کے اندر مجھے موصول ہو گیا۔ کتاب کے سلسلے میں میری دوسری فرمائش ناشر نے ممتاز مصور عبدالرّحمن چغتائی تک پہنچا دی اور انہوں نے ازراہِ عنایت اس کا سرورق میری خواہش کے مطابق تصویر کرنا منظور کر لیا۔ ان دونوں قابلِ احترام شخصیتوں سے نہ کبھی میری ملاقات ہو سکی نہ اس زمانے میں خط و کتابت ہی رہی تھی۔ یہ ان کی شفقت' مروّت اور حسنِ اخلاق تھا جس نے شعر و ادب کے میدان میں ایک نووارد کی پذیرائی کی۔ مدّتوں بعد جب ۶۸ء میں میرا شعری مجموعہ "شہرِ درد" شائع ہوا تو عبدالرّحمن چغتائی کا ایک بہت خوبصورت خط مجھے ملا تھا۔ میری کوتاہی کہ اس کے بعد بھی ان سے ملاقات کے شرف سے محروم رہی۔ اور پھر ایک عرصے کے بعد اسلام آباد میں ان کے بھائی عبدالرّحیم میرے گھر آئے۔ شہرۂ آفاق مصوّر کے انتقال کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ عبدالرّحیم ان کی ایک امانت مجھ تک پہنچانے آئے تھے۔ یہ "عملِ چغتائی" کی ایک جلد تھی جو اس باکمال

مصور نے مجھے عنایت فرمائی تھی۔ دستخط دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اب اس عظیم انسان کا شکریہ کیسے ادا کروں۔

جمال احمد رضوی میری منجھلی بہن کے شوہر تھے۔ بے حد خوش مذاق' خوش مزاج اور خوش گفتار۔ خود شاعر نہیں تھے لیکن شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ شاعری کے فنی تقاضوں سے آگاہ نہیں تھے لیکن شعر کی کیفیت کے مزاج داں تھے۔ جمال بھائی وکیل تھے۔ لکھیم پور (یوپی۔انڈیا) سے ان کا تعلق تھا۔ بعد میں انٹرنیشنل لیبر آفس (I.L.O.) میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ جنیوا اور پھر ملازمت سے سُبک دوش ہونے کے بعد لندن میں اقامت رہی۔ ان کی بیٹی نزہت پروین امریکہ میں ڈاکٹر ہے۔ لڑکا انور جمال امریکہ میں اپنے کاروبار سے منسلک ہے۔

جمال بھائی کا انتقال نو سال قبل لندن میں ہوا۔ وہیں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ میری تقدیر کہ جس قلم کی انہوں نے پرورش کی تھی اسی نے ان کا کتبہ لکھا۔

جمال بھائی نے میرے ذوقِ شعر گوئی کے پنپنے کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ وہ شاعر نہیں تھے لیکن میری شاعری انہیں محبوب تھی۔ ایک بار ناسمجھی کی عمر میں جب میں کھو گئی تھی تو امی نے میرے سامنے پنسلوں اور کاپیوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ اب جمال بھائی نے میرے مطالعے بلکہ تربیت ذوق کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے۔ کلاسیکی ادب سے مجھے انہوں نے ہی آشنا کیا۔ انہیں کی رہ نمائی میں میں نے اردو' فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔

جب میں شمسہ باجی کے گھر سیتاپور جاتی جمال بھائی لائبریری سے میرے لیے منتخب کتابیں لاتے۔ وہ اس لائبریری کے منتظمین میں سے بھی تھے اس لیے مطلوبہ کتب کی خریداری بھی ان کے لیے آسان تھی۔ اور میں اتنی بے تاب کہ بہ یک وقت کئی کتابیں پڑھنا شروع کرتی۔ میری یہ عادت آج تک ہے کہ ایک ہی کتاب مسلسل پڑھتی رہوں تو جی خوش نہیں ہوتا۔ تسلی نہیں ہوتی۔ آج بھی ایک دو کتاب کوئی رسالہ کوئی جریدہ تقریباً" ایک ساتھ ہی پڑھتی ہوں اور تسلسل بھی قائم رہتا ہے۔ پاس ایک ہی کتاب ہو تو

ناداری کا سا احساس رہتا ہے۔

جمال بھائی کو میری شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔ چاہتے تھے کہ ادھر کوئی مصرع موزوں ہو اُدھر اُن کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ میری کوشش ہوتی کہ نظم مکمل ہونے سے پہلے انہیں خبر ہی نہ ہو۔ غزل کا ایک شعر بلکہ ایک مصرع بھی سنایا جا سکتا ہے اور اس کا ابلاغ بھی ہوتا ہے۔ میں زیادہ تر نظم لکھتی تھی۔ نظم اپنی تخلیق کے مرحلے میں نہ کسی اور سے مخاطب ہوتی ہے نہ کسی اور کا مخاطب ہونا گوارا کرتی ہے۔ یہ کرچیوں سے آئینہ ترتیب دینے کا کام ہے۔ یہاں کوئی مصرع جلد باز ہوتا ہے کوئی آہستہ گام۔ تکمیل سے پہلے نظم کوئی مداخلت کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ ہاں بہت طویل یا بیانیہ نظم ہو تو اس کے مختلف حصے اپنی علیحدہ اکائی بھی رکھتے ہیں۔

جمال بھائی کے گھر شعر لکھنے کے لیے میں نے ایک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ سامان کا کمرہ تھا۔ جہاں ایک کے اوپر ایک کئی صندوق اور سُوٹ کیس دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نیچی سی بلندی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ جاتی اور کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتی۔ میں زیادہ تر اپنی اس اخفا کی کوشش میں کامیاب رہتی۔ کبھی کبھی ہار جاتی۔ گرد آلود صندوق پر بیٹھنے کا نشان تو بننا ہی تھا۔ اتفاقاً" جمال بھائی کا اس کمرے میں گزر ہوتا اور یہ نشان نظر آجاتا تو مجھ سے کہتے۔

"آج تو نے شعر کہا ہے۔"

چُھپ چُھپ کر نظمیں ، غزلیں لکھنے کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ کچھ وہ عمر ہی اسرار پسند ہوتی ہے اور مجھے ڈر یہ بھی رہتا کہ نظم کی تکمیل سے قبل ہی وہ کوئی رائے نہ دیں۔ یہ تو ایک جستجو کا سفر تھا' یہاں کسی کی انگلی تھام کر چلنا کیوں گوارا ہوتا۔ اظہار کی آسودگی اور طمانیت سے میں انکار نہیں کرتی۔ جہاں آتی جاتی سانس کو بھی پابجولاں پایا تھا وہاں اسی ایک دریچے سے تو زندگی مجھ سے ملنے آتی تھی۔ اور شعر و ادب کے قاری سے میرا رشتہ رسالوں کے ذریعے قائم اور مستحکم تھا۔

میں کسی کو اپنے اشعار سناتی نہیں تھی۔ نظم' غزل مکمل ہو جاتی تو جمال بھائی کو پڑھنے

کے لیے دے دیتی تھی۔ کبھی خود سنائی انہیں بھی نہیں۔ حالانکہ میں ان کی احسان مند تھی۔ جدید ادب تک میری رسائی انہیں کی مرہونِ منت تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں سعید بھائی۔ (سعید جعفری) کی فرمائش پر ان کے گھر ایک مختصر سی محفل میں پہلی بار اپنی غزل سنائی تھی۔

گئے دنوں اپنی بہن کے گھر میرا جانا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ سال بھر میں ایک بار' ایک یا ڈیڑھ مہینے کے لیے۔ مگر اتنے دنوں کے لیے میں بہت دولت مند ہو جاتی تھی۔ وہ جدید ادب کی صبحِ بہاراں تھی۔ شاعری میں نظم معریٰ اور آزاد نظم متعارف ہو چکی تھی۔ اور تمام شعری مجموعے میں پہلے ہی خریدتی رہتی تھی۔ اس سے زیادہ خریداری کی استطاعت نہیں تھی۔ جدید نثری ادب کا خاطر خواہ مطالعہ میں جمال بھائی کے تعاون سے ہی کر سکتی تھی۔ ان کے گھر ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی نئی کتاب مجھے مل جاتی تھی۔

جدید مختصر افسانہ اس وقت اپنے کمال کی منزلوں کو پہنچ رہا تھا۔ منٹو' بیدی' عصمت چغتائی' مرزا ادیب' احمد ندیم قاسمی' ممتاز مفتی' بلونت سنگھ' غلام عباس' کرشن چندر اور دوسرے اہم افسانہ نگار چونکا دینے والے خوبصورت جدید افسانے تخلیق کر رہے تھے۔ خدیجہ مستور' ہاجرہ مسرور اور قرۃ العین حیدر بھی جدید افسانہ لکھ رہی تھیں مگر ابھی ان کی کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ یہ سب اپنے اپنے انداز میں زندگی کی سچائیوں کے ترجمان تھے۔ بڑا بامراد کارواں تھا۔ اور کچھ شریکِ کارواں خاصے دلیر بھی تھے۔ لگاتار اعتراضات ہو رہے تھے اور مسلسل کتابیں بھی شائع ہو رہی تھیں۔ عدالتوں کے در بھی کھٹکھٹائے جا رہے تھے اور جرم تھا کہ ثابت بھی نہیں ہوتا تھا۔ بڑا جاگتا ہوا جی دار وقت تھا۔

ان سب کو پڑھنے سے پہلے یا شاید جاننے سے بھی پہلے' نثر نگار خواتین میں پہلا نام حجاب امتیاز علی کا میری نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ جو اُن دنوں مس حجاب اسمٰعیل تھیں اور تصوّراتی قسم کی رومانوی کہانیاں لکھ رہی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں ان سے بڑی دلچسپ ملاقاتیں رہیں۔ وہ حقیقی زندگی بھی تصوّراتی انداز سے بسر کرتی ہیں۔ ایک دن

مجھ سے کہنے لگیں "چلیے باغ جناح میں بھونرے دیکھنے چلیں۔"

عرض کیا "اس عمر میں بھلا بھونرے کہاں ملیں گے۔ آپ نے صحیح وقت پر یاد ہی نہیں دلایا۔"

ہنسنے لگیں۔ پھر طے ہوا کہ تتلیاں دیکھیں گے۔

گرمیوں کی بھری دوپہر درختوں کی چھاؤں میں آفتابی محفل اور سردیوں میں کھلی چھت پر جشنِ ماہتاب کی دعوت صرف حجاب ہی دے سکتی ہیں۔ حجاب سے جتنی بار ملاقات ہو دل میں بار بار ملاقات کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔ بے حد دل پسند شخصیت ہیں۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو۔ سید امتیاز علی تاج کی بھتیجی ثریا کی شادی، نور کے پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر شمیم جعفری سے ہوئی تھی اس لحاظ سے انہیں رسمی طور پر بھی رشتہ دار کہا جا سکتا ہے۔ مگر مجھے تو قلم کا رشتہ ہی عزیز ہے۔ اور یہی رشتہ قابل قدر بھی ہے۔

بیتے دنوں خالص افسانوی قسم کے افسانے بھی کچھ کم پرکشش نہیں ہوتے تھے۔ اور بہرحال ایک اندازِ بیان بھی ہوتا ہے جو کسی عام تحریر سے ادب کو ممتاز کرتا ہے۔ لیکن ان دنوں مجھ جیسی نئی لکھنے والی کے لیے ادب کے نئے رجحانات کا سراغ اپنی ہی اہمیت رکھتا تھا۔ سیتاپور کا قیام میرے لیے کچی نیند سے جاگنے جیسا تھا۔ اور پھر جمال بھائی کے ذریعے ہی اثر لکھنوی سے میرا تعارف ہوا۔ اس وقت تک میں فن عروض کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اور جس راہ پر چل پڑی تھی اس کے نشیب و فراز سے آگاہ ہونا بھی ضروری تھا۔

میری نظمیں شائع ہو رہی تھیں اور رسائل کی معرفت میرے پاس لوگوں کے خطوط بھی آرہے تھے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اپنے فارسی کے استاد سے اثر لکھنوی کی رباعی کے معنی میں اختلاف اور اس کے نتیجے میں ان کی ناراضگی کے بعد میں خود بھی ڈانواں ڈول ہو گئی تھی۔ انہوں نے تو ہمیشہ کے لیے چھٹی کر دی مگر میرے دل میں خلش پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے جمال بھائی سے اثر صاحب کا پتہ معلوم کر کے انہیں خط لکھا۔ جس کا انہوں نے بڑا حوصلہ افزا جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے چند نظمیں انہیں اصلاح اور مشورے

کے لیے ارسال کیں۔ انہوں نے کچھ الفاظ کے ردوبدل کے بعد میری نظمیں واپس بھیجیں تو مجھے وہ مصرعے ہی پرائے پرائے لگے۔ اور جب انہیں شائع ہونے کے لیے روانہ کیا تو اپنے ہی سوچے اور لکھے ہوئے الفاظ موجود رہنے دیے۔ رسالے اثر صاحب کی نگاہ سے گزرے تو میری یہ جسارت انہیں ناگوار ہوئی۔ لیکن اس زمانے کے بزرگ درگزر کرنا جانتے تھے۔ انہوں نے آئندہ مشورے کے لیے چیزیں بھیجنے کی تو ممانعت کردی۔ مگر میری درخواست پر علم عروض سے متعلق عربی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کچھ کتابیں مجھے بھیجیں۔ اور اپنا مجموعہ کلام "بہاراں" بھی۔ اشعار پر ان کی اصلاح قبول نہ کرنے کے باوجود میں ان کی شفقت بھری توجہ کی ممنون ہوں۔

اثر لکھنوی کو پہلی بار میں نے لاہور میں ۴۹ء میں دیکھا۔ جس صبح میری ملاقات ان سے سعید بھائی کے گھر ہوئی اسی شام سول سروس اکیڈمی میں پاک و ہند مشاعرہ تھا۔ جس کی صدارت کے لیے وہ لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے۔

میں نے کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی تھی۔ مشاعرہ دیکھا بھی نہیں تھا' صرف ریڈیو پر سنا تھا۔ لیکن مجھے بہ حیثیت سامع بھی شریک ہوتے ہوئے تامل ہو رہا تھا۔ سعید بھائی نے مشکل آسان کردی۔ کہنے لگے "آپ کو پہچانے گا کون۔ لوگوں نے صرف آپ کو پڑھا ہے دیکھا کسی نے بھی نہیں ہے۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ آپ کون ہیں"

مشاعرہ شروع ہوا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اثر صاحب کسی بات پر آزردہ خاطر ہو کر کھڑے ہوگئے۔ کہنے لگے میں جارہا ہوں۔ ساتھ ہی مشاعرے کی صدارت کے لیے میرے نام کا اعلان کردیا۔ ہوش آیا تو میں مسند صدارت پر تھی اور مشاعرہ جاری تھا۔ پھر کسی نے ایک ورق (جو کسی رسالے سے نکالا گیا تھا) میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ غالباً "سعید بھائی نے اکیڈمی میں زیر تربیت افسران کو بتادیا تھا کہ میں اس مشاعرے میں خالی ہاتھ شریک ہوئی تھی۔ اور پھر آداب مشاعرہ کے مطابق' آخر میں بہ حیثیت صدر میں نے اپنی غزل پیش کی۔ یہ تقدیم و تاخیر نہ میرے کسی بزرگ محترم شاعر نے محسوس کی نہ میری

ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کو اس کا کوئی احساس ہوا۔

اس مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال مجید مفتی مجھے اب تک سناتے ہیں۔ کہ جس پہلے مشاعرے میں شرکت کی اس کی صدارت بھی میں نے ہی کی تھی۔ وہ ان دنوں سول سروس اکیڈمی کے تربیتی کورس میں شریک تھے۔

اثر صاحب سے دوسری ملاقات ۵۳ء میں ہوئی۔ کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میرے گھر تشریف لائے۔ انھیں اپنا شعری مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ کتاب کھولی۔ اگلے صفحے پر فراق کا مصرع لکھا ہوا تھا۔

ساز بھی گم گم سوز بھی گم گم

بڑی متانت سے کہا

"فراق کا مصرع لکھا ہے"

تب مجھے یاد آیا کہ فراق سے ان کے سنجیدہ قسم کے اختلافات تھے اور کچھ ڈھکے چھپے بھی نہیں تھے۔

فراق کی شاعری کا دھیما دھیما نغمگی میں ڈوبا ہوا لہجہ مجھے پسند تھا اور میں جانتی تھی کہ فراق کا مصرع ہی میری کتاب کا ذیلی عنوان بن سکتا تھا۔

یہ بزرگانہ وضع داری تھی کہ اثر صاحب نے اس ایک بے ساختہ جملے کے بعد کسی ناخوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اور میں اپنی ناپشیمانی پر شرمندگی سے بچ گئی۔

مسافتوں کے درمیاں

زندگی کے میلے میں شرکت کا احساس مجھے ترقی پسند تحریک نے عطا کیا اور یہ بڑا دل نواز اور جاں پرور احساس تھا۔ فرسودہ روایات میں جکڑی ہوئی ناقابل شناخت تمناؤں کو جیسے اپنے خدوخال نظر آنے لگے تھے۔ جیسے صدیوں سے منجمد آنکھوں کو اچانک بینائی مل گئی ہو۔

نثر اور نظم دونوں میں تازہ کاریوں کا دور تھا۔ میرے لیے آزاد اور معریٰ نظم لکھنا بھی لگے بندھے اور گھلے پڑے ہوئے ضوابط اور روایات سے بغاوت کے اعلان کی طرح تھا۔ اور زندگی سے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اس وقت یہی ایک بغاوت میرے بس میں تھی۔ روزن دیوار سے ستاروں کو گننے والی آنکھیں کھلے آسمان پر رہ گزار مہروماہ کے نظاروں کا اپنا قرض طلب کر رہی تھیں۔ انھیں دنوں میں نے نظم ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' لکھی تھی۔

''میں ساز ڈھونڈتی رہی
جنوں نواز اودی اودی بدلیوں کی چھاؤں میں
میں محو جستجو رہی

یہ ایک طویل نظم ہے جس کا آخری مصرع ہے۔

نظام نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں؟

برصغیر میں سیاسی انقلاب کا زمانہ اردو ادب میں بھی نئے اور تاریخ ساز رجحانات کا

زمانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء میں لندن میں وجود میں آئی تھی اور اس کا منشور بھی تحریر کیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس کو ایک باقاعدہ تنظیم کی شکل سجاد ظہیر کی مساعی نے دی اور پھر برصغیر کے تمام بڑے شاعر ادیب اور دانشور اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ جن میں فراق گورکھ پوری' حسرت موہانی' ٹیگور' پریم چند' مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار جیسی شخصیات بھی شامل تھیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اگلے چند برسوں میں اس تحریک نے لاہور' بمبئی اور حیدر آباد دکن میں بھی اپنے مراکز قائم کر لیے جن میں بمبئی نہایت اہم مرکز تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ترقی پسند مصنفین کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ ان اجتماعات نے اس تحریک کو برصغیر کے اہلِ فکر اور اہلِ نظر تک پہنچانے کا بنیادی فریضہ انجام دیا۔ اس تحریک کو عام لکھنے والوں اور نئی نسل تک پہنچانے کے لیے رسائل کا اجرا بھی ہوا۔

اسی دوران میں مباحثے کے لیے ایک نیا موضوع ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی وجود میں آیا تھا۔ اس بحث نے ترقی پسند تحریک کے لیے ملک گیر تعارف اور عام آدمی کے سامنے اس کی ترجمانی کا کام بھی کیا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ترقی پسند تحریک کے برسرِعمل آنے میں سجاد ظہیر کے سیاسی عقائد بھی شریک کار تھے۔ ان کی ایک کتاب ترقی پسند تحریک کے بارے میں "روشنائی" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ نثری نظم کا ایک مجموعہ "پگھلا نیلم" اور ایک ناول بھی اشاعت پذیر ہوئی۔ سجاد ظہیر کی ادب سے اتنی وابستگی نہیں تھی جتنی سیاست سے تھی۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تحریک نے اردو افسانہ' شاعری اور تنقید کی جوئے کم آب کو بحرِ زخار میں تبدیل کر دیا۔ جن کے مزاج میں صدیوں پرانی روایت نے منفعل داخلیت پسندی اور خود رحمی کی خاصیت پیدا کر دی تھی وہ اب نہ صرف زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے بلکہ ان سے برسرِپیکار ہونے کے لیے بھی آمادہ تھے۔ نئے اذہان کو پرانے ڈھکے چھپے زخموں کے لیے بھی مرہم کی طلب

تھی۔ نیا انسان خود اپنے اوپر اعتماد کرنا سیکھ رہا تھا اور پورے ملک کی سیاسی ٗ سماجی اور معاشی فضا اس کے لیے سازگار تھی۔

یہ تحریک اردو ادب کی حیات نو کا بلاوا بھی تھی اور نوید بھی۔ یوں تو ہر زمانے میں ایک نیا زمانہ جنم لیتا رہا ہے۔ ہر عہد کے حوالے سے ہر عہد کا ادب بھی تغیر آشنا ہوا ہے۔ اٹھارویں صدی میں ولی کی شاعری کو یہ منصب ملا کہ اس نے شاعروں کی سوچ کے زاویے اور اظہار کے انداز یکسر بدل دیے اور اردو شاعری نے زبان و بیان میں بڑی واضح تبدیلیاں قبول کیں۔ شمالی ہند کے شعراء میں شاہ حاتم جیسے استاد نے وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے ضخیم دیوان میں ردوبدل منظور کیا اور "دیوان زادہ" ترتیب دیا۔ اردو ادب میں نئی تحریکیں وجود میں آتی اور ختم ہوتی رہی ہیں۔ پرانے وقتوں کی ایہام گوئی سے نئے زمانے کی ابہام گوئی تک اردو شاعری نے بہت سے لباس تبدیل کیے ہیں۔ یہ سب کچھ محدود پیمانے پر مختلف علاقوں اور مختلف ادوار کے ادب کی تاریخ کا حصہ ہے۔ غالب جیسا روایت شکن ہر عہد میں پیدا نہیں ہوتا کہ اپنے وقت میں بھی جدید تھا اور ہر دور میں جدید فکر کا امام ہے۔

ترقی پسند تحریک منظم تھی۔ ملک گیر تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ سماجی اور معاشی حالات اس کے طرف دار تھے۔ اس تحریک کے اندر سیاسی عوامل بھی کارفرما تھے اور اس کو زمانہ بھی سیاسی بیداری کا ملا تھا۔ جھکے ہوئے سر اٹھ رہے تھے۔ روایات کے بوجھ تلے کچلا ہوا انسان آداب زندگی سیکھ رہا تھا اور سکھا رہا تھا۔ عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں اس وقت ہر وادی اور ہر منزل میں تھا۔ سخت جانوں کے اس قافلے میں نئے جادہ پیما مسلسل شامل ہو رہے تھے۔ ترقی پسند ادب کے لیے وہ بڑا سازگار زمانہ تھا۔ تخلیقی ادب کے موضوعات میں تنوع اور تازگی تھی۔ افسانہ اور تنقید کا دامن وسیع ہوا تھا اور شاعری میں ہیئت کے تجربے ہو رہے تھے جو یقیناً" پرانی شعری روایت سے ایک ناگزیر انحراف تھا "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔" اور جیسا کہ وقت نے ثابت کیا یہ اسی روایت کی توسیع تھی اور ایک نہایت ضروری اور اہم اضافہ بھی۔ مخالفت بھی اس کی جی

بھر کر ہوئی لیکن اس صنفِ سخن کو برگ و بار لانے سے روکنے پر قادر نہیں ہو سکی۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو بہت قد آور شاعر اور ادیب عطا کیے۔ فیض، احمد ندیم قاسمی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، بیدی، عصمت چغتائی، شوکت صدیقی، غلام عباس، اوپندر ناتھ اشک، مرزا ادیب اور دوسرے بہت سے نام۔ اور ان کے فوراً بعد آنے والی نسل کے اہلِ قلم اور وہ بھی جو ابتدا میں اس جماعت میں شامل تھے لیکن اس تحریک کے انتہا پسند سیاسی عقائد کی وجہ سے بعد میں علیحدہ ہوئے یا علیحدہ سمجھے گئے۔ ان میں بھی کچھ کم معتبر اور محترم نام نہیں ہیں۔ مثلاً ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی، محمد حسن عسکری وغیرہ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر احمد علی نے اس تحریک کے ابتدائی مرحلوں میں اس کے لیے بہت کام بھی کیا تھا۔

اس تحریک کا جو خالص سیاسی پہلو تھا اس سے اختلافات بھی اسی زمانے میں شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات کی ایک بڑی وجہ خود اس تحریک کے سرپرستوں کا انتہا پسند رویہ تھا۔ جنھوں نے اس کی والہانہ پذیرائی سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اسے ایک ناقابلِ ترمیم دستور کی حیثیت سے دیکھا جس میں سیاسی نظریات کو انسان کے بنیادی جذبات اور احساسات پر برتری حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک لکھا ہوا ضابطۂ فکر ہر تخلیقی ذہن کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ آئندہ برسوں میں یہی سخت گیر رویّہ اس عظیم الشان تحریک کے زوال کا باعث بنا۔ انحطاط اس وقت شروع ہوا جب ادیبوں اور شاعروں کو ترقی پسند اور رجعت پسند کے سرنامے دیے گئے۔ کچھ بہت بڑے نام اور کام ترقی پسندی کی فہرست سے خارج ہوئے۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ کوئی بھی حساس اور بیدار انسان رجعت پسند ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ بعد میں اس فیصلے پر اظہار تاسف بھی کیا گیا۔

میں نہیں جانتی منٹو کی دیو قامت ادبی شخصیت کو ناقدین نے آج کس خانے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی اسی دورِ مسعود سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک عرصے تک غیر ترقی پسند سمجھے جاتے رہے۔

بہرطور اردو ادب کی تاریخ کا یہ نہایت درخشاں دَور تھا۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ سخن اور یہ ادب زندگی سے قریب تر تھا۔ جو مناظر تھے وہ اپنے آس پاس آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ محض پروازِ تخیل کا کارنامہ نہیں تھے۔ جو خواب تھے وہ ایک عام آدمی کے خواب تھے۔ یہ شاعری صدیوں کے رویوں کی صدائے بازگشت ہرگز نہیں تھی۔ ہاں اس انقلابی شاعری میں کہیں صرف للکار اور کہیں صرف جھنکار بھی سنائی دی اور افسانوی ادب میں کبھی کبھی صداقت نگاری کے نام پر بے باک جرأت آزمائی کے مظاہرے بھی ہوئے۔ مگر یہ سب کچھ تو انفرادی صلاحیتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ کارواں میں ہر مسافر ایک ہی قدو قامت کا نہیں ہوتا اور یہ تو بہت بڑا کارواں تھا۔

ہماری شاعری میں آزاد نظم اور نظم معریٰ بڑی آن بان سے متعارف ہوئی تھی۔ تصدق حسین خالد اور ن م راشد آزاد نظم کے پیش رَو کہے جاتے ہیں۔ غیر محسوس اور محسوس طریقے پر اب اردو شاعری قدیم فارسی غزل کے اثرات سے آزاد ہو کر انگریزی شاعری کا اثر قبول کر رہی تھی۔ سانیٹ بھی لکھے گئے لیکن وہ اردو میں باقاعدہ ایک صنفِ سخن کی حیثیت حاصل نہ کر سکے۔ جس طرح موجودہ دَور میں جاپانی صنفِ سخن ہائکو کا اردو شاعری میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔

ان دنوں اردو شاعری میں تین نام ایسے تھے جو اپنی الگ پہچان رکھتے تھے اور اپنے اپنے منفرد اسلوب کے سبب خاص طور پر نمایاں نظر آرہے تھے۔ ن م راشد، میرا جی اور فیض۔ یہ تینوں رجحان ساز شاعر تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طور کسی نہ کسی حد تک ایک پوری نسل ان تینوں سے متاثر رہی ہے۔ پیروی کی شعوری کوششیں بھی کی گئیں اور غیر شعوری طور پر بھی شاعروں کی نوجوان نسل نے ان کا اثر قبول کیا۔

اسی زمانے میں راشد کا پہلا مجموعۂ کلام "ماورا" کے نام سے شائع ہوا اور فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقشِ فریادی" بھی۔ میرا جی کا ان دنوں اگر کوئی شعری مجموعہ طبع ہوا تھا تو مجھے اس کا نام یاد نہیں۔

ن م راشد کے اشعار میں فارسی زبان کی تمکنت ہے۔ لیکن ان کی نظموں کا ماحول

عام آدمی کے لیے اجنبی سا ہے۔ یہ شاعری ایک تکلف کی فضا میں سانس لیتی ہے۔ اس میں وقار بھی ہے اور شان و شکوہ بھی لیکن عام قاری کو اس تک پہنچنے کے لیے کئی موڑ کاٹنا پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے راشد کو شاعروں کا شاعر کہا گیا۔

میرا جی کے لہجے میں ہندی گیت کا رچاؤ ہے۔

"کبھی آپ ہنسے، کبھی نین ہنسے کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا"

لیکن ان کے بھید تک پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس شاعری میں کچھ دھند کچھ پرچھائیوں کی کیفیت تھی۔ عام قاری نے کچھ دیکھا کچھ نہیں دیکھا، مگر زبان آسان تھی، انداز بیان میں موہنی تھی۔ لہٰذا اس شاعری کا بھی چرچا ہوا۔ جدید شاعری کو علامت نگاری مرغوب رہی خصوصاً" میرا جی کی شاعری کے اجلے اجلے اندھیرے اور دھندلے دھندلے اجالے شعرا کی نئی نسل کے لیے بڑی کشش رکھتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے علامت نگاری نے ایک فیشن کی صورت اختیار کرلی اور بعد میں علامت کبھی ابہام تک جا پہنچی اور کبھی ایمائیت اور کنائے کے خوشنما پیکر میں سامنے آئی۔

میرا جی اور ن م راشد کا شمار بھی ناترقی پسندوں میں کیا گیا تھا۔ صرف فیض تھے جو ان تمام حد بندیوں سے بلند تھے۔ جنہوں نے اپنے عشق اور اپنے وطن اور پورے عالم انسانیت کو ایک ہی لڑی میں گوندھنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔

فیض کے مزاج کا دھیما پن، ان کا لہجہ اور ان کی دردمند شخصیت کا پرتو، اس وقت بھی ان کی شاعری میں عکس فگن تھا۔ اور اس سخن کی دل آویزی اور جاذبیت کی ضمانت بن چکا تھا۔ فیض، راشد اور میرا جی تینوں بہت بڑے شاعر تھے اور اپنا دائرہ اثر بھی رکھتے تھے۔ لیکن عالم گیر سطح پر مقبولیت اور پذیرائی کا درجہ صرف فیض کو حاصل ہوا۔ ان کی شاعری میں غم ذات اور غم کائنات کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ وہ لوگ جو فیض کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے فیض کی شاعری کو رد کردینے کا حوصلہ ان کو بھی نہیں تھا۔

فیض کے نام کے ساتھ اس وقت مجھے جو دوسرا نام یاد آگیا وہ ترکی کے شہرۂ آفاق شاعر

ناظم حکمت کا ہے۔ کہ ان دونوں کی شاعری اور زندگی میں کچھ نہ کچھ مماثلت موجود ہے۔ غم دوراں کو غم جاناں کی طرح دل سے لگائے ہوئے دونوں سر اُٹھا کر چلے۔ زنداں کے اندھیرے ان دونوں چراغوں سے روشن ہوئے قید تنہائی میں دونوں نے اپنے آپ سے باتیں کیں۔ اکتائے بھی گھبرائے بھی لیکن پچھتائے کبھی نہیں فیض کہہ رہے تھے۔

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

اور ناظم حکمت سوچ رہے تھے۔

قید و بند تو کوئی بات نہیں
اصل بات یہ ہے کہ انسان شکست خوردہ نہ ہو"

مشاہیر سے میری ملاقات زیادہ تر لکھے ہوئے لفظ کے وسیلے سے ہی ہو سکی ہے۔ ناظم حکمت کو میں نے شعاع اور عزمی کے ساتھ ایمرسٹ میں تلاش کیا۔ میری بہو شعاع کتابوں کی تلاش میں ہمیشہ بڑی جاں فشانی سے میری مدد کرتی ہے۔ اور جب وہ ساتھ ہو تو اس تلاش میں کامیابی کا یقین بھی میرے ساتھ رہتا ہے۔

میں نے منتخب شعرا کے مجموعے میں ناظم حکمت کی نظمیں دیکھی تھیں اور مجھے فیض یاد آگئے تھے۔ یہ ناظم کا تازہ ترین اور وقیع انتخابِ کلام تھا جو میں خریدنا چاہتی تھی۔ یہ کتاب ایمرسٹ کی تمام لائبریریوں میں موجود تھی۔ لیکن دوکانوں پر دست یاب نہیں تھی۔ وہاں یہ دستور ہے کہ تازہ تصانیف وصول ہوتے ہی جگہ کی کمی کے باعث پہلے سے موجود جن کتابوں کی تھوڑی جلدیں باقی ہوں وہ نصف اور کبھی نصف سے بھی کم قیمت پر لگا دی جاتی ہیں۔ اور اس طرح فوراً" ہی فروخت ہو جاتی ہیں۔ یہ کتاب مارکیٹ میں آئی' فروخت ہوئی اور نایاب ہو گئی۔ بے شک آرڈر دے کر ناشر سے منگوائی جا سکتی تھی۔ مگر اس میں وقت لگتا ہے اور مسافر کے پاس انتظار کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ اسے خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ کتابوں کی شیلف میں ایک جلد دُکان دار کی نگاہ سے اوجھل رہ گئی

تھی جو عزمی نے دریافت کرلی۔

ناظم حکمت (۶۳۔۱۹۰۲ء) ترکی کا پہلا جدید شاعر تھا جس کا شمار عالم گیر سطح پر بیسویں صدی کے عظیم شعراء میں کیا جاتا ہے۔ آزادی اور مساوات کے خواب دیکھنے والے اس شاعر نے کم و بیش اٹھارہ سال اپنے وطن کی مختلف جیلوں میں بسر کیے۔ کئی سال قید تنہائی کی اذیت بھی برداشت کی۔ اور تیرہ سال ماسکو میں جلا وطنی کے کاٹے۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔ ناظم حکمت، کے کلام کا ترجمہ اب تک پچاس سے زیادہ زبانوں میں ہوچکا ہے۔ اس کی نظمیں اور کتابیں جو دوسرے ممالک میں مسلسل طبع ہورہی تھیں اس کے اپنے وطن میں ممنوع تھیں۔ یہ کتابیں ترکی میں اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

اس کی فرد جرم میں ایک خطا یہ بھی تھی کہ فوجی جوان اس کا کلام ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

ایک منظوم خط میں وہ اپنی بیوی کو لکھتا ہے۔

"انہوں نے ہم دونوں کو قیدی بنالیا ہے
بند کردیا ہے
مجھے دیواروں کے اندر اور تمہیں دیواروں کے باہر
مگر یہ تو کچھ بھی نہیں ہے
بدترین صورت حال تو وہ ہوتی ہے
کہ جب لوگ جانتے بوجھتے ہوئے یا ان جانے
جیل اپنے اندر لیے پھرتے ہیں
بہت سے لوگ ایسا کرنے پر مجبور کیے گئے ہیں
ایماندار، محنتی اور اچھے لوگ
جن کا حق تھا کہ ان سے محبت کی جاتی
اتنی ہی جتنی میں تم سے کرتا ہوں"

ایک اور منظوم خط میں تحریر کیا ہے

"جانِ من!
رسن و دار کے موسم میں
میں نے کئی بار اپنی آزادی کو کھویا ہے
اپنے رزق کو بھی اور تمہیں بھی
لیکن آنے والے دِنوں پر اپنے یقین کو کبھی نہیں (کھویا)
(وہ دن جو)
ظلمتوں' چیخوں اور بھوک کے کرب سے طلوع ہو کر
ہمارے دروازے پر دستک دیں گے
جن کے دونوں ہاتھوں میں آفتاب ہو گا۔"

فیض بہ ہر حال ناظم حکمت سے زیادہ خوش نصیب رہے۔ وطن سے دُوری کا دکھ بھی انہوں نے برداشت کیا۔ لیکن ان پر کبھی ان کے گھر' ان کے دیس کے دروازے اس طرح بند نہیں ہوئے۔ فیض نے خود بھی پرائے دیس میں اپنے قیام کے لیے جلا وطنی کا سنگین لفظ استعمال نہیں کیا۔ اگرچہ اپنے پیاروں کے قرب اور اپنی مٹی کی خوشبو کے لیے ترستے وہ بھی رہے تھے۔ یہ تمام عکس ان کے اشعار میں موجود ہیں۔ خاص طور پر ان کی نظم "مرے دل مرے مسافر"۔

وقت اپنے حسابوں چلتا رہتا ہے میں جن دنوں کو سوچ رہی تھی وہ ترقی پسند تحریک کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اور میں خاندانی بوسیدہ روایات کے بوجھ سے ہراساں' زندگی کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ ابھی خود زندگی سے بھی جان پہچان کہاں تھی۔ لیکن یہ تحریک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح دلکش اور دل پذیر تھی۔ اور ہوا کے جھونکے ہی کی طرح اونچی دیواروں سے گھرے محدود آنگن دالان تک پہنچنے پر بھی قادر تھی۔ ابھی رکتے جھجکتے پہلا قدم ادب کی وادی میں رکھا تھا اور جیسے آنکھوں کو نیا منظر میسر آگیا ہو۔ حویلی میں کوئی نیا

دریچہ کُھل گیا ہو۔

ترقی پسند تحریک کا منشور موجود تھا۔ لیکن میں رسمی طور پر بھی اس کی رکن کبھی نہیں رہی۔ نہ اس کے انتہا پسند سیاسی نظریات کو قبول کیا۔ میری نگاہ میں صرف اس تحریک کا ادبی منظر نامہ تھا۔ میں اس شاعری اور ادب کی دل دادہ تھی جس کا اسلوب نو بہ نو تھا۔ یہ شاعری جو سچائیوں کی ترجمان تھی۔ جو مظلوم کی طرف دار تھی اور خود اعتمادی بھی بخش رہی تھی۔ یہ آواز وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔

ترقی پسند تحریک کے جلسوں یا کسی بھی مشاعرے میں شریک ہونا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں اس وقت شعروادب کے بڑے ناموں کو صرف حروف و قلم کے ذریعے ہی جانتی پہچانتی تھی۔ یہ محرومی ایسی تھی جو ایک عرصے تک میرے ساتھ رہی۔ کئی محترم شخصیات جن سے ملاقات کی خواہش رہی انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔ رُوبرو سنا بھی نہیں۔ جن میں پہلا نام فراق گورکھ پوری کا ہے اور یہ فہرست طویل ہے۔

میرے اشعار ترقی پسند ادیبوں کے رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے تھے۔ ترقی پسند ادب کے جو انتخاب شائع ہوتے ان میں بھی میری نظمیں شریکِ اشاعت ہوتیں۔ "نئے زاویے" کا نام مجھے یاد ہے جسے کرشن چندر مرتب کرتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں رسالہ "نگار" کا شمارہ (اکتوبر ۸۶ء) دیکھا تو خوش گوار حیرت سی ہوئی۔ جیسے اچانک ماضی کے کسی آوارہ خرام لمحے سے ملاقات ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "نگار" کے صفحات پر اکثر اہم اور نایاب کتابوں اور مضامین کی اشاعتِ مکرر کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اس شمارے میں انہوں نے "نئی امنگیں" نامی کتاب دوبارہ شائع کی تھی۔ یہ مختصر سی کتاب ۱۹۴۴ء میں "نیا کتاب گھر" دہلی سے شائع ہوئی تھی جس کو پرشوتم سنگھ سیٹھی (جنرل سیکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین) نے مرتب کیا تھا۔ میں اس انتخاب کو قطعی بھول چکی تھی۔ اس میں فیض، فراق، جوش، جذبی، احمد ندیم قاسمی، اخترالایمان، علی جوّاد زیدی اور دوسرے شعرا کی نظمیں شریک اشاعت ہیں۔ میری نظم کا عنوان ہے "یہ جیون یونہی بیتے گا۔"

میں نے اپنی کسی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

"یہ حقیقت ہے کہ آج سے تقریباً" چالیس سال پہلے رہروان شوق کا ایک کارواں جدید شاعری کا پرچم ہاتھ میں لے کر چلا تھا۔ اور ایک لڑکی تھی جو بڑے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ اس کارواں میں شریک ہوئی تھی۔ مجھے اپنی روایات جتنی عزیز ہیں روایتوں سے بغاوت بھی اتنی ہی عزیز رہی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں اکثر تنقید یا تبصرہ نگاروں نے اس قافلۂ شوق کے رہ نوردوں میں اس کا نام لینا الفاظ کا زیاں جانا۔ اور ایک طرح اس پر احسان ہی کیا۔ وہ جو ایک جوئے آہستہ خرام تھی ان ننھے منے سنگ ریزوں نے اس کی راہ میں آکر اسے راز سرشاری رفتار سے آگاہ کیا۔"

اب سوچ رہی ہوں کہ جن تنقید نگاروں کا ذکر اس میں آگیا ہے ان کی طرف داری کا فریضہ بھی ادا کردوں۔

ہوا یہ تھا کہ اس لڑکی نے جب عورت کا روپ دھارا تو اپنے آپ سے بچھڑ گئی۔ گہنے لتے، بار سنگھار اور گود میں چاند سورج۔۔ بارہ تیرہ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا لیکن وہ لڑکی مری نہیں تھی۔ بس ہجوم میں کھو گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ عورت موت کا استقبال تو ایک ہی بار کرتی ہے لیکن جنم بار بار لیتی ہے۔

دشت میں سامنے تھا خیمۂ گل

گیلی مٹی کو سانتے گوندھتے ہوئے ہاتھ بے شکل کو شکل دیتے دیتے اپنی عمر بھی انہیں لگا جاتے ہیں۔ اور دھوپ میں سوکھتے کچے کوزے جب پزاوے کی پوری تمازت جھیل جائیں تب ہی ان کی ساکھ بنتی ہے تب ہی ان کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔

۴۷ء اور اس کے آس پاس کے سال بھی کوئی ایسا ہی دہکتا ہوا الاؤ ساتھ لائے تھے۔ اور وہ جو خوابوں کے صورت گر تھے وہ آگ کو گلزار بنانے کے جذبوں سے آشنا تھے۔ بے شک بہت سی آنکھیں بے نور ہوئیں' بہت سے بدن چکنا چور ہوئے مگر خواب کھرے تھے۔ ان خوابوں کو کوئی گزند نہ پہنچا۔

برصغیر میں تحریک آزادی کی ابتدا نامحسوس اور غیر واضح طور پر ۱۸۵۷ء میں ہو گئی تھی جسے انگریز نے بغاوت کا نام دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم تک یہ تحریک توانا ہو کر مطالبے تک پہنچ گئی۔ اور پھر اسی تحریک آزادی کی کوکھ سے تحریک پاکستان نے اس وقت جنم لیا جب مسلمانوں کو احساس ہوا کہ مغربی طرز جمہوریت میں وہ ہمیشہ کے لیے برصغیر میں اقلیتی فرقہ بن کر رہ جائیں گے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ وجود میں آچکی تھی۔

الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس (۳۰ء) میں علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں پہلی بار پاکستان کے خدوخال واضح کیے۔ انہوں نے کہا کہ "ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہندوستان کی تخلیق بالکل جائز ہے۔"

۱۹۳۵ء میں صوبوں میں کانگرس حکومت قائم ہوئی اور مسلمانوں کا اندیشۂ حق تلفی بڑھتا گیا۔ جس کے آثار نظر آرہے تھے۔

۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ ہندستان کی زبان "ہندی اتھوا ہندستانی" ہوگی اور دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جائے گا۔ کیونکہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآنی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ جس کو ہندستان کے مسلمان بادشاہوں نے رائج کیا تھا۔

ادھر سی پی کی حکومت نے وِدّیا مندر اسکیم کے تحت مسلمانوں کی زبان اور شناخت دونوں کو ختم کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۴۴ء میں ہندو مہاسبھا کے صدر ساورکر نے اردو کے خلاف ہفتہ منایا۔ اس کے جواب میں اسی سال مولوی عبدالحق نے انجمن ترقّی اردو کی جانب سے ناگ پور (ایم پی) میں آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد کی۔ یہ کانفرنس اتنی کامیاب رہی کہ مولانا نے ناگ پور کو جاگ پور کہا۔

تحریکِ پاکستان کا پس منظر یاد کرتے ہوئے کچھ دنوں اور چند واقعات کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ اس صورت حال کا اوپری سا خاکہ ہے جو اس وقت متحدہ ہندستان کے مسلمانوں کو درپیش تھی۔ اور ایسے ہی حالات و واقعات تھے جو مطالبۂ پاکستان کو لوگوں کے ذہن نشین کرتے چلے گئے۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان لاہور میں منظور ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ سے لوگوں کی جذباتی وابستگی بڑھ گئی۔ ایک واضح نصب العین عام مسلمانوں کے سامنے آگیا۔ بے شک کانگریس میں اب بھی مسلمان لیڈر موجود تھے لیکن آنے والے برسوں میں مسلم عوام کی اکثریت ایک علیحدہ آزاد وطن کے مطالبے پر ہم خیال اور ہم آواز ہو چکی تھی۔

تحریک پاکستان کی مخالفت بھی بڑے پیمانے پر ہوئی پورے ملک میں ہنگامے اور فسادات شروع ہوگئے تھے۔ لیکن یہ تحریک عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرتی رہی لوگوں کے جوش اور جذبے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ٹونک والا پھاٹک کے اندر بھی تحریکِ آزادی نے جو کام نہیں کیا تھا وہ تحریک پاکستان نے انجام دیا۔ اور اب اس ذہنی تربیت نے بھی جو علی گڑھ یونیورسٹی کا عطیہ تھی اور

ساتھ ہی اس خاندان کا مذہبی پس منظر۔

قرارداد پاکستان منظرِ عام پر آنے سے پہلے تک پھاٹک کے اندر لیل و نہار کا وہی عالم تھا جو پچھلے زمانوں سے چلا آ رہا تھا۔ مگر زندگی کا سفر ہمیشہ صرف دائروں میں پورا نہیں ہو سکتا۔ گھر میں ریڈیو آ چکا تھا۔ حالات ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ وقت بدل رہا تھا۔ انقلاب کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

میری یاد میں ۴۵۔۱۹۴۴ء کا زمانہ ہے جب ملک کی سیاست اور تحریک آزادی سے الگ تھلگ رہنے والا یہ تغیر نا آشنا خاندان' جس کے مزاج میں روایت پرستی رچی ہوئی تھی اور جسے صرف اپنے ہی نقش قدم پر چلنے کی عادت تھی' ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ سے جذباتی اور عملی دونوں لحاظ سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اس گھرانے میں نئی اور پرانی نسل کے درمیان سیاسی نظریوں میں کوئی اختلاف بھی نہیں تھا جیسا کہ برصغیر کے اکثر گھروں میں ہوا۔ ہمارے گھر میں پاکستان کا قیام سب کے لیے مرکز نگاہ اور مقصد حیات بن گیا تھا۔ دنیاوی حق بھی اور دینی فریضہ بھی۔

بدایوں شہر کی حدود میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ لیکن آس پاس جتنے دیہات تھے ان میں غیر مسلم تقریباً" ۸۰ فیصد تھے کاشتکاروں کا لباس اور طرز رہائش یکساں ہی نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود چھوت چھات کا رویّہ بھی موجود تھا اور بہت شدید۔

نانا کے حلقہ احباب میں غیر مسلم اصحاب بھی تھے۔ ہولی دیوالی کے تہواروں کے موقع پر ان کے یہاں سے پکوان اور مٹھائیوں کے تھال آتے تھے۔ مسلمان زمینداروں کے گھر ان کے ہندو کاشتکار بھی خاص خاص مواقع پر گنے کا رس' دودھ اور دہی کا نذرانہ پہنچاتے۔ خصوصاً" شادی بیاہ کے موقع پر دودھ اور دہی کے ساتھ نیک شگون کے لیے مچھلی بھی آتی تھی۔ ویسے ہمارے گھر میں گیہوں اور دیگر اجناس کی طرح مچھلی بھی کبھی بازار سے نہیں خریدی گئی۔

نانا کو بہت زیادہ پریشان ہم نے ان دنوں دیکھا جب ان کے ہندو منشی نے بغیر کسی وجہ

کے اور بغیر اطلاع دیے ہوئے ملازمت ترک کردی۔ ان کا برتاؤ ملازمین کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا تھا۔ ایک محنتی اور وفادار ملازم کا یہ طرز عمل گویا عمومی طور پر لوگوں کی بدلتی ہوئی سوچ کا مظہر تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ شہر کے آس پاس دیہات میں غیر مسلم کاشتکاروں کی آبادی اکثریت میں ہے۔ اور احساس محرومی کا شکار بھی۔ وہ جن پر نسل در نسل حکمرانی رہی تھی اب ان سے خوف زدہ ہونے کا وقت آگیا تھا۔ کیونکہ غم اور غصہ اچھے اور برے نیک و بد کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ غیر مسلم احباب سے اس زمانے میں بھی نانا کا وہی رشتہ یگانگت قائم رہا جو پہلے تھا۔ اس کے درمیان کوئی کشیدگی کوئی کھنچاؤ پیدا نہیں ہوا تھا۔ کم از کم بظاہر نظر نہیں آرہا تھا۔

زندگی آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا مگر کتنی بے رحمی کے ساتھ۔ فسادات کی آگ وقت کا ہاتھ تھامے پھیلتی چلی جارہی تھی۔ ۴۶ء میں پہلے بہار میں اور اس کے بعد میرٹھ کے قریب گڑھ مکٹیشر کے میلے میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اور پھر پورا ملک ایک سیل بے پناہ میں گھر گیا۔ انتقام در انتقام کا ایک ایسا دائرہ تھا جس میں انسانیت سر برہنہ اور محبت سُرمہ دَر گلو تھی۔ ۴۷ء میں انسان آگ اور خون' نفرت اور خوف کے جس عفریت سے دوچار ہوا اس کی یاد بھی اذیت ناک ہے۔ شہر شہر' گاؤں گاؤں' مذہب کے نام پر فسادات ہورہے تھے۔ مذہب جس کا دوسرا نام انسانیت ہے۔ محبت ہے۔

موت ارزاں تھی اور کسی مذہب کو پہچانتی بھی نہیں تھی۔ ایک دریائے خوں تھا جسے پار کرنا تھا اور ایک جذبہ تھا جو ہارا نہیں تھا۔ لوگ جان کے نذرانے دے رہے تھے۔ ایک یقین تھا جو زندہ تھا اور زندہ رہا۔ ایک ملک غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور غلامی سے نجات اس نے حاصل کی۔ ایک قوم اپنے لیے ایک آزاد وطن کا خواب دیکھ رہی تھی اور وہ خواب تعبیر آشنا ہوا۔ اس خواب اور اس خواب کی تعبیر کے درمیان انسان پر کیا بیتی خدا کرے ہمارے بچے اس کیفیت سے کبھی آشنا نہ ہوں۔ جب انسان انسان پر اعتماد نہ کرسکے۔ محبتوں کے چہرے بجھنے لگیں اور نفرتوں کے الاؤ روشن ہو

جائیں۔ وہ ساعتیں ایسی ہی تھیں جو ہم پر اور ہم سے پہلی نسل پر رینگتی ہوئی صدیوں کی طرح بیتیں۔ سڑک کی جانب سے لوگوں کے بولنے کی اونچی آواز آجاتی تو ماؤں کی نظریں اپنی بیٹیوں کی سمت منجمد ہو جاتیں۔ باپ در و دیوار کا جائزہ لینے لگتے۔

بدایوں میں خدا کا شکر ہے خوں ریزی اور غارت گری کے ہولناک مظاہرے نہیں ہوئے۔ مگر اندیشے دلوں کو کھرچ رہے تھے۔ وسوسے پرانی رفاقتوں کو نیم جاں کر رہے تھے۔ خبریں آرہی تھیں۔ دل لرز رہے تھے۔ دوسرے شہروں میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ اور کسی بھی وقت کسی بھی جگہ کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قاتل اور مقتول اور ظالم اور مظلوم کا فرق مٹ چکا تھا۔ انسانیت نڈھال تھی۔ موت زندگی سے بڑا ظالمانہ خراج لے رہی تھی۔

لکھنؤ شہر بھی فسادات کی وبا سے بچا رہا۔ مگر وہاں بھی خوف کسی آفت سماوی کی طرح ہر جانب فضا پر چھایا ہوا تھا۔ جمال بھائی نے اب لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک بڑے مکان کے ایک حصے میں مالک مکان جن کا تعلق ہندو مذہب سے تھا' رہتے تھے۔ اور دوسرے حصے میں میری بہن کا خاندان ۔ دونوں گھروں کے ڈرائنگ روم کے درمیان ایک دروازہ تھا جو سارے دن کُھلا رہتا۔ دل پسند ہم سائیگی تھی۔ بے حد خوش اخلاق' ہمدرد اور پر خلوص لوگ۔ تھے۔ ہر وقت کی ملاقات تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ جیسے ایک گھر میں ایک ہی خاندان کے افراد رہتے ہوں۔ اکثر رات کو بھی درمیان کا دروازہ کُھلا رہ جاتا۔ مگر اب مذہب کے نام پر انسانیت پابہ جولاں تھی۔ پورے ملک میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک چنگاری کہیں بھی اور کسی وقت بھی پہنچ کر بے پناہ ہو سکتی تھی۔ ذہن میں خوف' دل میں بے اعتباری اور آنکھوں میں بدگمانی جنم لے رہی تھی۔ فضا ایسی ہو گئی تھی کہ اس گھر میں اب ریڈیو مدھم آواز میں سنا جاتا۔ آپس میں باتیں بھی سرگوشیوں میں ہوتیں۔

پڑوسیوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری بھی تھا اور ایک ناقابل شناخت شکستگی بھی اس سلسلے کے درمیان آرہی تھی۔ گفتگو میں بے ساختہ پن نہیں رہا تھا۔ صرف پڑوس کی بوا ہی

تھیں جنہیں ملک اور شہر کی فضا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اپنے پوتے پوتیوں کے لیے کوئی پکوان بناتیں تو شمسہ باجی کے بچوں کے لیے ضرور لے کر آتیں۔ کسی بچے کو کھانسی ہو، پیٹ میں درد ہو تو ڈاکٹر سے پہلے بوا جی دوا دے جاتیں۔ ان دنوں ان پڑوسیوں کے درمیان سب سے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ رات کو ڈرائنگ روم کا درمیان کا دروازہ کس طرح چپکے سے بے آواز بند کیا جائے کہ دوسرے کی دل آزاری نہ ہو۔ اور کھلے دروازے کو بھول جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر جو نقل مکانی ہوئی وہ اسی خوں چکاں، آسیب زدہ اور غیر یقینی صورت حال کا نتیجہ تھی۔

دسمبر ۴۷ء میں نور اپنی ملازمت کے ساتھ پاکستان آگئے تھے میں لکھنؤ میں شمسہ باجی کے پاس تھی۔ مجھے یاد ہے میری بہن صبح سے دوپہر ایک دو بجے تک کا وقت بڑے کرب کے عالم میں بسر کرتی تھیں۔ صبح انور اور نزہت کو اسکول بھیجنے کے بعد وہ کسی جگہ بھی چین سے بیٹھ سکتی تھیں نہ جی لگا کر کوئی کام کر سکتی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکتیں کہ شہر کے تیور کیسے ہیں۔ لکھنؤ کے دامن میں بھی جہنم کی کوئی چنگاری تو نہیں آگری۔ بچے اسکول سے واپس گھر آجاتے تو ان کے چہرے کی بشاشت اور مزاج کی شگفتگی بھی واپس آجاتی۔ لکھنؤ میں کوئی فساد نہیں ہوا لیکن اس وقت کون جانتا تھا۔ ہر جگہ خیر سے زیادہ شر کے امکانات نظر آرہے تھے۔ کسی بھی شہر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

پھر ۳۰ جنوری (۴۸ء) کا دن آگیا۔ گاندھی جی کے قتل کا دن۔ ریڈیو پر پہلا سرکاری اعلان جو جواہر لعل نہرو نے کیا اس کے الفاظ تھے۔ باپو کو کسی پاگل نے قتل کر دیا ہے۔

کمرے میں بجلی کے بلب روشن تھے مگر آنکھوں کے آگے وسوسوں اور اندیشوں کے گھرے اندھیرے چھا گئے۔ نہرو نے قاتل کے لیے پاگل کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ کیا کوئی احتیاط مدنظر تھی۔ کیا بھارت کے وزیر اعظم فسادات کی آگ میں مزید ایندھن جھونکنے سے گریز کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا واقعی وہ کوئی مسلمان شخص ہی تھا؟ اگر ایسا ہے تو

اب انتقامی کارروائی کا سیل بلا کہاں جاکر رکے گا۔ پے بہ پے سوال جو ہونٹوں تک نہیں آئے ایک بڑے لیڈر کی سفاکانہ موت کے احساس کو بھی دھندلا گئے تھے۔ اس وقت جو حال اس گھر میں ہمارا تھا وہی حال پورے بھارت میں ہر مسلمان کا تھا۔ اور کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ اس وقت حرف دعا بھی بے معنی ہو چکا تھا۔

جب تک ریڈیو پر قاتل کے نام کا اعلان ہو مسلمانوں کے ذہن و دل پر صدیاں بیت چکی تھیں۔ ہر شخص پتھر کے مجسمے کی طرح جہاں کا تہاں بیٹھا تھا۔ ہوش آیا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اور یہ بھی ہوش آیا کہ جمال بھائی کی جو بہن ان دنوں ان کے پاس آئی ہوئی تھیں ان کا آٹھ ماہ کا بچہ شدید بیمار ہے۔ کھانسی اور ہلکا ہلکا بخار تو دن میں بھی تھا اور ہومیو پیتھک دوا دی جارہی تھی۔ لیکن اب بخار ایک سو چار (104) ڈگری سے متجاوز تھا۔ اور بچے کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ عام ذہنی انتشار اور غم کی فضا میں اس کو اسپتال لے جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ اور ڈاکٹر کو دکھانا بھی ضروری تھا۔ جمال بھائی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں کسی قریب ترین رہنے والے ڈاکٹر کا فون نمبر اور پتہ تلاش کرنے لگے۔ نمبر مل گیا تو ڈاکٹر کو فون کیا کہ اتنی رات گئے اگر وہ اجازت دے تو معائنے کے لیے بچے کو لے کر اس کے پاس پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر ہندو تھا۔ اس نے کہا موجودہ حالات میں اس وقت آپ کا سڑک پر نکلنا درست نہیں ہے۔ آپ فون پر بچے کا پورا حال تفصیل سے مجھے بتادیں۔ میں دوائیں اور انجکشن لے کر خود آجاؤنگا۔ جس وقت وہ مسیحا نفس ہمارے گھر سے واپس گیا ہے رات کا ایک بج چکا تھا۔

وہ ایک انوکھا موسم تھا۔ جب صبا اور سموم قدم قدم ساتھ چلیں۔ جب چراغوں نے اُجالوں کی سوگند کھائی تھی اور آندھیاں اپنا بل آزما رہی تھیں۔ تند ہوائیں بھی موجود تھیں اور چاروں کھونٹ دیے بھی روشن تھے۔ محبتوں کے کشکول خاک دھول پر اوندھے کر دیے گئے تھے تو ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی خالی جھولیاں محبتوں ہی کے کھنکتے ہوئے سکوں سے بھر دی گئی تھیں۔ ایک مانوس گھر کے دروازے بند ہوئے تھے تو

بے کراں جذبوں اور قربانیوں کے ساتھ حاصل کیا ہوا اپنا وطن اپنا گھر خیر مقدم بھی کر رہا تھا۔

اس ہنگامۂ دارو گیر میں یہ مرحلہ بھی سخت تھا۔ زندگی کے ایک بھرپور دَور سے رشتہ منقطع کرنا آسان نہیں ہوتا۔ صرف دیکھے بھالے شام و سحر' جانے بوجھے اندھیرے اجالے ہی نہیں اپنی روایتیں اور پرانی رفاقتیں تج دینا سہل نہیں۔ خصوصاً" پرانی نسل کے لیے۔ اور رفیق تو وہ در و دیوار بھی ہوتے ہیں جنھوں نے محبّتوں کی پہلی پہلی سرگوشیاں سُنی ہوں۔ جنھوں نے بچپن کی لااُبالیاں اور نادانیاں دیکھی ہوں۔ بڑی بوڑھیوں کے لیے تو وہ قبرستان بھی محترم تھا جہاں باپ دادا کی ہڈیاں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ جو فیصلہ تھا یہ لوگوں کی مجبوری بھی تھی' کڑی آزمائش بھی اور حق بھی۔ پھر یہاں آکر جب مہاجر کا لفظ سننے میں آیا تو دلوں کو مسلمانوں کی ہجرتِ اوّلین کی یاد نے ڈھارس دی۔ اگر یہ ہجرت تھی تو اس مقدس حوالے سے یقیناً سعادت تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ مارچ ۴۸ء میں جب میں پاکستان آئی تو میں اپنے وطن میں تھی۔ جہاں میں کسی بھی شہر میں رہوں سب اپنے تھے۔ قریب بھی اور رفیق بھی۔ اور میری بہن جو ہندوستان میں رہیں وہ اپنے گھر اپنے شہر میں رہ کر بھی ان پر آشوب دنوں میں بے وطن ہو چکی تھیں۔ تنہائی اور مہاجرت تو اس وقت ان کے نصیبوں میں آئی تھی۔ اور ایسے منقسم خاندان بہت سے تھے۔ ابھی تک ہیں۔

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دن بڑی بے سروسامانی کے دن تھے۔ ایک نئی مملکت کی اساس رکھی جا رہی تھی اور مسائل صف بہ صف سامنے کھڑے تھے۔ جن کے مقابل ایک قوم تھی جس کے حوصلے اور عزم کو مولا کے فضل و کرم نے نصرت بھی عطا کی تھی اور آبرو بھی۔ مشکلات قدم قدم تھیں مگر پیشانیاں شکرانے کے سجدوں سے منوّر تھیں۔

آسمان نے اس قطعۂ زمین پر اسلامی اور انسانی رشتوں کی عظمت اور اتحاد و یک جہتی کی شوکت کا مشاہدہ انھیں دنوں کیا۔ وہ زمانہ عشق کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔

امورِ مملکت انجام دینے کے لیے افسر موجود تھے لیکن دفتر نہیں تھے۔ فوری طور پر

عارضی بیرک بنا کر دفتر کھولے گئے تو ضروری سامان موجود نہیں تھا۔ اس کا بھی بہت آسان حل نکال لیا گیا۔ جہاں کرسی نہیں تھی وہاں بیٹھنے کے لیے کریٹ استعمال کیے گئے جن میں بھر کر فائلیں آئی تھیں۔ جس کو میز میسر نہیں آئی اس نے فائل اپنے گھٹنوں پر رکھ کر کام کیا۔ پنیں دستیاب نہیں تھیں ان کا کام ببول کے کانٹوں سے لیا گیا۔

جب رہائش کے لیے جگہ کا سوال سامنے آیا تو مقامی آبادی نے اپنے گھروں میں بھی جگہ دی اور دلوں میں بھی۔ دست گیری بھی کی گئی اور دل داری بھی۔ رہائش کا مسئلہ ان عارضی ٹھکانوں سے حل ہوا جو جنگ کے زمانے میں فوج کے لیے بنائے گئے تھے۔ ایک ایک کمرے میں پورے پورے خاندان رہائش پذیر تھے اور آسائشوں کے گن گا رہے تھے۔

آج لہولہان کراچی میں بیٹھ کر قیام پاکستان کے تاریخ سازدنوں کو یاد کر رہی ہوں۔ کیسے یقین آئے کہ ایک عالمگیر برادری سے تعلق رکھنے والے وہی لوگ جو آج بھی ایک عظیم فلسفۂ حیات کے داعی اور پیروکار ہیں' جو دنیا کے نقشے پر ایک غیر معمولی نظریاتی ملک کے معمار ہیں' صرف چالیس بیالیس برسوں میں طمع ان کے دلوں کو تاراج کر سکتی ہے۔ قائداعظمؒ اور ان کے جلیل القدر ساتھیوں اور تمام جاں نثاروں' سرفروشوں نے کب اور کیوں سوچا ہو گا کہ حصول آزادی کے بعد اسلام کے نام لیوا اپنی خوشی سے قبائلی نظام کے اسیر ہو جائیں گے۔

کپل وستو کا شہزادہ جب اپنے آپے کی کھوج میں نکلا تھا تو عبا اور قبا اور عصا ترک کر کے نکلا تھا۔ ایسی کوئی پرچھائیں اس اجالے کے تعاقب میں نہیں تھی۔ مگر یہ کیسے شہزادے تھے کہ وہ جن کے گھروں چوباروں پر پہچان نے دستک دی وہ محلوں دو محلوں کی تعمیر میں نڈھال ہوئے۔ اور وہ جو صوف پہن کر گھر سے نکلے تھے زرتار قبا کے بوجھ تلے روندے گئے۔

میں آپے رانجھا ہوئی

قیام پاکستان کے کچھ عرصے کے بعد جب فسادات میں اغوا ہونے والی بدنصیب بیٹیوں کی بازیابی کا سلسلہ شروع ہوا تو حساس دلوں نے کچھ صدمے اور سہے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ غیروں کے ہاتھوں زخموں سے چور چور نڈھال معصومیت کو ایک آخری زخم بھی نصیب ہوا۔ اور یہ آخری بھرپور وار کرنے والے ہاتھ اپنوں کے تھے۔

اس ہجوم میں سب نابینا نہ سہی مگر ایسے ماں باپ بھی سامنے آئے جن کی آنکھیں اپنی مجبور اور مظلوم بیٹی کی پہچان سے عاری ہوئیں۔ جو اس تار تار آنچل کا بوجھ اٹھانے پر محبت اور شفقت کے کسی رشتے کو آمادہ نہیں کر سکے۔ جب بے بسی گناہ بن گئی اور بے کسی کفارہ نہ بن سکی۔

برسوں بعد میری ایک دوست نے مجھے انسانی حالات کی نیرنگی کا یہ واقعہ سنایا۔ اس کی سہیلی کا نام رابعہ تھا۔ تقسیم کے زمانے میں دونوں ہندوستان میں ایک ہی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں۔ (میں شہر کا نام نہیں لکھوں گی) ہنگاموں میں دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئیں۔ وہ خود تو پاکستان پہنچ گئی لیکن رابعہ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ اور پھر ایک جگ بیت چکا تھا جب وہ کچھ دنوں کے لیے ہندوستان گئی اور وہاں اتفاقاً" ایک شاپنگ سینٹر میں رابعہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ دونوں وہیں کسی ریستوراں کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئیں۔

بات وہیں سے شروع ہوئی جہاں دونوں کا ساتھ چھوٹا تھا۔ مگر اس دن اس وقت ان کے ماضی کی محلسرا کے کسی ایسے دریچے کے پٹ نہیں کھل سکے جو بیتے دنوں کی خوشیوں اور اجالوں کے امین تھے۔ کیاریوں میں کھلے ہوئے پھولوں اور لان میں رقصاں تتلیوں کا

کوئی منظر ان کی آنکھوں کے سامنے نہیں آیا۔ کسی بے ساختہ ہنسی کی کھنک کانوں میں گونجی نہ کوئی بھولی بسری خوشبو ان کے پاس سے ہو کر گزری۔ آنکھوں میں کوئی نورانی چہرہ آیا نہ سر پر کسی مہربان کا لمس محسوس ہوا۔

وقت کی دھول نے رابعہ کے زخموں کو چھپا لیا تھا لیکن اس لمحے اپنے ماضی کی رازداں سہیلی کو وہ اپنے سب ڈھکے چھپے گھاؤ دکھانے پر جیسے مجبور ہو گئی تھی۔ مدتوں سے کوئی اپنا ملا بھی کہاں تھا۔ وہ بولتی رہی۔ اور دھندلکوں سے پرے گزرے زمانے کی کچھ جھلکیاں اس کی رازداں سہیلی کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ اسے یاد آگیا کہ یونیورسٹی میں فارغ اوقات اور چھٹی کے بعد واپسی کا مختصر سا راستہ رابعہ کے لیے ہمیشہ ایک پریشان کر دینے والا مرحلہ ہوتا تھا۔

وہ ہمیشہ ایک خاص فاصلے پر رہا۔ کبھی منہ سے کچھ کہا بھی نہیں۔ لیکن جتنی دور تک ممکن ہوتا۔ رابعہ کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ جیسے اس کے نقوش پا کی رہنمائی کے بغیر کسی راہ میں کسی روشنی کا کوئی امکان ہی نہ ہو۔ وہ بھی اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ خاموش ہی رہا مگر جب بھی ان دونوں کا سامنا ہوتا اس کی آنکھیں بولتیں۔ اور رابعہ جھنجھلا کر رہ جاتی۔

اور پھر پورا ملک فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ شہر میں اندھیرے اجالے قتل کی اکا دکا وارادت شروع ہو چکی تھی جس میں شدت اس وقت آئی جب پنجاب سے لٹے پٹے غیظ و غم میں ڈوبے ہوئے سکھ شرنارتھیوں کے قافلے وہاں پہنچے۔ ابھی لوگ اپنے بچاؤ یا نقل مکانی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک پورے شہر میں خوں ریزی روز و شب کا دستور بن گئی۔

رابعہ انہیں راتوں اور دنوں کی کہانی سنا رہی تھی۔ یونیورسٹی بند ہو چکی تھی۔ کہنے لگی۔ گھر میں جی اوب جاتا تو اڑوس پڑوس کی لڑکیاں مل کر کسی ایک سہیلی کے گھر اکٹھی ہو جاتیں۔ ان کا محلہ ابھی تک غارت گری سے بچا ہوا تھا۔

اس شام بھی آٹھ دس بڑی چھوٹی لڑکیاں ایک عمر رسیدہ عورت کے ساتھ اپنے

اپنے گھر واپس پہنچنے کے لیے جلدی جلدی گلی سے گزر رہی تھیں کہ اچانک گلی کے موڑ پر ایک بپھرے ہوئے ہجوم نے انہیں گھیر لیا۔ اور پھر روتی دھوتی، چیختی چلاتی لڑکیاں کرپانوں اور خنجروں کی نوک پر آپس میں تقسیم کی جانے لگیں۔ چادروں کی دھجیاں پاؤں تلے روندی جا رہی تھیں۔

اس عرصۂ حشر میں اچانک ایک آواز جو رابعہ کے لیے اتنی اجنبی نہیں تھی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

" بھنو! یہ لڑکی میری یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ ایک سال سے میں اسی کو دیکھ رہا ہوں۔ کرپا کرو یہ لڑکی مجھے بخش دو۔ آج ہی تو موقع ملا ہے۔"

رابعہ نے اس وقت اسے دیکھا یا نہیں دیکھا۔ وہ وہی سکھ لڑکا تھا جس سے یونیورسٹی میں وہ پریشان اور کبھی کبھی خوف زدہ رہتی تھی۔ وہ اسے اپنے دوست کے گھر لے گیا جو پاس ہی تھا۔ سڑک پر شور سن کر وہ اسی مکان سے باہر نکلا تھا۔

اس نے دوست سے بات کی اور لڑکی کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اندر سے دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے رابعہ سے کہا کہ اب وہ قطعی محفوظ ہے۔ بے خوف و خطر آرام کرے۔ صبح ہوتے ہی وہ اسے اس کے گھر پہنچا دے گا۔ اور خود دروازے کے پاس ایک کرسی بچھا کر دروازے ہی کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا۔ اس نے کہا وہ خود اس کمرے میں رات بسر کرنے پر مجبور تھا ورنہ دوسرے تو کیا اس کا دوست بھی اس سے بگڑ جاتا۔ فضا اس حد تک زہریلی ہو چکی تھی کہ ممکن ہے قتل تک نوبت پہنچتی۔ اور رابعہ کی حفاظت کے لیے بھی کمرے میں اس مرد کی موجودگی ضروری تھی جو اسے مال غنیمت کی طرح لایا تھا۔

وہ چپ رہی کہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر دم توڑ چکے تھے۔ وہ خود اس کمرے میں کہاں تھی۔ اس کا پورا وجود کسی بے کنار صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ کسی اندھی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ سانس گھٹ رہی تھی۔ ذہن اندھیروں سے اٹا ہوا تھا۔ رابعہ لمحہ لمحہ موت کا ذائقہ چکھ رہی تھی۔ خوف اور یاس کے زہریلے ناگ اسے پے بہ پے ڈس رہے تھے اور

موت دور کھڑی ہوئی تماشا دیکھ رہی تھی۔ رابعہ کے بس میں کیا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن اور جسم اور روح کی ساری توانائی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ رات اس کے آس پاس رینگ رہی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے اس اجنبی اور شناسا دشمن کی پیٹھ تکتی رہی کہ نہ جانے کب وہ مڑے۔ کب اس کی طرف بڑھے۔ یونیورسٹی میں تو اس کا پیچھا کرتے وہ کبھی تھکا نہیں تھا۔ اور پھر وہ بولتی ہوئی آنکھیں۔

مرد کے خراٹوں کی آواز سن کر بھی اس کی پلک سے پلک نہ لگی۔ رات دھیرے دھیرے گھسٹ رہی تھی اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔

کئی صدیاں گزر گئیں تو اس کی بے خواب اور آنسوؤں تک سے محروم آنکھوں کو کمرے کے روشن دان نے بتایا کہ دور کہیں میلے میلے اجالے کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

رابعہ کو ابھی تک اپنے خوف اور وسوسوں سے نجات نہیں ملی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہن سوچنے کے قابل ہوا۔

اگر واقعی صبح ہو گئی؟ دن کے اجالے پھیلے؟ تو پھر کیا ہو گا؟ وہ سوچ رہی تھی۔ شام پڑے محلّے کی آٹھ دس لڑکیوں پر جو سانحہ گزرا تھا اس کی خبر' دن کا اجالا کہاں کہاں پہنچائے گا۔ وہ لڑکیاں اب نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوں گی۔ وہ خود بھی تو انہیں کے ساتھ تھی۔ اور ایک پوری رات اس نے اپنے گھر سے باہر گزاری تھی۔ اس ایک رات میں ایک زمانہ' ایک عہد بیت گیا تھا۔ ختم ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس قیامت کی رات میں اس نے اپنی تمام عمریں گنوا دی تھیں۔ آج وہ کتنی تہی دست اور کتنی اکیلی رہ گئی تھی۔ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّے کی طرح۔

وہ جو سو رہا تھا اچانک چونک کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو ابھی تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔"

"گھر؟"

وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"ہاں جلدی کرو۔ جلدی سے نکل چلو۔ یہاں لوگ جاگ نہ جائیں"

وہ اب بھی کھڑی نہ ہو سکی۔ گھر میں سب کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کے ماں باپ نے یہ رات کیسے کاٹی؟ اب ان کے دل کے کسی گوشے میں آس کی کوئی پرچھائیں موجود ہو گی یا نہیں۔ کیا اب بھی کسی ہتھیلی پر دعا کا کوئی چراغ روشن رہا ہو گا؟ اب وہ ان کا سامنا کیسے کر سکے گی۔

سب دل شکستہ گھرانوں کے ساتھ اس کے گھر والے بھی اسے رو چکے ہوں گے۔ شاید کبھی انہیں صبر بھی آجائے۔

ایک پوری رات گھر سے باہر بسر ہوئی تھی۔ یہ سفاک حقیقت کسی سے چھپی تو نہ رہی ہو گی۔ اور جو دوسری حقیقت تھی اس کا یقین کس کو آئے گا۔ کیا لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہیں ساری زندگی اس کا اور اس کے ماں باپ کا پیچھا نہیں کریں گی؟ جواب سے محروم سوالوں کے تانے بانے میں وہ الجھی ہوئی تھی۔ اس کا باپ سر اٹھا کر کیسے چلے گا۔ اس کی ماں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے جھک جائیں گی۔ یہ کب سوچا تھا کہ محبت اور شفقت نچھاور کرنے والوں کے لیے ایک دن اس کی موت کا یقین اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا۔

وہ دروازہ کھول رہا تھا۔

"تم وہاں میرا تعاقب کرتے تھے؟" اس نے خود کو کہتے ہوئے سنا۔ وہ گہری اندھیاری میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لفظ و معنی پر اختیار ختم ہو چکا تھا۔

"وہ بڑا سچا جذبہ تھا۔ اور شاید عمر بھر میرے ساتھ رہے گا۔" مرد نے پورے خلوص اور یقین کے ساتھ کہا "مگر مجھے تمہاری آبرو بھی عزیز ہے"

"تو پھر مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میرے اپنوں کی نگاہوں میں بے آبرو ہونے سے مجھے بچا لو۔"

اس کے لبوں سے تقدیر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

رابعہ اپنے نئے نام رابیہ کے ساتھ اب اس شخص کے تین بیٹوں کی ماں تھی۔
یہ تو ایک خاص زمانے کی بپتا تھی۔ لیکن زمانے کی پوتھی میں اور بھی بہت سی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ عورت اور خصوصاً" جھکی ہوئی آنکھوں اور سلے ہوئے ہونٹوں والی مشرقی عورت مدتوں اپنی ہر سانس کا بیاج ہی ادا کرتی رہی ہے۔ اور اگر کبھی جذبہ بے اختیار نے اسے جرات گویائی بخشی تو اپنے وجود کو وہ خود بھی بھول بیٹھی۔

رانجھا رانجھا آکھدی نی
میں آپے رانجھا ہوئی

مگر یہ خود فراموشی بھی اس کے کام کب آئی۔ مٹ جانا اس کی سرشت میں ہے۔ کبھی اپنوں کبھی غیروں کی دہلیز پر قربان ہوتی رہی ہے۔
مجھے اپنی ایک دوست یاد آ رہی ہے۔ اس کا تعلق ایک مہذب اور تعلیم یافتہ، خوش حال گھرانے سے تھا۔ اور وہ کسی سیاسی انتقام کا نشانہ بھی نہیں بنی تھی۔ اس کی شادی تو دونوں جانب سے بڑی چاہت کے ساتھ ہوئی تھی۔ مگر اس کی خوشیوں کو شاید اس کی اپنی ہی نظر لگ گئی۔ چند سال لمحوں کی طرح گزر گئے اور پھر وہ جو صاحب اختیار تھا اور شرعی حقوق بھی رکھتا تھا، اپنی ایک ہی کامرانی پر مطمئن اور قانع کیوں رہتا۔ میری سہیلی کے دکھ وہی تھے جو ہمارے معاشرے میں مشرقی عورت سہتی رہی ہے۔ مجھے اس کا چہرہ اس کی آنکھیں آج بھی یاد ہیں۔ اسے تو رونے کے لیے بھی اجازت درکار تھی۔
ان دنوں میں نے ایک نثری نظم لکھی تھی۔ میرے کسی شعری مجموعے میں شریک نہیں ہے۔ نہ آئندہ ہو گی۔ اتفاقاً" ہی پرانے کاغذات میں مل گئی۔ وہ نظم یا نثر کچھ اس طرح ہے۔

ستارہ زاد آنکھیں
تم نے نہیں دیکھیں
تم نے نہیں پڑھیں

کنگن کے حلقوں کی تحریریں
اڑتے ہوئے رنگوں اور دم توڑتی ہوئی
خوشبو کی آواز بھی نہیں سنی
وہ کہہ رہی تھی
یا شاید صرف سوچ رہی تھی
ریشمیں ساڑیوں
کمخواب کے لباسوں
اور دیبا کی اوڑھنیوں سے
میرے بدن کا رواں رواں چھل گیا ہے
وقت کی چھلنی میں تھوڑی سی ریت باقی ہے
کیا اب بھی میرے زخموں کے لیے
کسی مرہم کی ساعت نہیں آئی
کب تک گونگے آئینے کے سامنے بیٹھی رہوں
دیواروں کے قرضے چکائے جا چکے
یہاں وہاں دائروں میں نقش قدم
ہتھیلیاں خالی ہیں
مگر میری پلکیں امانت دار ہیں
اور تھک گئی ہیں
آندھیوں کے بازار میں جو آخری دیا
جلتا ہوا باقی رہ گیا ہے
اجازت دو
کہ اس دیے سے
اپنی آخری رات روشن کرلوں!

ورنہ سفرِ حیات کا بے حد طویل تھا

برصغیر میں ۴۶۔ ۱۹۴۷ء نہایت اہم انقلابی فیصلوں اور تبدیلیوں کے سال تھے۔

انہیں دو برسوں کے اندر ایک اور خاموش انقلاب تھا جو میری ذاتی زندگی سے تعلق رکھتا تھا۔ جس سے باخبر بھی تھی بے خبر بھی۔

اور پھر وہ خط مجھے ملا۔ اس خط کا جواب دینے سے میں نے کیوں انکار کیا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا بلکہ آسان بھی کہ خاموشی سے خط چاک کرکے پھینک دیا جاتا۔ بہن کو لے جاکر لفافہ دکھاتا جس پر بھیجنے والے کا نام پتہ تحریر تھا اور پھر یہ اعلان کہ میں اس خط کا جواب نہیں لکھوں گی۔ کیا یہ گھر والوں کی رضا حاصل کرنے کا حیلہ تھا یا واقعی اضطراری فعل تھا۔ اب میں یہ سب سوچوں بھی کیوں۔ ادبی حوالے سے اکثر خطوط رسائل کی معرفت آتے ہی رہتے تھے۔ اجنبی طرزِ تحریر میں پتہ لکھا ہوتا اور مجھے نہ کوئی پریشانی لاحق ہوتی نہ حیرت ہوتی۔ ہوا یہ کہ جب یہ خط آیا تو میں حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی ہوگئی۔ جس ماحول میں میں نے آنکھ کھولی تھی وہاں اس کا جواب یقیناً" اپنے جواز کی تلاش میں تھا۔ اور میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

شمسہ باجی اپنے بچوں کے ساتھ بدایوں آئی ہوئی تھیں۔ میں خفا خفا سی ان کے پاس گئی۔

"مجھے یہ خط کیوں آیا ہے؟ میں اس کا جواب نہیں لکھوں گی۔"

شمسہ باجی نے لفافہ میرے ہاتھ سے نہیں لیا۔ مکتوب نگار کا نام بھی نہیں پوچھا۔ مسکرائیں۔

"یہ خط میری اجازت سے آیا ہے۔"

"مگر آپ کو یہ حق نہیں تھا۔" میں ابھی تک پریشان تھی پھر انہوں نے اسی نرم لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے امّی سے بات کی تھی۔ تم اس قدر مشکل لڑکی رہی ہو کہ ہم تمہیں ہر قسم کی اُلجھن سے بچانا چاہتے ہیں۔ جس شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنا ہے کیا تمہارے خیال میں تمہارا یہ حق نہیں تھا کہ اس کے مزاج اور خیالات سے ممکن حد تک واقفیت حاصل کرو۔ کم از کم کوئی اندازہ ہی قائم کر سکو۔ تم ایک اجنبی کے ساتھ بھیج دی جاؤ تو چپ چاپ چلی جاؤ گی۔ پہلے سے تعارف ہو جائے اس پر تمہیں اعتراض ہے۔ اور پھر یہ جو شخص ہے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر آپ اجازت نہیں دیں گی خط میں تب بھی لکھوں گا۔"

یہ رشتہ نور کی خواہش پر ان کی پھوپھی زاد بہن طیبہ جعفری اور شمسہ باجی کی مشترکہ دلچسپی سے طے ہوا تھا۔ دونوں اس زمانے میں سیتاپور میں تھیں اور آپس میں بہت گہری دوستی تھی۔ میں کبھی کبھی شمسہ باجی کے گھر جاتی رہتی تھی وہیں آپا (طیبہ جعفری) سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپا نے سامان کے کمرے میں گرد آلود صندوق اور میری فکر سخن کی حکایت بھی سنی تھی۔

انہیں دنوں شمسہ باجی نے مجھے ایک کتاب دی جس کا وعدہ جمال بھائی نے کئی دن سے کیا ہوا تھا۔ کتاب لے کر میں اپنے گوشۂ تنہائی میں پہنچ گئی۔ اس کتاب کے اندر ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اور تصویر کے کونے پر صاحبِ تصویر کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس رات میں نے ایک نظم لکھی "دو نین کنول"

ابھی ابھی میں ایک محدود اور محفوظ و مامون جزیرے میں اپنے وجود کی ساری بے خبری اور بے اختیاری کے ساتھ مگن تھی۔ اب نامعلوم اور لامحدود سمندروں کا بلاوا تھا۔ اور اس بلاوے میں کشش تھی۔ آشیانے میں آنکھ کھولنے والا طائر بے کراں فضاؤں سے خوف زدہ تو نہیں ہوتا۔ میں تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی۔

جنوری ۷۴ء میں ہماری شادی ہو گئی۔

شادی لکھنؤ میں ہوئی۔ بدایوں میں خوں ریزی نہیں ہوئی تھی لیکن ہر آن خدشہ موجود تھا۔ میری بہن اور نور کی پھوپھی دونوں لکھنؤ میں مقیم تھیں۔ فساد وہاں بھی کوئی نہیں ہوا تھا۔ پُر آشوب زمانہ تھا اس لیے یہی فیصلہ کیا گیا کہ دونوں خاندان لکھنؤ پہنچ جائیں۔ نور کا تقرر آگرہ میں تھا۔ بعد میں نور کے ساتھ آگرہ جانے کا مرحلہ بھی خاصا دشوار تھا۔ کیونکہ بلوائیوں کی زد سے ٹرینیں بھی محفوظ نہیں تھیں۔ آئے دن مشتعل ہجوم کے حملوں کی خبریں آ رہی تھیں۔

شادی کے بعد چند دن کے لیے سب کے ساتھ ہم دونوں الہ آباد گئے۔ الہ آباد میں نور کا آبائی مکان تھا۔ وہاں میرے لیے کچھ اور ہی طریق و آداب مقرر تھے۔ روزانہ میرے لباس کا انتخاب دادی کی مرضی سے ہوتا اور پھر میں لے جاکر ایک مسند پر دادی کے پاس بٹھا دی جاتی۔ اور گھنٹوں ان کے پاس سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہتی کہ یہی دستور تھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب کی ملی جلی آوازیں پس منظر موسیقی کی طرح کانوں میں گونجتی رہتیں۔ ولیمے کے بعد میں بدایوں پہنچا دی گئی۔ نور واپس آگرہ چلے گئے۔ اور وہاں سے اپنے ایک دوست کیپٹن گناپتی کو ساتھ لے کر بدایوں آئے۔ ہندوؤں میں مخلص دوستوں کی اب بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہمارے آگرہ کے سفر میں کیپٹن گناپتی فوجی لباس میں ساتھ تھے۔ اس لیے اب کوئی دہشت نہیں تھی۔

اس سفر کی ابتدا البتہ میرے لیے خاصی مشکل تھی۔ ٹونک والا پھاٹک سے بغیر برقعہ یا چادر اسٹیشن تک تانگے کا سفر نہ جانے کتنا طویل ہو گیا تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ برقعہ اور چادر مسلمان بی بیوں کی پہچان تھی۔ مزید احتیاط کی خاطر نانا کی موٹر استعمال نہیں کی گئی۔ اور نہ گھر سے کوئی رخصت کرنے اسٹیشن تک ساتھ گیا۔

ساڑی کا آنچل لپیٹے ہوئے تھی۔ اور کوچہ و بازار اور در و دیوار سے حجاب آ رہا تھا۔ خوف بھی ہم رکاب تھا۔ شہر کو دیکھنے کی ہمت کہاں تھی۔ پلکیں جھکیں تو اسٹیشن تک جھکی ہی رہیں۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ میں نے بدایوں نہیں دیکھا۔ ایک دو بار پاکستان سے جانا بھی ہوا مگر اب وہ حیران نگاہیاں کہاں رہیں جو اس دیار کا حق تھیں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے

بدایوں شہر آج تک نہیں دیکھا۔

آگرہ میں ہمارا مختصر سا گھر خاصا خوش نما تھا۔ گنجائش ہماری ضرورت سے زیادہ ہی تھی۔ چھوٹا سا لان تھا۔ کیاریوں میں پھول تھے۔

نوکر کا نام قدرت تھا جو بے حد ایمان دار تھا۔ میں دروازہ کُھلا چھوڑ کر پڑوس میں چلی جاتی تو وہ سنگھار میز پر رکھے ہوئے زیور اٹھاتا' سنبھالتا۔ واپس آتی تو مجھے سمجھاتا۔ لیکن وہ ضرورت سے زیادہ وفادار بھی تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی ترتیب میں تبدیلی کی تو نہایت فرماں برداری سے کُرسیاں ادھر سے اُدھر رکھتا رہا۔ لیکن شام کو جب نور دفتر سے آئے تو ڈرائنگ روم اپنی پہلی وضع پر واپس جا چکا تھا۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ آپ کے آنے سے پہلے صاحب نے کُرسیاں اسی طرح رکھوائی تھیں۔

ادھر انتظامِ خانہ داری تھا جس سے قطعی واقفیت بھی نہیں تھی اور دلچسپی لینا بھی چاہتی تھی۔ مگر پتہ ہی نہیں تھا کہ اس سلسلے میں کون سا کارنامہ انجام دیا جائے اور سب سے بڑی مشکل' روز صبح اُٹھ کر یہ سوچنا کہ آج کیا پکایا جائے۔ مجھے تو کھانوں کے نام بھی صحیح وقت پر یاد نہیں آتے۔ پکانے کے لیے قدرت موجود تھا لیکن اسے حکم دینا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جو میں بہت غور و فکر کے بعد کوئی ڈش سوچ ہی لیتی تو وہ فوراً مجھے ٹوک دیتا۔ "نہیں بیگم صاحبہ زردہ صاحب کو بالکل پسند نہیں ہے۔" "جی آلو گوشت صاحب کبھی نہیں کھاتے۔"

پہلا ایک مہینہ بڑے آرام سے گزارا تھا۔ سب کچھ صاحب اور نوکر کے درمیان ہی طے ہو جاتا تھا۔ اگلے مہینے نور نے روپے میرے سامنے رکھے کہ اب تم جانو تمہارا گھر۔ پڑوسن سے مشورے کیے۔ کئی دن بیٹھی گھر کے خرچ کا بجٹ بناتی رہی۔ ایک فہرست کھانوں کے ناموں کی بھی پوچھ پوچھ کر اور سوچ سوچ کر تیار کرلی۔ مگر قدرت ہر بار ویٹو کر دیتا۔ نور کسی قسم کی مدد کرنے کے بجائے اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آخر میں نے ایک نہایت کارگر تدبیر سوچ لی۔ صبح کو قدرت سے پوچھتی کہ آج میں کیا پکوا رہی ہوں اور آج مجھے بازار سے کیا چیز منگوانا ہے اور کتنی۔ پیسے البتہ اپنے ہاتھ سے

دیتی اور جب وہ بازار سے واپس آتا تو حساب بھی لکھتی۔ اس طرح آگرہ میں قیام کے دوران میں بڑی خوش اسلوبی سے گھرداری کے فرائض انجام دیتی رہی۔ نور حیران بھی ہوئے کہ اب میں گھبرائی ہوئی بھی نہیں ہوں اور گھر کا کام کاج بھی سلیقے سے چل رہا ہے۔ وہ تو قدرت ہمارے ساتھ پاکستان آنے پر راضی نہیں ہوا۔ ورنہ شاید مجھے کھانا پکانے یا گھر کو سجانے سنوارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ آج بھی اس کی مرضی دیکھ کر ہی فیصلے ہوتے۔ روٹی پکانا البتہ میں نے ۶۸ء میں امریکہ جا کر سیکھا۔

اپنی پہلی پہلی خانہ داری کے زمانے میں دھچکا تو مجھے یہ بھی لگا تھا کہ دالیں ہی نہیں آٹا بھی ہر مہینے بازار سے خریدا جائے۔ اور بناسپتی گھی کا ڈبا گھر میں آئے اور کھانے میں استعمال بھی ہو۔

ہمارا جو گھر تھا وہ ایک قطعۂ زمین پر بنے ہوئے ایک ہی نقشے کے چار چھوٹے چھوٹے بنگلے تھے۔ جن کو راہداریاں آپس میں ملاتی تھیں۔ پڑوس میں ایک طرف کیپٹن منور قریشی اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ دو بنگلے ابھی خالی تھے۔ منوّر قریشی کا تعلق پنجاب سے تھا۔ ان کے بڑے بھائی اختر قریشی بھی آگرہ میں تھے۔ ان کی کوٹھی ہمارے گھر سے دور تھی۔ وہ انجینئر تھے اور حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے بعد ہماری پہلی خیر مقدمی اور نہایت شاندار دعوت انہوں نے کی تھی۔ جس میں موم بتیوں کی روشنی میں کھانا کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بعد میں راولپنڈی میں اس پورے خاندان سے ہمارے نہایت قریبی مراسم رہے اور آج تک قائم ہیں۔ نور سے عمر میں بڑے تھے۔ ہم دونوں انہیں آکا بھائی کہتے اور وہ ہمیں "تم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس ایک لفظ "تم" کی اپنائیت ہم پر کھلی۔ کہ اب دوستی کے رشتے اتنی شفقت سے "تم" کہنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

قیامِ پاکستان کے زمانے میں جو غارت گری ہوئی اس سے ہم سب ہی آگاہ ہیں۔ بس اگست کے مہینے میں ایک دن ایسا آیا تھا۔ جو سبھی کے لیے عافیت کا دن تھا۔ خوشیوں سے بھرپور پہلا یومِ آزادی۔ اس دن کوئی شخص خوف زدہ نہیں تھا۔ کسی رنجش، کدورت کا

اظہار بھی نہیں تھا۔ اگست میں ہم لوگ آگرہ ہی میں تھے اور اس شام بے دھڑک شہر کی روشنیاں اور رونق دیکھنے تانگے میں گھر سے نکلے۔ اور نہایت اطمینان سے شہر کے گنجان گلی کوچوں میں بھی گھومتے رہے۔ اگرچہ دوسرے ہی دن سے پھر فسادات کی خبریں آنے لگیں اور خوف و ہراس منڈلانے لگا۔

آگرہ میں پنجاب سے سکھوں کے پریشاں حال قافلے آ رہے تھے۔ ان قافلوں کی آمد کے ساتھ شہر میں فسادات شدّت اختیار کر گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ہمارے پڑوس کے دونوں گھروں میں دو سکھ خاندان آباد ہو گئے۔

وفاقی حکومت کے افسران کو پاکستان یا ہندوستان میں خدمات انجام دینے کے فیصلے کا اختیار دیا گیا تھا۔ تجربہ کار وفاقی افسر اس وقت پاکستان کی ضرورت بھی تھے۔

نور پاکستان جانے کے حکم نامے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب ہمارے پڑوسی کیپٹن منوّر قریشی کا آرڈر آگیا اور وہ روانہ ہوئے تو ہم دونوں آرڈ ینینس میس کے ایک کمرے میں رہائش پذیر ہو گئے۔ جہاں مختلف کمروں میں ہم جیسے اور لوگ بھی موجود تھے اور سب کے چہروں پر خوف اور انتظار لکھا ہوا تھا۔

نور کا تقرر جب کراچی ہو گیا تو ہم دونوں رخصت ہونے کے لیے پہلے نور کے والد کے پاس الہ آباد گئے۔ پھر وہاں سے بدایوں اور لکھنؤ۔ لکھنؤ پہنچ کر میری طبیعت خراب ہو گئی۔ مجبوراً" نور مجھے شمسہ باجی کے پاس چھوڑ کر کراچی روانہ ہوئے۔ یہ دسمبر ۴۷ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں مارچ ۴۸ء میں کراچی پہنچی۔

نور کے والد دس سال کے بعد اس وقت پاکستان آئے جب ان کے سب بچّے یہاں آ چکے تھے۔ انہوں نے یا ان کی اولاد نے جائداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ اس سے پہلے میری امّی بھی پاکستان آ چکی تھیں لیکن انہوں نے بھی کسی کلیم کے تحت کوئی زمین یا مکان حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امّی نے تو ہمیشہ اپنے تمام معاملات اللہ پر چھوڑے تھے اور بے شک وہی کارساز ہے۔

میں جب کراچی پہنچی تو یہاں مکانوں کی قلّت کے باعث نور کی پھوپھی کے ساتھ

ہمارا قیام رہا۔ کلفٹن کا پُل عبور کرتے ہی بائیں ہاتھ کو یہ کوٹھی تھی۔ آگے کھُلا میدان تھا جو اس وقت تک سمندر کی دست رس میں تھا۔ کہیں کہیں سفید چُونا سا بکھرا ہوا، کہیں کہیں نشیب میں پانی سمٹا ہوا ہمیشہ نظر آتا تھا۔ یہ مکان دو منزلہ تھا لیکن گنجائش کم تھی۔ پھوپھا کے دوسرے قریبی رشتے دار بھی اسی مکان میں مقیم تھے۔

پھوپھا کرنل عون محمد جعفری اس وقت ڈائریکٹر جنرل میڈیکل سروسز کے عہدے پر فائز تھے۔ اس عہدے سے پنشن کے بعد راولپنڈی میں تقریباً چار سال فوجی اسپتالوں کے نظام سے وابستہ رہے۔

اس مکان میں ہمارے لیے ایک طرف خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ اس خیمے میں میری ملاقات پہلی بار ممتاز شیریں اور صمد شاہین سے ہوئی۔ یہ لوگ صدر میں وکٹوریہ روڈ کے نزدیک ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ کبھی ہم ان کے گھر چلے جاتے کبھی دونوں ہمارے پاس آجاتے۔ یہ دونوں میری ادبی برادری کے پہلے افراد تھے جن سے میری ملاقات ہوئی۔ قیامِ پاکستان سے قبل انہوں نے بنگلور سے رسالہ "نیا دور" جاری کیا تھا۔ ممتاز شیریں سے میری خط و کتابت اسی رسالے کے تعلق سے رہی تھی۔

کراچی میں آج جہاں سرسبز و شاداب لان نظر آتے ہیں وہاں ہر جگہ مٹّی تھی، دُھول تھی جس میں پَیر دھنس جاتے تھے۔ اور میں کسی صحرانشیں کی طرح ایک خیمے میں اقامت رکھتی تھی۔ مگر وہ مستقبل کے تمام روشن اور حسین امکانات سے دمکتا ہوا کراچی شہر تھا۔ یہی کراچی، جسے مہذب دنیا کا ایک شہر آج کون مانے گا۔

کراچی دارالخلافہ تھا۔ وفاقی حکومت کے تمام افسر آس پاس ہی رہتے تھے۔ زاہد حسین جن کے ہاتھوں پاکستان میں بینکاری کی ابتداء ہوئی اور جو اسٹیٹ بینک کے پہلے گورنر تھے۔ ایس ایم یوسف جو اس وقت قائداعظمؒ کے سکریٹری تھے۔ وہاج الدین عباسی جو بعد میں پنجاب کے چیف سکریٹری بھی رہے۔ ہاشم رضا جو اس وقت ڈپٹی کمشنر تھے۔ اختر حسین، ابوطالب نقوی، مسرت حسین زبیری، عثمان علی اور دوسرے افسران جن کے نام اب مجھے یاد نہیں۔ پڑوس کے مکان میں جسٹس ایم بی احمد رہتے تھے۔ نور کے پھوپھا اور

پھوپھی سے ان سب کے دوستانہ مراسم تھے۔ بعد میں راولپنڈی اور اسلام آباد میں ایس
ایم یوسف اور زبیدہ باجی' عبّاسی صاحب اور زیبن باجی اور ہاشم رضا اور سلمٰی آپا سے
ہمارے ذاتی مراسم بھی رہے۔ ان سے اور ان کے پورے خاندان سے آج تک وہی
اپنائیت کے رشتے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں کراچی کے شب و روز میرے لیے کچھ آسان نہیں تھے۔ نور ملٹری
اکاؤنٹس سروس کے لیے منتخب ہو چکے تھے۔ اب ان کا تقرر راولپنڈی میں ہو گیا تھا۔ اور
میں سسرال گھر میں ایک خیمے میں مقیم تھی۔ شمسہ باجی ہندوستان میں رہ گئی تھیں۔ باجی
میرے راولپنڈی جانے کے بعد کراچی پہنچ سکیں۔ طیب انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آگئے
تھے اور تلاشِ روزگار میں سرگرداں تھے۔ جب بھی وقت ملتا مجھ سے ملنے مجھے دیکھنے
میرے خیمے میں آنکلتے۔

میں اس وقت ایک عورت کی زندگی کے سب سے عظیم اور سب سے حسین تجربے
سے گزر رہی تھی۔ اور میں اکیلی تھی۔ بہت اکیلی۔ اور مجھے اپنے پہلے بچے کی آمد تک
بہرحال کراچی میں رہنا تھا۔ بھیل قبیلے کی ایک دلہن کے گیت کا بول ہے

کڑوا لیمبڑاں نوں یک ڈال میٹھوں رے
(کڑوے نیم کی ایک شاخ میٹھی ہے)

میری یہ تنہائی آباد بھی تھی اور ویران بھی۔ ایسی ہی ایک دوپہر میں نے ایک
صدائے آشنا سُنی۔ دُور کہیں کوئل کوک رہی تھی۔ شاید وہ مجھ سے ہی محوِ کلام تھی۔ اس
ہمدمِ دیرینہ سے مخاطب ہو کر میں نے ایک نظم لکھی۔ اس کا عنوان تھا "اجنبی دیس میں"
اس کے چند مصرعے کہیں کہیں سے یاد آگئے۔

شیام رُوپی! تجھے معلوم نہ ہو گا شاید
تو مجھے دور' بہت دور لیے جاتی ہے
یہ صدائے شیریں

کسی بچھڑے ہوئے، بسرے ہوئے ساتھی کی طرح
جیسے ماضی کے نہاں خانے سے
آپ ہی آپ دبے پاؤں چلی آئی ہے
مجھ سے مت پوچھ کہ میرے لیے کیا لائی ہے
شوخ کرنوں نے پتہ میرا نہ پوچھا ہو گا؟
نرم جھونکوں نے سندیسہ کوئی بھیجا ہو گا

یہ طویل نظم ہے۔ مکمّل ہونے کے بعد میں نے اشاعت کے لیے کسی رسالے کو بھیج دی۔ نظم شائع ہوئی اور ایک روزنامے کے صلاح کار نے اس کو اپنی توفیق بھر معنی آفرینی اور مفہوم تراشی سے نوازا۔ سعید بھائی ان دنوں لاہور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ سرخ روشنائی سے نشان زدہ مصرعے اور تبصرہ بحیثیت سرکاری افسر، ان تک بھی پہنچا۔ یہ سب تفصیل مجھے سعید بھائی نے بتائی اور میں پریشان ہو کر رہ گئی۔ نور بھی پاس نہیں تھے اور پریشان کن خیال یہ بھی تھا کہ کیا اب لکھنے والوں کو دوسروں کے خیالوں کی اونچ نیچ دیکھ کر لکھنا ہو گا۔ کیا مجھے شعر کہنے سے پہلے متعصب ذہنیت کا دھیان بھی رکھنا ہو گا۔

پہلی بار معلوم ہوا کہ زندگی کے سفر کی راہ میں صرف زوال آمادہ جاگیرداری نظام ہی نہیں آتا کچھ اور مشکل مقام بھی آتے ہیں۔ میں نے تو اس سانولی شیام روپی سے باتیں کی تھیں جس کی آواز نے میرے عالم تنہائی کو تھوڑی دیر کے لیے آباد کر دیا تھا۔

لڑکیاں سدا سے نا سمجھ ہوتی ہیں۔ سسرال گھروں میں میکے کی یادیں کتنی دیر ساتھ دے سکتی ہیں۔ خوشبو کا ایک جھونکا ادھر آیا اُدھر گیا۔ اور کبھی کبھی وہ ایک لحۂ شاداں و گریزاں بھی دوسروں کے لیے جن سے کوئی واسطہ بھی نہیں ہوتا، ان کے لیے ناپسندیدہ اور ناروا ٹھہرتا ہے۔ مدتوں بعد جب اپنا چوتھا شعری مجموعہ ترتیب دے رہی تھی تو اچانک ایک نجی ادبی محفل میں کسی صاحب نے اس نظم کا تذکرہ کیا۔ میں اس تلخ یاد کو اس طرح فراموش کر چکی تھی کہ نہ اس رسالے کا نام یاد تھا جس میں یہ نظم شائع ہوئی تھی اور نہ یہ

نظم میری کسی بیاض میں موجود تھی۔ تلاشِ بسیار کے بعد پرانے مُڑے تڑے کاغذوں میں دست یاب ہوئی تو اسے تازہ مجموعے میں شریک اشاعت کیا۔

وہ ۱۹۴۸ء تھا اور میں کراچی میں تھی۔ ایک خیمہ میرا گھر تھا اور ایک نظم میں اپنی ماں کے گھر کو یاد کرنا میری تقصیر ٹھہری تھی۔ اس قسم کے حالات تھے اور ابھی دنیا کے طور طریقوں سے ناآشنا میں تھی جو اپنی تنہائی کے شہر میں ایک بار پھر اپنے خوابوں میں جی رہی تھی۔

اور پھر یہ ہوا کہ جس کی آمد کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی' نئی دنیا کا وہ نیا انسان صرف چند دن کے مہمان کی طرح میرے پاس آیا اور واپس چلا گیا۔ اس وقت اپنے خوابِ دل نشیں کے ساتھ میں بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ میں جو بدایوں میں پاس پڑوس کے بچوں پر جان چھڑکتی تھی۔ گھر کی مہترانی کے بچّے گود میں کِھلاتی تھی۔

پھر نور کراچی آئے اور مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی لے گئے۔ اس سانحے کے بعد لمحہ لمحہ مجھے نور ہی جینا سکھا سکتے تھے۔

نور کے مزاج میں دردمندی ہے۔ اور دلداری و دلنوازی کے تمام رنگ کُھلے ہوئے ہیں۔ دو سال کی عمر تھی جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ وہ خالقِ حقیقی سے صرف اُنّیس سال کی مہلتِ حیات لے کر آئی تھیں۔ نور کی پرورش ان کی پھوپھی نے اپنے بچّوں کے ساتھ اور اپنے بچّوں ہی کی طرح پیار اور محبت سے کی۔ لیکن وہ ایک محبت جو ہر بچّے کا حق ہوتی ہے' اس سے محرومی اپنی جگہ تھی۔ نور شاید اس دو سال کے بچّے کو آج بھی بُھولنا نہیں چاہتے جسے محبت اور توجّہ احسان کی طرح ملی تھی۔ یہ ایک ایسا قرض ہے جسے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اپنوں اور غیروں سب کو ادا کرتے رہتے ہیں۔ اجنبی لوگوں کو بھی مقدور بھر موسموں کی شدت سے محفوظ رکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اور دوستوں کے خلوص کا قدرداں نور جیسا کوئی مشکل سے ملے گا۔

نور کے وجود میں بہ یک وقت دو بڑی دل آویز شخصیتیں سانس لیتی ہیں۔ ایک حفاظت اور امان کی علامت وہ چھتنار گھنا سایا جسے باپ کہتے ہیں اور ایک وہ بچّہ جو دو سال

کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ میلے میں کھویا ہوا ایک اکیلا بچّہ۔

زندگی اپنی تمام تلوّن مزاجیوں اور سب جھمیلوں کے باوجود خوبصورت بھی ہے اور مہربان بھی۔ نور نے سائبان بن کر مجھے موسموں کی شدت سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔ انہوں نے میری خوشی کو کتنا عزیز جانا ہے یہ لکھنے کی ضرورت بھی کیا اور حاصل بھی کیا۔ احساس کی امانت کا بار الفاظ کہاں اٹھا سکیں گے۔

مجھے نور سے آج تک ایک ہی شکایت رہی ہے۔ اور یقین ہے کہ آئندہ بھی رہے گی۔ وہ ان کی شدّت کے ساتھ پابندیٔ وقت کی عادت ہے۔

اور وہ جو دو سال کا بچّہ ہے اس سے لڑائی بھی ہوتی رہتی ہے اور صلح بھی۔ اپنا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

ہم نے سونپ دی جس کو کائناتِ جاں اپنی
وہ خدا نہ تھا لیکن، کس قدر اکیلا تھا

شہر عزیزاں

۴۸ء کا راولپنڈی بڑا بے تکلف اور زود آشنا شہر تھا۔ اکتوبر یا نومبر کا مہینہ تھا جب ہم نے پہلی بار اس شہر سے شناسائی کا اعتبار حاصل کیا۔

گوئن ٹامس روڈ پر (شاید اب اس سڑک کا نام تبدیل ہو گیا ہے) لکڑی کے بنے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان میں سے ایک گھروندے کا نصف حصہ ہمیں ملا ہوا تھا۔ کیونکہ اب راولپنڈی میں بھی مکین' مکانوں کی گنتی اور گنجائش سے زیادہ تھے۔

ہمارا گھر کل تین کمروں پر مشتمل تھا۔ جن میں ایک نسبتاً" بڑے کمرے کو ڈرائنگ روم کا منصب دیا گیا۔ دوسرا کمرہ ہماری خواب گاہ تھا۔ اور تیسرے اور سب سے چھوٹے کمرے کے ایک کونے میں سوٹ کیس تھے۔ آٹے دال کے ڈبے اور لفافے تھے۔ جن پر خوبصورت گل رنگ پلنگ پوش بچھا دیا گیا۔ اسی کمرے میں سامنے کی طرف کھانے کی میز تھی۔ ہمارا کھانا باہر ایک کوٹھری میں پکتا تھا کیونکہ باورچی خانہ پڑوسی کے حصے میں تھا۔ نوکر کا انتظام نور نے پہلے ہی کر لیا تھا۔

گھر میں کرائے کا فرنیچر تھا۔ چند کرسیاں' پلنگ اور میزیں۔ یہ سہولت بھی اس لیے میسر آگئی تھی کہ نور کا تعلق ملٹری اکاؤنٹس سروس سے تھا۔ دروازوں کے لیے پردے میں نے اپنے ہاتھ سے تیار کیے۔ اور ہمارا گھر آراستہ پیراستہ ہو گیا۔

میرے اپنے وطن میں یہ میرا اپنا پہلا گھر تھا۔ جس کا سیمنٹ کا فرش بھی میرے تلووں کے لیے کسی ایرانی غالیچے سے کم نہیں تھا۔ ہمارے اس گھر میں واحد سامانِ آرائش اپنی ہی ایک تصویر تھی۔ جو منان بھائی کے تصویر کشی کے فن اور شوق کا نتیجہ تھی اور ڈرائنگ روم میں ایک میز پر سجائی گئی تھی۔ نور کی نئی نئی ملازمت تھی۔ مشاہرہ

کم، لیکن ہماری ضروریات اس سے بھی کم تھیں۔

یہ سادہ سادہ شہر اور بے غازہ و گلگونہ یہ گھر دل کشا اور دل رس رنگوں میں نہایا ہوا تھا۔ ایک سُوکھی ہوئی شاخ بھی گلدان میں لگا دیتی تو سارا گھر شگوفوں کی خوشبو سے مہکنے لگتا۔ تمام دلربا اُجالے ہماری دست رس میں تھے۔ تمام زمانوں کی نزہتیں ہم رکاب تھیں۔

مقابل کے ایسے ہی لکڑی کے ایک گھر میں اقبال بمن اور منّان اللہ بیگ رہتے تھے۔ منّان بھائی فوج میں تھے۔ ان کے حصے میں پورا مکان آیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ ہم نے بڑے یادگار دن گزارے ہیں۔ قریب تو وہ کراچی کے زمینی فاصلوں کے باوجود آج بھی ہیں مگر وہ تو روز کا ساتھ تھا۔ پڑوس تھا۔ دونوں ہی خلوص اور محبت کی لازوال دولت کے مالک ہیں۔

منّان بھائی شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے دائرۂ اخلاص میں شاعروں ادیبوں کے نام بھی ہیں۔ مجاز ان کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ جگر مراد آبادی پاکستان آتے تو راولپنڈی میں انھیں کے گھر قیام کرتے۔ اگر کبھی منّان بھائی نے اپنی یادیں قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تو بہت سے دلچسپ مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں سے غیر متوقع بھی ملاقات ہو جائے گی۔ دلچسپ انسان ہیں۔ جینا جانتے ہیں۔ ریس کورس سے مشاعروں کی محفل تک، جس زمانے میں جو شوق بھی ہو اُسے تَن مَن دَھن سے پورا کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔

جب ہم نے انھیں پہلی بار دیکھا ہے اس وقت فوٹوگرافی اور باغبانی سے شغف تھا۔ بلکہ ان دنوں منّان بھائی اچھے خاصے فن کار تھے۔ بہترین فوٹوگرافر ہونے کے علاوہ سبزہ و گُل کے رازداں بھی تھے۔ باغبانی سے متعلق کتابیں پڑھتے اور گھر کے آگے جو چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا تھا اس کو تصویرِ بہاراں بنا رکھا تھا۔ اس زمانے میں ہم سب زندگی سے ہم کلام تھے۔

جن گھروں میں ہم تھے وہاں سامنے سڑک پر کوئی ٹرک گزرتا تو ہمارے درودیوار

لرزاں ہو جاتے۔ لیکن ہمارے، ہم سب کے قدموں میں استقامت تھی۔ وہ ۴۸ء تھا۔ اپنے آزاد وطن کی مٹی قدموں کو تھامے ہوئے تھی۔ وہ تمام خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیروں کا زمانہ تھا۔ خوشی کی ایک خراماں لہر تھی جو خوشبو کی طرح سب کے پاس پہنچ گئی تھی۔ جو ہر دل کو چھو رہی تھی۔ ہم میں سے ہر ایک انفرادی طور پر بھی کامرانی کے احساس سے سرشار تھا اور اجتماعی نوع سے بھی ایک افتخار ہم سب کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ تھے۔ دل محبت کرنا جانتے تھے اور آنکھ محبت کو پہچانتی تھی۔ ان دنوں ہم سب واقعی صاحب ایمان تھے۔ اعتماد اور یقین سے بھرپور وہ بڑے قیمتی دن تھے۔

ہمارے بزرگوں نے اور ہماری نسل نے بہت کچھ سہا تھا۔ بہت کچھ کھویا بھی تھا۔ مگر اب تو دکھ پیچھے رہ گئے تھے۔ اندھیروں کا جنگل عبور کیا جا چکا تھا۔ آگے طلوعِ سحر کا منظر تھا۔ صوتِ اذاں کی طرح پاکیزہ اور منور۔

جس شہر میں ہم تھے وہ شہر حسین تھا۔ دلنواز تھا۔ یہ حسن قدرت کا عطا کردہ تھا اس لیے بے تصنّع تھا اور دلنوازی کی خوبی تھی جو رَستے بَستے چھوٹے چھوٹے شہروں ہی کا حصّہ ہے۔ راولپنڈی رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ابھی اتنا نہیں پھیلا تھا کہ ہمسائے بھی اجنبی ہو جائیں۔ اور لوگوں کے پاس ایک نگاہِ آشنا عنایت کرنے کی بھی فرصت نہ رہے۔

اس آسودہ نگاہ اور آسودگی پناہ دیار میں جو ہمارا گھر تھا وہ لکڑی کا گھروندا بھی اپنی وسعتوں میں محل دو محلوں سے کم نہیں تھا۔ اس گھر میں مجھ سے ملنے ن۔ م راشد آئے۔ منٹو آئے، عبدالحمید عدم سے ملاقات ہوئی۔ اور اس گھر ہم نے اپنی شادی کی دوسری سالگرہ منائی جس میں حفیظ جالندھری نے شرکت کی اور رات گئے تک اپنا کلام سناتے رہے۔

سعادت حَسن منٹو سے پہلی بار ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ آپا کے گھر وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے جن کا نام اب یاد نہیں۔ لاہور ہی میں احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے بھی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ندیم بھائی کو اپنی آمد کی اِطّلاع دی تھی۔ انھیں کے ساتھ یہ دونوں بہنیں آئی تھیں۔ ہاجرہ

اور خدیجہ دونوں برقعہ پہنے ہوئے تھیں۔ مجھے بھی برقعے کو خیرباد کہے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ان سب عزیزوں کی ملاقات نے میرے اس دکھ کی چُبھن کو تھوڑی دیر کے لیے کم اثر کردیا تھا۔ جو میں کراچی سے اپنے دل میں بسا کرلائی تھی۔ ایک عورت کے پہلے پہلے خواب تخلیق کے ریزہ ریزہ ہو جانے کا دکھ۔ وہ میرا پہلا بچّہ تھا اور میں اسے گود میں بھی نہیں لے سکی تھی۔

راولپنڈی میں ادیبوں اور غیرادیبوں میں بھی ہمیں بہت پر خلوص دوست ملے۔ چھوٹا سا شہر تھا' سب لوگ آس پاس ہی رہتے تھے۔ وہاں لندن بُک ڈِپو ہمارے لیے کلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہمارے جاننے والوں میں ایک دو کے علاوہ کسی کے پاس موٹر نہیں تھی۔ ہر شام چہل قدمی کے لیے سب ہی گھر سے باہر نکلتے اور کوئی نہ کوئی رہ گزر ہمیں لندن کتاب گھر پہنچا دیتی۔ جہاں کتابیں تو کم ہی خریدی جاتیں' جن میں زیادہ تر اُون کی بُنائی کے نمونوں یا کھانا پکانے کی ترکیبوں کے رسالے ہوتے۔ زیادہ وقت آپس میں گفتگو میں کٹتا۔ ایک دو خوشگوار گھنٹے گزار کر واپس گھر آجاتے۔ ان دِنوں ہم سب 'سگھڑ بیویاں بننے کی تربیّت اپنی اپنی زیرِ نگرانی حاصل کررہی تھیں۔

ہمارا یہ معمول موسم کی شدت بھی مشکل ہی سے تبدیل کر سکتی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی یا مری کی برفیلی ہَوا کا ایک آدھ آوارہ خرام جھونکا ہمارے اوپر کوئی اثر نہیں رکھتا تھا۔

پنڈی کے دُھلے دُھلے ,نکھرے ہوئے شہر میں عظیم صاحب ہم دونوں کے بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شفیق بھی' ہر طرح مددگار بھی۔ کیپٹن سردار محمد عظیم ویسے بھی اس شہر میں قطب کا درجہ رکھتے تھے۔ جہلم کے رہنے والے تھے۔ سروس کے سلسلے میں کئی سال الہ آباد رہے اور پھوپھا کرنل عون محمد جعفری کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ بڑی دلچسپ گفتگو کرتے۔ ہم لوگ انہیں چچا کہتے تھے۔ چچا اور چچی دونوں ہی بے حد نیک دل تھے۔ ان کی اولاد میں میجر جنرل ریاض عظیم اور لیفٹنٹ جنرل اعجاز عظیم' نور کے تقریباً" ہم عمر بھی ہیں اور عزیز دوست بھی۔ عفّت ریاض عظیم اور شاہدہ اعجاز عظیم سے بھی

خلوص اور محبت کے رشتے آج تک قائم ہیں جب اسلام آباد جانا ہوتا ہے تو ان لوگوں سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔

جن دنوں لیفٹننٹ جنرل اعجاز عظیم امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے تو جب ہم صبیحہ کے پاس واشنگٹن جاتے شاہدہ کا اصرار ہوتا کہ ہمارا قیام ان کے ساتھ ہو۔ یہ تو ہمارے لیے ممکن نہیں تھا مگر ان کا محبت بھرا اصرار آج بھی یاد ہے۔

راولپنڈی کے شب و روز کو یاد کر رہی ہوں تو مجھے وہ ایک چھوٹا سا ادبی حلقہ بھی یاد آ گیا جس کا نام پی ای این تھا "شاعر' مضمون نگار' ناول نگار"۔ پی ای این ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جس کی مطبوعات بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ راولپنڈی کے اس ادبی حلقے کا اس تنظیم سے کوئی تعلق تھا یا نہیں۔ اس کے سکریٹری آغا تھے۔ پورا نام مجھے یاد نہیں۔ اسے تزئین فریدی نے شروع کیا تھا۔ تزئین فریدی نے اپنے کالج کے زمانے سے ہی نہایت فعال زندگی بسر کی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دنوں سے آج تک ملک و معاشرے کی خدمت میں مصروف رہی ہیں۔ کچھ عرصے سندھ کی صوبائی حکومت میں وزارت کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ ہمارے خاندان سے ان کے مراسم لکھنؤ کے زمانے سے رہے ہیں۔

اس حلقے میں تزئین فریدی کے علاوہ بریگیڈیر گلزار احمد جو اس وقت کرنل تھے' عزیز احمد جو اس زمانے میں وفاقی حکومت میں وزارتِ اطلاعات میں ڈپٹی سیکریٹری تھے' شیخ عمر فاروق' جسٹس انوار الحق' نجمہ انوار الحق' چند اور دوست جن کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں اور ہم دونوں شامل تھے۔ ان دنوں جسٹس انوار الحق ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی سکریٹری تھے۔ نجمہ انوار الحق افسانے لکھتی تھیں۔

یہ محفل ہر ماہ کسی ایک رکن کے گھر منعقد ہوتی تھی۔ اور وہیں صدرِ محفل منتخب کر لیا جاتا تھا۔ کچھ پڑھا جاتا کچھ سنا جاتا کچھ باتیں ہوتیں اور چائے کے ساتھ محفل اختتام پذیر ہو جاتی۔

اسی حلقے کی ایک مجلس میں' میں نے پہلی بار جگر مراد آبادی کو دیکھا اور سنا۔ وہ کسی

مشاعرے میں شرکت کے لیے راولپنڈی آئے ہوئے تھے۔ شوکت تھانوی سے بہت سے لطیفے ان کی صورت شکل کے حوالے سے سُنے تھے۔ مگر اس وقت جب وہ اپنے اشعار سنا رہے تھے ایک اَن دیکھی روشنی تھی جو اس شاعر کے چہرے یا آواز یا الفاظ یا ان سب کے اجتماعی وجود سے پھوٹ رہی تھی جس نے پوری محفل کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ میں نے جگر مراد آبادی کو ایک ہی بار دیکھا اور ایک ہی بار سنا۔ شاید اسی سبب وہ چھوٹی سی ادبی انجمن یاد رہی۔ میں بہت کم عرصے اس حلقے کی رکن رہ سکی۔ ہماری اپنی مجبوریاں تھیں۔

انہیں دنوں نور کے پھوپھا کرنل عون محمد جعفری کا تقرر ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل میڈیکل سروسز کے عہدے پر راولپنڈی میں ہو گیا۔ اور وہ معہ خاندان کراچی سے وہاں منتقل ہو گئے۔ مال روڈ پر ایک بہت وسیع کوٹھی انہیں رہائش کے لیے ملی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم دونوں ان کے ساتھ رہیں۔ پھوپھا فرشتہ صفت انسان تھے۔ نور سے اپنی اولاد جیسی محبت کرتے تھے۔ پھوپھا اور پھوپھی دونوں ہی سراپا محبت تھے۔ اپنوں' غیروں' چھوٹوں' بڑوں سب کے لیے۔ میں نے ان دونوں کو کبھی کسی سے ناراض ہوتے یا کسی کا شکوہ کرتے نہیں دیکھا۔ ان بزرگوں کی خواہش ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ ہم اپنا خوشیوں اور خوشبوؤں میں بسا ہوا گھر چھوڑ کر ان لوگوں کے پاس مال روڈ کی کوٹھی میں آ گئے۔

مگر ہوا یہ کہ میں جو لفظ کی انگلی تھام کر زندگی سے ملاقات کرنے نکلی تھی سسرال اور سرکار کے ماحول میں اپنے آپ سے ہی بچھڑ گئی۔ ایک بار پھر قلم سے رہ نمائی چاہی مگر میرا قلم تو انبوہ میں کھو گیا تھا۔ اس حد تک کہ میں اب اپنی ماں کو بھی خط نہیں لکھتی تھی۔ یہ فریضہ نور میری طرف سے بڑی پابندی سے ادا کرتے رہے۔ ابھی تک رسائل کے مدیر تازہ کلام کے لیے مجھے خط لکھتے۔ تمام جرائد میرے نام آتے۔ رفتہ رفتہ مدیران کرام کو میری بے بسی کا احساس ہو تا گیا۔ رسالے آنا بند ہو گئے۔ صرف "نقوش" وہ رسالہ تھا جس کا ہر شمارہ اس تمام عرصے میں میرے نام آتا رہا۔ صرف اس کے مدیر محمد طفیل تھے جو نئے شمارے کی اشاعت سے پہلے مجھے خط لکھتے۔ نظم یا غزل کی فرمائش کرتے۔ جبکہ میرے

احساس محرومی نے رسالے اور کتابیں پڑھنے سے بھی مجھے معذور کر دیا تھا۔ طفیل بھائی کا خط آتا میں کچھ اور اداس ہو جاتی۔ ان کے خط کا جواب بھی نور ہی لکھتے تھے۔ یہ میری شکست اور دردناک احساسِ شکست کے طویل ترین بارہ تیرہ سال تھے۔ اس دَوران میں کبھی کبھار کوئی نظم یا غزل لکھی بھی تو جی کو تسکین نہیں ملتی تھی۔

شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ میں نے ان محتاج برسوں کے درمیان طویل وقفوں کے ساتھ لیکن بار بار نیند کے عالم میں ایک ہی خواب دیکھا۔ جو مجھے کئی دن پریشان اور بے چین رکھتا تھا۔ اس خواب کے اندر مقام اور ماحول بدل جاتا تھا لیکن کیفیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی۔ کچھ اس طرح جیسے میرے پاس کوئی نہایت قیمتی نایاب شے ہے یا کوئی گراں بہا زیور۔ اور کوئی ہے جو اسے چُرانے یا مجھ سے چھیننے کے لیے آرہا ہے۔ میں اس نقصان سے محفوظ رہنے کے ہزار جتن کر رہی ہوں اور کچھ بھی بَن نہیں پڑتا۔ پھر میری آنکھ کُھل جاتی۔ ۶۵ء میں مجھے اس خواب سے نجات ملی۔

۶۵ء کی جنگ نے جہاں ہماری پوری قوم کو بیدار کر دیا تھا وہیں اس شاعرہ کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سرزمینِ وطن نے اہلِ وطن کو آواز دی اور سب نے اپنے مقدور بھر اس آواز پر لبیک کہا۔ جب نور کے پھوپھی زاد بھائی میجر ضیا الدین عبّاسی نے خاکِ وطن کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تو میں نے "مرے شہید" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس ذاتی دُکھ اور اس اجتماعی جذبۂ جاں نثاری نے مجھے دوبارہ قلم پکڑنا سکھا دیا تھا۔ اور پھر میں مسلسل لکھتی رہی۔

ابھی تو میں راولپنڈی میں اپنے اوّلین قیام کے دنوں کو یاد کر رہی ہوں۔ ۶۵ء ابھی دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں اپنے گھر میں تھی اور بَن باس بھی کاٹ رہی تھی۔ مگر میں اسے بَن باس کیوں کہہ رہی ہوں وہی تو زندگی سے تعارف کا وقت بھی تھا۔ میرے اور اس شاعرہ کے درمیان جو دیوار کھینچ گئی تھی وہی دیوار برگِ گُل نظر آنے لگی تھی۔ میرے لیے یہ وہ زمانہ تھا جب ایک عورت اپنی زندگی کی معراج حاصل کر لیتی ہے۔ میری صبیحہ بے کراں خوشیوں کا بھرپور اعتماد لے کر میری دنیا میں آگئی تھی۔

صبیحہ کی پیدائش کے بعد ہمیں علیحدہ گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ہمارا یہ گھر مری روڈ پر تھا۔ اب ہم اپنے دوستوں کے انتخاب کے سلسلے میں آزاد تھے۔ اور یہ بڑی نعمت تھی۔ میری شعر گوئی ختم ہو چکی تھی مگر یہ خاک تو اسی دیار کی تھی۔ ہمارے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بہت بڑے لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔ یوسف ظفر' مختار صدیقی' نسیم الظفر' ڈاکٹر آفتاب احمد خاں' باقی صدیقی' عبدالعزیز فطرت اور ایک دو اور نام بھول رہی ہوں۔ اس محفل میں شعر و شاعری کے بجائے قہوے اور باتوں کا دور چلتا۔ تقریباً" ہر شام ہی یہ محفل آراستہ ہوتی۔

ہمارے ان دوستوں میں سے زیادہ کا تعلق ریڈیو پاکستان سے تھا۔ محمود نظامی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے ان سے بھی خلوص کے رشتے تھے۔ ان دنوں نور کبھی کبھی ریڈیو کے لیے فیچر بھی لکھ رہے تھے۔ ایک فیچر قلی قطب شاہ پر لکھا تھا۔ جس کے لیے خاصا مطالعہ کیا گیا۔ کبھی کبھی میں بھی ریڈیو کے لیے کوئی مضمون لکھتی۔ آزاد کشمیر ریڈیو جو مری میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ایک مشاعرے میں میری ملاقات تاثیر سے ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں ہماری ملاقات جنرل شفیق الرّحمٰن' (جو اس وقت میجر تھے) ابن سعید (عسکری)' ابن الحسن اور سید ضمیر جعفری سے ہوئی۔ ضمیر جعفری اس زمانے میں کیپٹن تھے اور مال روڈ والے مکان میں ہمارے پڑوسی تھے۔ شمیم بھائی بھی کیپٹن تھے۔ کیپٹن جعفری کی ہم نامی کے طفیل کئی لطیفوں نے جنم لیا۔ کبھی ملاقاتی بدل جاتے۔ کبھی ضمیر بھائی کے گاؤں سے اصلی گھی کے کنستر آتے اور ہمارے گھر پہنچتے۔ ڈاکیہ صرف جعفری کا لفظ پڑھتا اور ہماری ڈاک ان کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی ہم تک راہ پاتی۔ ان کی اصل خوبیوں سے تو ہم بعد میں واقف ہوئے مگر یہ صورت حال بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھی۔

راولپنڈی میں میری عزیز دوست عطیہ بھی تھیں۔ عطیہ مسز ہاشم رضا کی بہن ہیں۔ ان کے شوہر معین حسن کنٹونمنٹ بورڈ کے ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت دلچسپ وقت ہم نے گزارا ہے۔ عطیہ کے بھائی مہدی مسعود سے بھی روابط رہے۔ مہدی مسعود مختلف ممالک میں حکومتِ پاکستان کے سفیر رہے ہیں۔ یہ پورا خاندان اپنے علمی

اور ادبی ذوق کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

نور کی نئی سروس (ملٹری اکاؤنٹس) میں ہماری ملاقات سب سے پہلے جری احمد سیّد اور آپا تمن سے ہوئی۔ نور سیّد صاحب کے ماتحت تھے اور ابھی آزمائشی مدت ملازمت کی ابتدا تھی۔ ہم ان کے گھر پہنچے اور معلوم ہوا جیسے اپنے قریبی رشتہ داروں کے پاس آگئے ہیں۔ پہلی ملاقات میں پہلی بات سیّد صاحب نے یہی کہی کہ گھر تو موجود ہے۔ تم لوگ علیحدہ مکان لے کر کیوں رہو۔ ہمارے پاس آجاؤ۔

جری احمد سیّد عالم فاضل تھے۔ فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی۔ اور ان کے مزاج کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے چھوٹوں کے لیے ستون اور سائبان کی حیثیت رکھتے تھے۔ ماتحتوں سے ہمیشہ دوستوں جیسا سلوک کیا۔ وہ بہت بڑے انسان تھے۔ نور ہمیشہ کہتے ہیں کہ اپنے ماتحتوں سے دوستانہ اور برابری کا برتاؤ میں نے سیّد صاحب سے سیکھا۔ اور اپنی پوری مدّتِ ملازمت میں ان کی مثال سامنے رکھ کر عمل کیا ہے۔ اس پورے خاندان سے ہمارے بڑی اپنائیت کے رشتے ہیں۔ آپا تمن بھی خلوص اور محبت کا پیکر ہیں۔ ان کی بیٹی وشکا پرائمری اسکول سے ایم ایس سی تک میری صبیحہ کی ہم جماعت رہی۔ ہماری محبتیں ہماری نئی نسل تک پہنچ گئی ہیں۔

نور کی سروس کا زیادہ حصہ راولپنڈی اور اسلام آباد میں بسر ہوا۔ اور وہ سب نہایت خوبصورت دن تھے۔ اب بھی جب وہاں جاتی ہوں تو لگتا ہے کہ اپنے گھر آگئی ہوں۔ اب ایک بڑی وجہ کشش وہاں اختر جمال اور احسن علی خاں کی موجودگی بھی ہے۔

۶۶ء میں ہم سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں تھے۔ وہیں سے اسلام آباد منتقل ہوئے۔ کیونکہ اب وہاں سرکاری افسران کے لیے مکان تعمیر ہو گئے تھے۔ نیا نیا شہر بس رہا تھا۔ سڑکیں ابھی بن رہی تھیں۔ روشنی کم تھی۔ رات کو پنڈی جانا ہوتا تو سنسان اندھیری سڑک پر اکیلے جاتے خوف آتا۔ ایک دو جاننے والے کارواں بنا کر نکلتے۔ عجیب غیر آباد سا آباد شہر تھا۔ انھیں دنوں صادقین ہمارے گھر مہمان رہے۔ کہنے لگے۔ "ہاں یہ جگہ خوبصورت ہے لیکن یہ شہر نہیں ہے' شہروں میں تو کُوچے محلّے ہوتے ہیں۔ جہاں اونچے

مکان بھی ہوتے ہیں اور پاس ہی کچے گھروندے بھی۔ یہاں تو عہدوں کے لحاظ سے مکانوں کی قطاریں ہیں۔ ہر قطار کے اندر جتنے لوگ ہیں وہ سب ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کا ناشتہ کر کے گھر سے نکلتے ہیں اور ایک ہی وقت واپس گھروں کو آتے ہیں۔ اور ان کے لباس بھی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ یہ تو نہایت اعلیٰ درجے کا جیل خانہ ہے۔ جس میں درجہ بندی کا خاص اہتمام ہے۔ افسروں کی طرح مکانوں کے بھی گریڈ ہیں۔"

غالباً" ۶۷ء تھا جب اسی اسلام آباد میں اختر جمال اور احسن علی خاں سے ہماری ملاقات نیشنل سینٹر کی ایک ادبی مجلس میں ہوئی اور کچھ یوں لگا جیسے ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔ جس کی وجہ یہی تھی کہ احسن علی خاں کی شاعری اور اختر جمال کے افسانے پہلے ہی ہمارا تعارف کرواچکے تھے۔ احسن علی خاں بھی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ لیکن اختر جمال کی شخصیت خصوصاً" متاثر کرتی ہے۔ ان کا قیام بھی اسی سرکاری درباری شہر میں تھا مگر یہ ادب آداب اور تکلّفات میں ڈوبا ہوا ماحول ان کے مزاج کی سادگی اور ان کی صاف دلی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا۔

منکسر المزاج اور خود دار اختر دوستوں کے لیے سراپا خلوص ہیں۔ ان کے مزاج کی خوبیوں کی معترف تو پہلے ہی تھی، میں نے انہیں زیادہ نزدیک سے اس زمانے میں دیکھا جب وہ بے پناہ غموں کی یلغار میں تھیں۔ جب ان کے بیٹے طارق کو ایک بے رحم حاکم کے جلالِ حکومت نے حوالات میں نظربند کر دیا تھا۔ تقریر کسی نے کی تھی جو سنسر کے بعد اخباروں میں شائع ہوئی اور اس پوری تقریر کو کتابچے کی شکل میں شائع کسی نے کیا۔ اسے تقسیم کسی اور نے کیا لیکن امتحان اختر کے صبر و قرار کا ہوا۔ کیونکہ ایک شام طارق نے ایک دوست کی فرمائش پر اپنی موٹر سائیکل اسے مستعار دی تھی۔ اور یہی موٹر سائیکل کتابچے کو تقسیم کرتے ہوئے استعمال کی گئی تھی۔ طارق کی خطا اتنی ہی تھی کہ انہوں نے بغیر کسی استفسار اپنے دوست کو اپنی گاڑی چند گھنٹوں کے لیے دے دی تھی۔ وہ کتابچہ دراصل بیگم لیاقت علی خاں کی تقریر پر مشتمل تھا۔ اور اس وقت ضیاء الحق ملک پر حکمراں تھے۔ مجھے یاد ہے اسلام آباد میں پاکستانی ادیبوں کے جلسے کے موقع پر جب ایک شام ہم

سب ایوانِ صدر میں مدعو تھے ہم میں سے چند خواتین نے یہ مقدمہ ان کے سامنے پیش کرنا چاہا۔ جس پر انہوں نے جواب دیا تھا "یہ رموزِ مملکت ہیں آپ انہیں نہیں سمجھ سکتیں۔"

یہ وہی سیاہ دن تھے جب اختر اپنی بیٹی تزئین کی اندوہ ناک اور بے وقت موت کے سانحے سے نڈھال تھیں۔ احسن علی خاں غصے کا اظہار بھی کرتے لیکن اختر صبر و استقلال کا پیکر تھیں۔ انہوں نے صرف حرفِ دعا کا دامن تھام لیا تھا۔ ان کی التجائیں بھی اسی سے تھیں اور یقین بھی اسی پر تھا جو رحیم و کریم بھی ہے اور منصف بھی۔ اور جو التجاؤں کو سنتا بھی ہے۔ یہ ۸۲۔ ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ ایک سال سے زیادہ کا عرصہ طارق نے قید و بند میں بسر کیا۔ آج کل طارق اپنی بیوی کے ساتھ جو ہاجرہ مسرور کی بیٹی ہے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ بے شک سننے والا دعاؤں کو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔

اختر مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہیں۔ اور ان کی شخصیت بھی پُرکشش ہے۔ تصنع نہ اختر کی گفتگو میں ہے نہ لباس میں نہ رہن سہن میں۔ لگتا ہے وہ کچھ کچھ صوفی بھی ہیں۔ ترکِ دنیا بے شک ان کا مسلک نہیں ہے اور نہ انہوں نے دنیا کے دھندوں سے منہ موڑا ہے۔ لیکن آج کے دور میں اس رویے پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے آج تک سونے کا ایک چھلا بھی نہیں پہنا۔ کیونکہ بچپن سے سنتی آئی تھیں کہ بی بی فاطمہؓ نے کبھی سونا نہیں پہنا تھا۔ اختر تو اپنے لباس کے لیے رنگوں کے انتخاب میں بھی محتاط نظر آتی ہیں۔ ہمیشہ مدھم، سنجیدہ رنگ کی ساڑی میں ملبوس نظر آتیں جس پر ہم جیسوں کو ہمیشہ برملا اعتراض رہتا۔

ایک بار ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اسلام آباد آئی ہوئی تھیں۔ اختر جمال نے انہیں کھانے پر مدعو کیا۔ مجھے اور نثار کو بھی دعوت دی۔ ہم چاروں نے یہ دعوت مشروط قبول کی۔ شرط یہ تھی کہ اس شام وہ سرخ یا کسی اور شوخ رنگ کی ساڑی پہن کر ہمارا استقبال کریں۔ ہم نے تو کامدار بنارسی ساڑی کی فرمائش کی تھی۔ اس شام اختر کے گھر رنگوں کی بہار ہی بہار تھی۔ دوستوں کے سلسلے میں میں بہت خوش نصیب رہی ہوں۔

موج ہوا کے ساتھ ساتھ

۵۶ء میں نور کا تقرر وزارت دفاع میں نائب مالی مشیر (A.F.A) کی حیثیت سے ہوا تو ہم کراچی آگئے۔ ہمارا گھر جس علاقے میں تھا اسے نیپیئر بیرکس کہا جاتا تھا۔ وہاں جتنے مکان تھے وہ سب ایک ہی نقشے کے مطابق بنے ہوئے تھے۔ سرخ ٹائل کی ڈھلوان چھتیں' باہر کے برآمدے میں لکڑی کی جالی اور سامنے چھوٹا سا گوشۂ چمن۔

یہ جگہ جناح اسپتال کے ساتھ تھی۔ جو اب تعمیرِ جدید کے بعد اسپتال کی عمارت کا ایک حصہ ہے۔ اس وقت تک کراچی شادابی کو ترستا اور رُکتے جھجکتے قبول کرتا ہوا یا شاید اپنے آپ سے متعارف ہوتا ہوا سا ایک شہر تھا۔ ان دنوں کوئی ہرا بھرا درخت یا کہیں سرسبز لان نظر آجاتا تو ٹھٹک کر دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ میں تھی کہ دل میں پھولوں کی چاہت تو تھی لیکن ان کی دیکھ بھال کا نہ سلیقہ تھا نہ تجربہ اور وہ ایسا صحرا بھی نہیں تھا کہ آئینِ باغبانیٔ صحرا یاد آتا۔ آنگن میں جو پھول میری شوق بھری نگاہوں کا پاس کرتے ہوئے آنکھ کھولتا وہی میرے لیے دامانِ باغباں اور کفِ گُل فروش کا منظر پیش کر دیتا۔ ان دنوں طریقِ حیات میں بھی ہم میں سے زیادہ تر کی دِلی کیفیات کچھ ایسی ہی تھیں۔

کراچی اب نئے بسنے والوں کے لیے بھی نیا شہر نہیں تھا۔ اپنائیت کی خوشبو میں رچا بسا ہوا تھا۔ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے ویسے بھی کراچی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اگرچہ حکومتیں روز روز تبدیل ہو رہی تھیں' لیکن عام لوگ مطمئن تھے اور پُرامید۔ صنعتیں ترقی کر رہی تھیں' حرفتیں وجود میں آرہی تھیں۔ روزگار کا حصول دشوار نہیں رہا تھا۔ اَن تھک محنتوں کے مناسب صلے مل رہے تھے' اور توکّل اور قناعت نے ابھی دم نہیں توڑا تھا۔ کسی دل میں مَیل

نہیں تھا اس لیے چہرے منور تھے۔

نور کے زیادہ تر رشتہ دار پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتے تھے۔ یہ پہلی کالونی تھی جو رہائشی سہولت کے لیے قیامِ پاکستان کے بعد وجود میں آئی۔ چھوٹے چھوٹے گھر تھے مگر آسودگی کے مظہر۔

رشتہ داروں کے علاوہ کراچی میں ہمارے دوستوں کا بھی وسیع حلقہ تھا جس میں نور کے کالج' یونیورسٹی اور دفتر کے ساتھی بھی تھے اور دیگر شخصیات بھی۔ محمود سلیمان' میجر ابن الحسن' جمیل الدین عالی' طفیل جمالی' ابنِ سعید (حسن عسکری) ڈاکٹر آفتاب' گلزار' بانو' مسز سلیمہ احمد' محمود احمد (ملٹن) اور دوسرے کئی عزیز دوست۔

محمود سلیمان' نور کے الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھی ہیں۔ ان دنوں کلکٹر کسٹم کے عہدے پر فائز تھے اور وکٹوریہ روڈ پر کیفے گرینڈ کے اوپر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ بلقیس بہن ایڈووکیٹ ہیں۔ وہ قانونی موشگافیوں کے ساتھ ساتھ گھر کی سجاوٹ اور صفائی میں ہمہ وقت مصروف رہتیں۔ محمود سلیمان مصوری کا شوق اپنائے ہوئے تھے اور بڑی جاں فشانی سے قدرتی مناظر کی تصویر سازی میں منہمک رہتے۔ صادقین کا نام ہم نے سب سے پہلے انہیں سے سنا۔ صادقین گڈانی میں مقیم تھے اور محمود سلیمان کی فرمائش پر کسٹم کلب کے لیے بغیر معاوضہ کینوس پینٹ کر رہے تھے۔ صرف شراب اور رنگ اور برش انہیں مہیا کر دیے جاتے۔ ہمارا ابھی ان سے تعارف نہیں تھا۔ صادقین کے فن اور شخصیت کی خوبیوں کے اسیر تو ہم بعد میں ہوئے۔

محمود سلیمان راولپنڈی اسلام آباد میں وفاقی حکومت کے مختلف عہدوں پر رہے۔ وہاں سے ملازمت ہی کے سلسلے میں پہلے لندن اور پھر امریکہ چلے گئے۔ دونوں میاں بیوی اپنے دوستوں کے حلقے میں بہت مقبول تھے' مگر پردیس ان کی قسمت میں کچھ اس طرح لکھا گیا کہ وہ وہیں کے ہو رہے۔ اب ان سے ملاقات واشنگٹن میں ہوتی ہے تو دونوں بڑے تنہا نظر آتے ہیں۔

محمود احمد ملٹن یونیورسٹی میں نور سے جونیئر تھے۔ کراچی میں وزارتِ خارجہ سے منسلک رہے۔ ان کا انتقال جوانی میں ہو گیا۔ انگریز بیوی تھیں۔ یونیورسٹی کے زمانے میں انگریزی میں

شاعری کرتے تھے ان کا لقب یا تخلص "ملتِن" مختار زمن کا عطیہ تھا۔ جس زمانے کو میں یاد کر رہی ہوں زمن بھائی بھی کراچی میں مقیم تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں نور سے ایک سال سینئر تھے۔ ہماری شادی میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ لیکن ان کا دیا ہوا تحفہ "رباعیات عمر خیام" آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میری ملاقات پہلی بار زمن بھائی سے اس کتاب کی معرفت ہی ہوئی تھی۔ خوش فکر، خوش گفتار اور خوش رفتار مختار زمن۔ خوش رفتار کا لفظ مجھے ان کے خلوص اور محبت کے حوالے سے یاد آیا ہے۔ رونقِ محفل بھی ہیں اور انسانی رشتوں کا تقدس اور رفاقتوں کا بھرم بھی ان ہی جیسے لوگوں کے وجود سے قائم رہتا ہے۔ ہمارے لیے تو عزیزوں رشتہ داروں کی طرح ہیں۔ زمن بھائی کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر ہیں کہ وہ کسی قیمت پر کسی کی دل شکنی گوارا نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تعارف پسند مصنّف کی ہر تصنیف کی تقریب رُونمائی میں زمن بھائی کی رُونمائی بھی لازمی ہوگئی ہے۔ بے شک تصنیف اور صاحبِ تصنیف دونوں سے زیادہ داد بھی وہی سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ مضامین لکھنے اور پڑھنے دونوں میں صاحبِ طرز ہیں، مگر تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ اب انہیں اس قسم کے مضامین سلمیٰ بھن سے چھپ کر لکھنے پڑتے ہیں۔

سلمیٰ بھن بھی سادگی اور خلوص کا پیکر ہیں۔ سرسید کالج کی پرنسپل رہیں اور اب بھی علمی اور تدریسی کاموں میں مشغول رہتی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں جھگیوں میں رہنے والے بچّوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتی ہیں۔ زمن بھائی نے علمی اور تحقیقی کام بھی کیا ہے اور مزاح تو ان کی سرشت میں رچا ہوا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ سلمیٰ بھن اور زمن بھائی ایسے انسان ہیں کہ جن سے مل کر زندگی سے محبت ہوجائے۔ میں اگر ان کا خاکہ لکھتی تو عنوان ہوتا "اجالے ہی اجالے۔"

ان دنوں جب ہم کراچی کو نکھرتا سنورتا دیکھ رہے تھے ابنِ سعید (حسن عسکری) اور میجر ابن الحسن دونوں یہاں تعلقات عامہ کے محکمے میں تھے۔ ان دونوں کی علمی اور ادبی زندگی افسانہ نویسی سے شروع ہوئی اور صحافت میں بامِ عروج تک پہنچی۔ دونوں ہی نہایت مخلص اور کھرے انسان ہیں اور دوست بھی۔ عام لوگوں کو میجر ابن الحسن شاید اب پہلے سے مختلف نظر آتے

ہوں۔ مستقیم زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن مذہب پرست وہ آج بھی نہیں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ وہ منافقت کسی قیمت پر نہ اختیار کرسکتے ہیں نہ برداشت۔ نہ کسی کی خاطر اپنے نظریات میں تبدیلی پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ اب ان کا حلقۂ احباب محدود ضرور ہوگیا ہے لیکن ان کی خوش دلی اور شگفتہ مزاجی برقرار ہے۔ عسکری بھائی سے زیادہ ملاقات کے مواقع راولپنڈی میں ملے۔ انہیں اور نفیس بہن کو ہم اپنے رشتہ داروں میں گنتے ہیں۔ تعلقِ خاطر ان کے پورے خاندان سے ہی ہے۔ عسکری بھائی ملازمت کے سلسلے میں برسوں دوسرے ممالک میں رہے مگر قربت کے رشتوں پر کوئی آنچ نہیں آئی۔

اب کراچی میں ہر صبح 'نور سے فون پر بات کرنا ان کے معمولاتِ زندگی میں شامل ہے۔ اگر کسی صبح ان کا فون نہ آئے تو شاید ہم آمدِ سحری سے مشکوک ہو جائیں۔ عسکری بھائی اور نفیس بہن دونوں میں بڑی خوبیاں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہی کہ دونوں محبت کے رشتوں کو قائم رکھنا جانتے ہیں۔

عسکری بھائی کو علم و ادب خاندانی ورثے میں بھی ملا ہے۔ ان کے والد مرزا محمد سعید علمی دنیا میں معتبر حیثیت رکھتے تھے۔ عسکری بھائی کبھی حصولِ شہرت کی کسی دوڑ میں شامل نہیں ہوئے۔ نہایت سلجھے ہوئے ذہن کے مالک ہیں اور قابلِ رشک حد تک مطمئن شخصیت۔

کراچی میں ہی ڈاکٹر آفتاب احمد سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں ان کا تعلق مالیات کے محکمے سے تھا۔ علمی اور تنقیدی مضامین لکھ رہے تھے۔ اور اس وقت بھی غالب شناسی یا کلامِ غالب شناسی کے حوالے سے "غالب والے" آفتاب کہے جاتے تھے اب اسلام آباد میں رہتے ہیں اور غالب کے علاوہ فیض اور ن 'م' راشد کی پہچان کا حق بھی ادا کیا ہے۔

آفتاب بھائی نہایت مخلص انسان ہیں۔ ۵۱-۵۲ء میں راولپنڈی میں مری روڈ پر جو ہمارا گھر تھا۔ اس کے بیرونی کمرے میں وہ ہمارے شریک مکان پڑوسی سعید احمد خان کے خود کفیل مہمان کی حیثیت سے رہائش پذیر ہوئے تو ان کا شمار ہمارے افراد خاندان میں ہونے لگا اور یہ رشتہ آج تک برقرار ہے۔ اور آج تک یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ زیادہ قریبی رشتہ دار میرے ہیں یا نور کے۔ آفتاب بھائی ہماری ان محفلوں میں رکنِ رکین کی حیثیت رکھتے تھے جو ہر شام

قہوے کی پیالی کے دَور کے ساتھ رونق پذیر ہوتیں۔ جن میں یوسف ظفر' مختار صدیقی' عبدالعزیز فطرت اور نسیم الظفر وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

کراچی نیپیئر بیرکس کے قیام کے دنوں میں شان الحق حقی' ادیب سہارن پوری اور ظریف جبل پوری بھی ہمارے شناساؤں کے حلقے میں تھے۔ ملاقات ہوتی رہتی۔ مشاعروں میں تو اس وقت بھی شریک نہیں ہوئی جب شعر کہہ رہی تھی اور یہ تو میری خاموشی کا عرصہ تھا۔ ان دونوں اور حقی صاحب کا کلام ہم گھریلو ادبی نشستوں میں ہی سنتے تھے۔ طفیل جمالی بھی آتے جاتے رہتے تھے جو نور کے یونیورسٹی کے ساتھیوں میں تھے اور کسی اخبار سے منسلک تھے۔ ہماری محفلوں کی رونق محمد جعفری بھی تھے۔ کراچی میں بھی اور بعد میں اسلام آباد میں بھی۔ شان الحق حقی صاحب کو زیادہ دیکھنے کا موقع تو بعد میں میسّر آیا اور ان کی صفات سے آگاہی ہوئی۔ جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی اہم ماہرِ لسانیات بھی ہیں۔ اردو لغت بورڈ سے بچّوں کے ادب تک ہر جگہ ان کا نام اور کام موجود ہے۔ حقی صاحب ہمارے خاصانِ سلسلہ' میں شامل ہیں اور اپنی تمام مصروفیات کے باوجود بڑی پابندی سے ہر محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ مدّتوں بعد اسی کراچی میں عرفانہ عزیز سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک میرا دوسرا شعری مجموعہ "شہرِدرد" شائع ہوچکا تھا۔ عرفانہ عزیز کچھ اس طرح ملیں جیسے مدّتوں کے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ پھر وہ شادی کے بعد کینیڈا چلی گئیں اور ان کی شاعری میں وطن سے دوری کی کسک بھی شامل ہوگئی جس نے ان کی نظموں اور غزلوں کو اور بھی جاذبیت بخش دی ہے۔ برسوں بعد پہلی اردو کانفرنس میں ٹورانٹو میں دوبارہ ملیں تو وہی اشتیاق اور وہی خلوص موجود تھا جو پہلی ملاقات میں محسوس ہوا تھا۔ یہ قلم کے رشتے بھی کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ میں امریکہ اور کینیڈا کے دس بارہ شہروں میں دس بیس دن کے اندر بائیس مشاعروں میں شرکت کی متحمل نہیں ہوسکتی ورنہ عرفانہ عزیز سے مسلسل ملاقاتیں بھی ہوسکتی تھیں۔ جو بے شک خوشی کا باعث ہوتیں۔

اپنے ان عزیزوں میں جنہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا' صرف عالی جی ایسے ہیں جن سے میرا قلم کا رشتہ ثانوی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ نور کے واسطے سے میرے دیور ہیں اور یہ ناتا مجھے بہت عزیز ہے۔ نور ان کی اتنی نازبرداری کرتے ہیں کہ میرے لیے رشک

اور حسد دونوں کی گنجائش موجود ہے۔ حیرت ہے کہ میں عالی جی سے جلتی ابھی تک نہیں۔ ہاں ان کی کہی ہوئی کسی بات کو دل سے مانتے ہوئے بھی ان سے بحث مباحثے پر ہمیشہ آمادہ رہتی ہوں اور جب انہیں خفا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں تو وہ کچھ دنوں مجھے "بھابی بیگم" کہتے ہیں۔

عالی جی کی ادبی شخصیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھنا آسان نہیں ہے۔ عظیم اور منفرد شاعر، مفکر اور دانشور، عالی جی ممتاز اور ہمہ جہت حیثیت رکھتے ہیں۔ میں انسانی اقدار کے حوالے سے بھی انہیں بہت بڑا مانتی ہوں۔ یہ قابلِ قدر حقیقت ہے کہ وہ ایک دردمند انسان ہیں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ خصوصاً اپنی ادبی برادری کے مسائل حل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے اور اس میں کامیاب بھی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو، اردو کالج، اردو سائنس کالج اور رائٹرز گلڈ کے لیے عالی جی کی جو خدمات ہیں ان سے سبھی آگاہ ہیں بلکہ ان سے ایک ہی گیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو اپنی زندگی پر حاوی نہیں ہونے دیا جو اتنی خوبصورت شاعری کا حق ہے۔ عالی جی تو میرے دیور ہی ٹھہرے۔ طیبہ بہن بھی کچھ کم خوبیوں کی مالک نہیں ہیں۔ وضع داری میں اپنی مثال آپ۔ طیّبہ بہن محبت کے رشتوں کی حفاظت امانتوں کی طرح کرتی ہیں۔

جس زمانے کو میں یاد کر رہی ہوں اشفاق عظیم برنی مشیرِ مالیات وزارتِ دفاع تھے۔ بے حد نیک انسان ہیں۔ صوفی منش ایسے کہ ان کے لیے فیصلے سے عمل تک پہنچنا بھی کارِ دشوار ہو جاتا تھا۔ نور اور ان کے دو تین ساتھی ترقی کے حقدار قرار دیے جا چکے تھے جن کے لیے محکمے میں جگہ بھی موجود تھی لیکن اس کاغذ پر برنی صاحب کے دستخط ضروری تھے اور دستخط بہرحال عمل سے تعلّق رکھتے ہیں۔ متعلقہ افسران غیر ضروری تشویش میں مبتلا رہے اور یہ عرصہ خاصا طویل ہو گیا۔ نور نے جب ان سے بات کی تو وہ نہایت مشفقانہ انداز میں سمجھانے لگے کہ اتنی جلدی ترقی حاصل کر کے کیا کرو گے۔ ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے پر رہ کر تمہیں آئندہ ترقّی کے لیے اتنا انتظار کرنا پڑے گا کہ تھک جاؤ گے۔"

انہی دنوں نور کا انتخاب وفاقی مالیات کے ایک کورس میں شرکت کے لیے ہو گیا۔ یہ کورس امریکہ میں تقریباً چار ماہ کے لیے تھا۔ نور کے ساتھ دو افسر اور بھی تھے۔

نور اور ان کے ساتھیوں کو امریکن فوجی سروس کے جہاز سے سفر کرنا تھا۔ یہ جہاز آرام آرام سے راستے میں رُکتا' ٹھکتا اطمینان سے امریکہ پہنچتا تھا۔ دہران اور طرابلس میں ٹھہرتے قیام کرتے ہوئے نور روانگی کی چوتھی صبح چارلسٹن (ریاست کیرولینا) پہنچے۔ یہ سفر جو بیس گھنٹے میں طے ہوجاتا ہے' پورے تین دن میں مکمل ہوا اور پانچویں دن مجھے تار کے ذریعے ان کے خیریت سے پہنچنے کی اِطّلاع ملی۔ ہمارے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔

نور اپنے کورس پر چلے گئے تھے اور میرے سامنے سَنو لائے' کُملائے ہوئے ایک سو ستائیس (۱۲۷) طویل ترین دن تھے جنہیں بسر کرنا تھا۔ ہاتھ میں قلم ہوتا تو وقت بہتا چلا جاتا۔ کسی جوکھم میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی' دونوں بچے بہت چھوٹے تھے۔ عزمی کو تو ابھی ابھی اسکول میں داخل کیا تھا۔ امی میری تنہائی کے خیال سے ہندوستان سے آگئی تھیں۔ مگر بچّے اسکول چلے جاتے تو وقت بڑا بوجھل ہوجاتا۔ گھوم پھر کر نگاہ باغیچے پر پڑی جو ابھی تک ایک جُز وقتی مالی کے رحم و کرم پر تھا۔ جس کی صورت کبھی کبھی نظر آجاتی تھی سو میں نے اپنے لیے ایک لائحہ عمل تیار کرلیا۔ صبح بچّوں کو اسکول بھیجنے کے بعد کیلنڈر کی تاریخ پر سرخ روشنائی سے ایک دائرہ بناتی اور باہر لان میں جاکر پھول پتوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوجاتی۔

صحنِ چمن کو خود رَو جنگلی گھاس سے پاک کرنے کی کوشش کی تو ہتھیلیوں میں چھالے پڑ گئے۔ کبھی ہاتھ میں کُھرپی پکڑی ہی نہیں تھی۔ ویسے "سبزہ بیگانہ" کے معنی انہیں دنوں سمجھ آئے۔

بچّوں کے اسکول سے آنے تک تھکن سے چُور ہوجاتی مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یہ مشقت اچھی لگنے لگی تو تھکن کا احساس بھی کم ہوگیا۔ گھر کی صورت نکھر رہی تھی۔ کوئی نئی کونپل پُھوٹتی تو جیسے مجھ سے ہم کلام ہوتی۔ میری ہی طرح پھولوں کے پودے بھی نور کی پذیرائی کے لیے منتظر نظر آنے لگے۔ درختوں اور پودوں سے میرا رشتۂ محبت اسی زمانے میں استوار ہوا اور صرف پھول ہی نہیں میں نے کانٹوں سے بھی گفتگو کی ہے۔ خانہ باغ میں پھولوں کی پنیری کے علاوہ میں نے کیکٹس کی ہر قسم بھی جمع کرلی تھی۔ کیکٹس کا مطالعہ بڑا دلچسپ ثابت ہوا۔ یہ کانٹوں بھرے پودے ان گنت اقسام کے ہوتے ہیں۔ اپنا علیحدہ حسن اور مزاج رکھتے ہیں۔ نشوونما کے لیے ان کی ضروریات نہ ہونے کے برابر۔ پانی اپنے کانٹوں اور خاردار پتّوں کے

ذریعے ہوا کی نمی سے بھی حاصل کرلیتے ہیں۔ کچھ اقسام ایسی ہیں جن میں سال میں ایک بار ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت پھول کھلتا ہے۔ صرف ایک پھول جس کی عمر دو ڈھائی دن سے زیادہ نہیں ہوتی اور کبھی صرف ایک دن۔

کچھ کیکٹس میں نے تین چار انچ کے چھوٹے چھوٹے گملوں میں بھی لگائے اور بہت سجل نازک کیکٹس کی ایک اپنی ہی قسم وجود میں آ گئی۔ جنہیں کھڑکی کی منڈیر پر سجا دیا گیا۔

نور کی امریکہ سے واپسی کے بعد ہماری روز مرّہ کی زندگی میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں آئیں۔ اگرچہ پروموشن کا معاملہ ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔

امریکہ قیام کے دنوں میں نور کی ملاقات پہلی بار شعیب صاحب سے ہوئی۔ شعیب صاحب اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ متحدہ ہندوستان میں ملٹری اکاؤنٹس سروس سے نہ صرف منسلک رہے بلکہ اس میں بڑا نام حاصل کیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں یہ محکمہ بہت اہم تھا۔ تقسیم سے قبل اس محکمے میں زیادہ تر بنگالی افسر کام کرتے تھے' اس لیے ایک عرصے تک راولپنڈی میں بھی ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر کو "کلکتہ دفتر" کہا جاتا رہا۔ پاکستان آکر شعیب صاحب وزارت خزانہ میں جوائنٹ سکریٹری رہے۔ جب محکمانہ ترقی کے موقع پر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی تو انہوں نے وزیرِ خزانہ غلام محمد سے احتجاج کیا اور اس احتجاج کی پاداش میں انہیں اسی عہدے پر عالمی بنک میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے بھیج دیا گیا یہ جگہ اس وقت قطعی غیر اہم سمجھی جاتی تھی۔

واشنگٹن میں نور ان سے ملنے گئے تو وہ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ انہوں نے نور کا صرف نام ہی سنا تھا' لیکن ہمارے خاندان کے جو افراد سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے ان سب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے بھائی نیاز احمد آئی سی ایس تھے اور سعید بھائی کے ہم عمر بھی تھے اور سروس میں ساتھی بھی۔ نیاز بھائی اور ان کی بیگم سے ہم دونوں کے مراسم تھے۔ عمر میں تفاوت کے باوجود نیاز بھائی نور سے بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ باغ و بہار انسان تھے۔ نہایت خوش گفتار تھے اور شعروادب کا نفیس ذوق رکھتے تھے۔ قابلِ رشک حافظے کے مالک۔ جو نظم یا غزل پسند آجاتی برسوں بعد بھی لفظ بہ لفظ دہرانے پر قادر تھے۔ حیدر آباد میں کمشنر

تعینات ہوئے تو اس عرصے میں وہاں کئی یادگار مشاعرے منعقد کیے۔ ان میاں' بیوی کا انتقال اسلام آباد اور پشاور کے درمیان کار کے حادثے میں ہوا۔

شعیب صاحب سے نور کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے محکمے اور نور کی ملازمت کے بارے میں حال احوال پوچھا۔ نور نے پوری تفصیل سنا دی۔ یہ بھی کہ کئی افسر ہیں جن کی ترقی کا موقع بھی موجود ہے حق بھی ہے کسی قسم کی مزاحمت بھی نہیں ہے' لیکن عرصہ گزر گیا ہے اور دفتری کارروائی مکمل ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔ شعیب صاحب جب اگلے سال چند دن کے لیے پاکستان آئے تو انہوں نے برنی صاحب سے سفارش بھی کی جو کارگر نہیں ہوئی۔

اکتوبر ۵۸ میں ملک میں مارشل لا نافذ ہوا۔ اسکندر مرزا کے بعد جب جنرل محمد ایوب خاں نے مارشل لاء کے سائے میں اپنی کابینہ مرتب کی تو شعیب صاحب وزیر خزانہ نامزد ہوئے۔ عالمی بینک میں بطور سزا بھیجے گئے تھے لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ ان کی واپسی ایک اہم وزارت کے سربراہ کی حیثیت سے ہوئی۔

شعیب صاحب جب پاکستان پہنچے تو ان کے پرائیویٹ سکریٹری کے لیے جو دو نام لوگوں کے ذہن میں آئے وہ محمد یعقوب' جو بعد میں وزارتِ تجارت میں سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے اور محمود سلیمان کے تھے کیونکہ یہ دونوں ان کے ماتحت کام کر چکے تھے اور وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ نور سے اب تک صرف تین بار ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیں حیرت ہوئی جب انہوں نے نور کا انتخاب کیا۔ اگر اس وقت نور ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوتے تو اصولاً" یہ انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ۵۸ء کا نومبر تھا۔ جس طرح تمام سرکاری عہدوں کا اعتبار اس وقت تک قائم اور موجود تھا اسی طرح کسی اہم وزارت میں پرائیوٹ سکریٹری کے فرائض کی ادائیگی بھی اہم سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد نور کی ترقی بھی ہو گئی۔

نور اپنے کام اور ماحول سے مطمئن اور شاداں تھے اور اب معمولات زندگی میں بھی کچھ اور رونق آ گئی تھی۔ میں بھی خوش تو تھی لیکن اس ادب آداب اور تکلّفات کی فضا سے کُھلے دل سے صلح کبھی نہ کر سکی۔

صدرِ مملکت ایوب خاں نے اسلام آباد میں دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تو ایک بار پھر ہم

راولپنڈی پہنچ گئے۔ اسلام آباد میں مکانات ابھی تعمیر ہو رہے تھے۔ شعیب صاحب کو راولپنڈی سول لائنز میں مکان مِلا تھا جس کے ساتھ ہی ہمارا گھر تھا۔ سڑک پار سامنے کے مکان میں بھٹو صاحب اقامت پذیر تھے جو اُن دنوں وزیرِ خارجہ تھے۔

شعیب صاحب سادہ مزاج اور مخلص انسان تھے۔ پہلی بیگم کا حال ہی میں انتقال ہو چکا تھا اور ابھی انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ چار بچے امریکہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ ایک بیٹی ڈاکٹر نفیس صادق جو وزارتِ صحت میں ملازم تھیں' اور چھوٹا بیٹا طارق ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ڈاکٹر نفیس صادق آج کل اقوام متحدہ کے ادارے میں انڈر سکریٹری ہیں۔

نور کے ساتھ شعیب صاحب کا وہ برتاؤ نہیں تھا جو کسی ماتحت کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہوں نے پہلے دن سے ہم دونوں کو اپنے خاندان کے افراد کی طرح سمجھا اور حکومت سے مستعفی ہونے کے بعد بھی ان کے اس رویے میں ہمارے لیے کوئی فرق نہیں آیا۔ مجھے یاد ہے شروع شروع میں نور نے نفیس کو مسز صادق کہہ کر مخاطب کیا تو کہنے لگے کہ تمہیں اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔ گھر کے سب لوگ ان کا نام لیتے ہیں۔

اسی اپنائیت کا ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آگیا۔ ایک شام ہم نے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ سب لوگ جمع تھے اتنے میں دیکھا کہ شعیب صاحب ٹہلتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور وہ نہ صرف بے تکلّف گفتگو بلکہ کھانے میں بھی شریک ہوئے۔ ان کے مزاج میں تصنّع اور دکھاوا قطعی نہیں تھا۔ بعد میں نور کے دوستوں نے شکایت کی کہ تم نے وزیرِ خزانہ کو بلایا اور ہمیں پہلے سے بتایا بھی نہیں کہ لباس میں دستور کے مطابق ٹائی وغیرہ کا خیال رکھتے۔

شعیب صاحب کے سلسلے میں ایک اور واقعہ مجھے یاد آگیا۔ ابھی پچھلے دنوں کسی سرگزشت میں اس کا ذکر پڑھا جو درست نہیں تھا۔ کچھ اشارے کنائے ان دنوں میں بھی ہوئے تھے اور جبھی میرے استفسار پر نور نے مجھے پوری صورت حال بتائی تھی۔ ظاہر ہے کہ نور سے زیادہ واقفِ حال گواہ اس معاملے کا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

قصہ یہ تھا کہ مارشل لا کا ایک حکم نامہ جاری ہوا تھا۔ جس کی رُو سے جس شخص کے پاس دوسرے ممالک میں زرِ مبادلہ موجود تھا وہ اسے واپس پاکستان لا کر اسٹیٹ بینک میں جمع کرتا تھا۔

شعیب صاحب نے اس قانون سے مستثنیٰ رہنے کی درخواست دی۔ صدرِ مملکت کے نام یہ خط انہوں نے اپنے پی۔ اے کو لکھوا دیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ پرسنل اسسٹنٹ جو مسوّدہ بھی ٹائپ کرتا اس کو روانہ کرنے سے پہلے نور کو دکھانا ضروری تھا تاکہ اس میں کوئی غلطی یا خامی نہ رہ جائے۔ یہ ٹائپ شدہ خط لے کر نور شعیب صاحب کے پاس گئے اور رکتے جھجکتے ان سے کہا کہ کیا یہ مناسب ہے کہ جس حکم کی زد میں بہت سے لوگ ہیں' خود وزیر خزانہ اس سے روگردانی کریں۔ کیا اس پر اعتراضات نہیں ہوں گے۔ نور جو اُن سے اتنی ذاتی بات کرسکتے تھے یہ بھی شعیب صاحب کی بڑائی کا ایک رخ تھا۔

شعیب صاحب نے اسی وقت اس کاغذ پر دستخط کیے اور صدر کے ملٹری سکریٹری بریگیڈیئر نوازش علی کو فون کرکے صدر ایوب سے ملاقات کے لیے وقت مانگا اور پھر نور سے کہنے لگے کہ یہ رقم ان کی باقاعدہ تنخواہ کی ہے۔ غیر قانونی طور پر جمع کی ہوئی یا چھپائی ہوئی رقم نہیں ہے جس کے بارے میں یہ حکم نامہ جاری ہوا ہے۔ اس زرمبادلہ کو پاکستان واپس نہ لانے کی انہوں نے دو وجوہ بتائیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں معلوم نہیں کہ وہ اس عہدے پر کب تک رہیں گے' دوسری وجہ یہ کہ ان کی اولاد ابھی امریکہ میں زیرِ تعلیم تھی اور ان کی تعلیم کے اخراجات اس رقم سے زیادہ تھے جو حکومتِ پاکستان کسی طالب علم کے لیے منظور کرتی ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ حکومتِ وقت سے خاص مراعات حاصل کرکے اپنی اولاد کے تعلیمی اخراجات پورے کریں یہ بہتر ہے کہ جو زرِمبادلہ انہوں نے اپنی تنخواہ کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ وہ ان اخراجات کے لیے وہیں رہنے دیں۔

دوسرے دن صدر کا باقاعدہ اجازت نامہ ان کے پاس آگیا۔ اس سے زیادہ اس سلسلے میں کچھ نہیں ہوا تھا۔

مہرباں لمحے

وہ بہت خوبصورت دن تھے۔

نثار عزیز بٹ سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ لیکن ان سے دائمی خلوص اور محبت کے رشتے اسلام آباد میں مستحکم ہوئے۔

وہ طلسمِ حیات جسے لوگ اپنی ذات سے باہر تلاش کرتے ہیں اور خسارے میں رہتے ہیں' وہ تو اپنے ہی وجود کے اندر نہاں ہے۔ یہ حقیقت نثار کو قریب سے دیکھ کر کچھ اور واضح ہو جاتی ہے۔ نثار زندگی سے صلح کر لینے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کی تربیت یافتہ نگاہ ہر دھندلکے میں اجالا اور ہر نظارے میں حسن تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ساتھ ہی اس دل آزار دنیا میں نثار دلداری کا ایک خوبصورت نمونہ بھی ہیں۔

سرحد کی روایتی مہمانداری ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ دوسروں کے لیے سراپا خلوص و محبت اور اپنے لیے بے پروا بے نیاز۔ ان کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر' ان کے گونجتے ہوئے قہقہے سن کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی جھولی میں دوسروں کے بھی بہت سے غم سمیٹے ہوئے ہیں۔ کامیاب اور خوش رنگ زندگی بسر کرتی ہوئی ایک بے قرار اور بے چین روح۔ نثار ایک ایسی جیتی جاگتی کتاب ہیں جسے پڑھنا آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ تخلیقی ادب عورت سے کچھ زیادہ ہی خراج طلب کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی ناقابلِ برداشت حد تک بھی۔ مثلاً" ورجینیا ولف' سلویا پلاتھ اور اپنے ہی شہر میں سارہ شگفتہ۔ اور بھی نام ہیں مگر گنائے کیسے جائیں۔ صدیوں کے اعمال نامے میں تو وہ لاتعداد بے نام خواتین بھی کہیں نہ کہیں موجود ہیں جو غبارِ وقت میں اپنی پہچان تلاش کرتی ہی رہ گئیں۔ ہم تو خوش نصیبوں میں ہیں۔

۵۳۔۵۴ء میں جب لاہور میں ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا وہ اپنے بھائی سرتاج عزیز کے ساتھ رہتی تھیں۔ سرتاج عزیز سے ہمارا ملنا جُلنا ملٹری اکاؤنٹس کی ملازمت کے تعلّق سے ہوا تھا جو رفتہ رفتہ خلوص کے رشتے میں ڈھلتا چلا گیا۔ اس وقت نثار کا پہلا ناول "نگری نگری پِھرا مسافر" شائع ہو چکا تھا۔ ادھر میرا ناتا اپنی شاعری سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس لیے اس ملاقات کو کسی لحاظ سے بھی تخلیقی ادب کے وسیلے سے نہیں کہا جا سکتا۔ بعد میں بے شک انہیں جڑوں سے اَکھوے پھوٹے۔

سرتاج عزیز اور لالی دونوں نہایت مخلص دوست اور اچھے انسان ہیں۔ نثار میں اس وقت بڑی وجہ کشش ان کا شگفتہ مزاج تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ طویل اور تھکا دینے والی بیماری سے انہیں دنوں صحت یاب ہوئی تھیں۔ ان کے کسی انداز سے بھی اس گزری ہوئی بیماری کا کوئی نشان پتہ نہیں ملتا تھا۔ دیکھنے میں جسمانی طور پر بھی وہ قطعی صحت مند تھیں اور ذہنی حسن و جَولانی کا ثبوت ان کا ناول تھا۔ جو اسپتال کے قیام کے دَوران میں لکھا گیا تھا۔ اور اپنی طرز کی ایک کامیاب تصنیف ہے۔

انہی دنوں اصغر بٹ کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ پھر اصغر بٹ کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ دو تین سال بعد ہم لوگ بھی کراچی پہنچ گئے۔ اس شہر میں ان سے ملاقات گاہے گاہے ہو سکی۔ اس کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتی۔

جن دنوں رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا وہ کراچی میں ہی تھیں اس وقت تک میرا پہلا شعری مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" شائع ہو چکا تھا لیکن وہ بھی شاعری سے میری اَن بَن کا زمانہ تھا۔ پھر بھی میں ان جلسوں میں شریک ہوئی۔ نثار کے یہاں ان دنوں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی اس لیے ان جلسوں میں ملاقات کے جو مواقع میسّر آتے وہ بھی نہیں ملے۔ پھر سلسلۂ روزگار نے ہم دونوں کو اسلام آباد پہنچا دیا۔

شروع میں کچھ عرصے وہ راولپنڈی میں رہیں۔ فاصلے کی وجہ سے جلد ملنا ممکن نہیں تھا لیکن سرکاری شہر میں جب بھی یکسانیت کا احساس بوجھل ہونے لگتا ہم دونوں نثار کے گھر پہنچ جاتے۔ اصغر بٹ خاموش طبع ہیں۔ ان کا ایک آدھ دلچسپ جملہ ان کی شرکت کا

احساس دلانے کے لیے کافی ہوتا ۔ لیکن نثار کے بے ساختہ قہقہے شب و روز کا سارا غبار دھو ڈالتے۔ پھر وہ لوگ بھی اسلام آباد منتقل ہوگئے تو فون پر بھی گھنٹوں باتیں ہوتیں اور ملاقات بھی ہر دوسرے تیسرے روز ضرور ہوتی ہمارے گھر بھی زیادہ دور نہیں تھے اور جب وہ گھر پر نہیں ملتیں تو امریکن سینٹر یا برٹش لائبریری میں ضرور مل جاتیں۔

نثار بہ یک وقت دو علاقوں میں رہتی ہیں۔ ایک میں دوستوں کو خوشیاں بانٹتی ہیں۔ رشتہ داروں کا دکھ درد سمیٹتی ہیں اور دوسرا کتابوں کا علاقہ ہے جہاں سے وہ خود توانائی اور آسودگی حاصل کرتی ہیں۔ زندگی کے تمام بکھیڑوں اور اُلجھاووں سے دامن بچائے یا منہ موڑے بغیر نثار ہمیشہ کتابوں میں کھوئی ہوئی ملتی ہیں۔ لگتا ہے وہ صرف ادب ہی تخلیق نہیں کرتیں انہوں نے اپنے لیے ایک روشن تر، حسین تر دنیا بھی تخلیق کرلی ہے۔

نثار کی یہ دنیا جس حد تک بھی کسی کو اس کی جھلک دکھائی دے سکے، ان کے قریبی دوستوں کے لیے بھی ایک جاذبیت رکھتی ہے۔ پڑھتی ہیں لیکن لفظوں سے کھیلتی نہیں۔ اپنے علم کی نمائش بھی نہیں کرتیں۔ لکھتی ہیں اور لکھتی رہتی ہیں لیکن اپنی ادبی کاوشوں کی داد حاصل کرنے کے لیے کبھی انہوں نے کسی کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ اور یہ جیتے جاگتے لوگ حساس بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان کا ناول "نے چراغے نے گُلے" طبع ہوا تو کسی رسالے میں اس کے بارے میں ایک خاتون افسانہ نگار کا تعصب آمیز تنقیدی مضمون شائع ہوا جس کا تلخ لہجہ خود مضمون نگار کے بارے میں بہت کچھ بتا رہا تھا۔ نثار کے لیے یہ سوغات اس دوست کی جانب سے تھی جسے خلوص کا دعویٰ بھی رہا تھا۔ مضمون سب ہی نے پڑھا۔ مجھے بھی بُرا لگا۔ وہ کچھ خاموش ہوگئیں۔

انہیں دنوں ایک شام ہم لوگ اسلام آباد کلب سے راول جھیل کی طرف پیدل جارہے تھے۔ درختوں کے بیچ جو پگڈنڈیاں سی بنی ہوئی تھیں ان پر چلتے چلتے اس مضمون کا ذکر آگیا۔ نثار کا چپ چپ رہنا دل کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چنانچہ مضمون نگار کے لیے سزا لازم قرار پائی۔ ایک تخلیق کے قتلِ عمد کا قصاص قتل ہی ہو سکتا تھا۔ اگاتھا کرسٹی کے ناول جو کبھی کبھی روز مرّہ کی فضول سی الجھنوں سے فرار کی خاطر پڑھے جاتے تھے ان کی رہ

نمائی میں یقین تھا کہ واردات کا سراغ کسی کو نہیں مل سکے گا۔ اور جھیل کا پانی اپنی تمام متانت اور گہرائی کے ساتھ ممکنہ سہولت بھی پیش کر رہا تھا۔ پھر یہ سزا ذرا زیادہ سخت نظر آئی اور مجرم کا ہاتھ یا انگلی قلم کرنے کے طریقوں پر غور کیا جانے لگا۔ اب ہم چاروں جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چہروں سے تمام آزردگی ڈھل چکی تھی بلکہ دھیمے دھیمے قہقہے بھی باتوں میں گھل مل گئے تھے۔

سوچا گیا کہ مجرم کا تعلق بہرحال ہمارے اپنے قبیلے سے ہے۔ سزا دینا ہے تو یہی پر فضا جگہ موزوں ہے جہاں اس وقت ہم لوگ موجود ہیں۔ بسنتی دھوپ اور ہواؤں کا خوشگوار لمس اور شگوفوں سے لدے ہوئے اشجار کے نکہت بیز سائے۔ ایسے ماحول میں مجرم کو بھی اس سزا پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ شاید وہ احسان مند بھی ہو۔

اچانک نثار کو آزادیٔ اظہار کا حق یاد آگیا۔ انہوں نے اعلان کیا "مجرم کو معاف کیا جائے۔ اس کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ جو ناول اسے قطعی پسند نہیں آیا وہ شروع سے آخر تک پڑھنا بھی پڑا اور محض ایک مضمون لکھنے کی خاطر' اب مزید سزا دینا انصاف سے بعید ہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نثار موجودہ عہد کی نہایت اہم ناول نگار ہیں۔ ان کی تصانیف سے سرسری نہیں گزرا جا سکتا۔ نثار کے حسنِ اخلاق اور جمالِ کردار کے علاوہ ان کی ادبی حیثیت بھی اپنی وقعت اور اپنا اعتبار رکھتی ہے۔

ہم دونوں کی کوئی بات ایک دوسرے سے چُھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے باوجود نثار کبھی کبھی مجھ سے کہتیں "ادا بہن' اس گھر کا کوئی ایک دروازہ ابھی تک میرے اوپر بند ہے۔" اگر ایسا تھا تو بے ارادہ ہی تھا۔ پتہ نہیں انہیں یہ وہم کیوں ہوا تھا۔ خود نثار کو دیکھنے اور سمجھنے کے سلسلے میں شاید میں کچھ زیادہ ہی خوش گمان رہی اور اس لیے خوش بھی۔

نثار ویسے تو جمال ہی جمال ہیں۔ محبت کے رشتوں کی قدر کرتی ہیں لیکن کسی صورت حال میں اپنے اصولوں اور نظریات کے سلسلے میں سمجھوتوں کی عادی بھی نہیں ہیں۔ ہم

دونوں نے ان کا جلال بھی دیکھا ہے۔ وہ اختلاف رائے کے اپنے حق سے بھی دست بردار نہیں ہوتیں۔ یہ ایک دعوت کا واقعہ ہے مگر میں اس کی تفصیل کیوں یاد کروں۔ ایک آدھ اور موقع بھی ایسا آیا جب اختلاف رائے جلال کے سانچے میں ڈھل گیا۔ ہاں ایک بار وہ مجھ سے بھی خفا ہو گئیں لیکن اس میں ان کے جلال کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس خفگی کو خفگی ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر انہیں یاد آیا کہ اس ناراضگی کی وجہ تو انہیں یاد ہی نہیں ہے۔

اب جو وہ لاہور میں ہیں اور میں کراچی آگئی ہوں تو انہیں مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں خط کیوں نہیں لکھتی۔ میرا عقیدہ ہے کہ خط لکھنا گویا دوری کا اعتراف کرلینا ہے۔

اسلام آباد کے جس گھر میں بیری کا درخت تھا اور جہاں شاخِ سدرہ کی وساطت سے میری ملاقات گئے دنوں کی بُھولی بِسری اور دل کے کسی گوشے میں بسی ہوئی آواز سے ہوئی تھی اس گھر کا انتخاب نثار اور عذرا مختار مسعود نے ہمارے لیے کیا تھا۔

۱۹۷۷ء میں لاہور کے اسٹاف کالج سے جہاں نور پرنسپل کی حیثیت سے متعین تھے اچانک ہی ان کا تبادلہ وفاقی حکومت میں بہ حیثیت اسٹیبلشمنٹ سیکریٹری اسلام آباد ہو گیا تھا۔ تبادلہ بے شک نہایت اہم عہدے پر ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس تقرر کے لیے اکثر سینئر افسران خواہش مند رہتے ہیں۔ نور کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اسٹاف کالج میں خوش تھے وہاں کا صاف سُتھرا علمی اور ایک خاص تہذیبی ماحول ان کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا۔ تربیتی کام تھا جہاں نہ کسی قسم کی سیاست تھی نہ رقابت۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جس کی روزی کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کی رضا سے صرف سرکاری ملازمت ہو اس کے پاس انکار یا انتخاب کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ لیکن لاہور میں عامر ایچی سن کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے میں اس تبادلے سے بڑی بد دل تھی۔ غلام اسحٰق خاں اس زمانے میں وزیر خزانہ اور وزارت اسٹیبلشمنٹ کے نگراں تھے۔ ابھی نور کو احکام نہیں ملے تھے کہ رات کو ساڑھے گیارہ بجے آغا ناصر کا اسلام آباد سے فون آیا۔ انہوں نے ریڈیو کی گیارہ بجے کی خبروں میں یہ فیصلہ سنا تھا۔ آغا ناصر اور صفیہ مبارکباد دے رہے تھے۔ نور حیران تھے اور

میں پریشان۔

نور نے مجھ سے کہا سرکاری ملازمت میں تبادلے ہوا ہی کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ آخر میرے اصرار پر صبح مجھے ساتھ لے کر اسلام آباد چلنے پر رضامند ہوگئے کہ میں خود غلام اسحٰق کو اپنی صورت حال اور پریشانی بتاؤں گی۔

اگلی صبح میں نور کے ساتھ اسحٰق صاحب کے گھر گئی۔ ۱۹۶۱ء میں جب غلام اسحٰق خاں چیئرمین واپڈا کے عہدے پر فائز تھے تو نور ممبر فنانس واپڈا تھے۔ ان کی بیگم سے بھی میری ملاقات تھی۔ کئی سال دونوں کی شفقت اور محبت ہمیں بہت قریب سے حاصل رہی تھی۔ اسحٰق صاحب سگریٹ پیتے رہے مسکراتے رہے اور میری فریاد سنتے رہے۔ باتیں بھی کرتے رہے لیکن فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ ان کے برتاؤ میں آئندہ بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی شفقت کا انداز رہا۔

میں نے غلام اسحٰق خاں کو جس زمانے میں اور جتنا دیکھا وہی تحریر کررہی ہوں۔ بہ حیثیت صدرِ پاکستان میری کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم نے ان کے بارے میں عوام اور خواص کے ہر حلقے سے ہمیشہ حرفِ تحسین ہی سنا بھی تھا، مگر آخر آخر وہ متنازع شخصیت ہوگئے۔ اخباروں سے جو کچھ معلوم ہوتا رہا اس پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

لاہور واپس آکر میں نے نور سے کہہ دیا کہ اس بار اسلام آباد میں رہنے کے لیے مکان کا انتخاب میں نہیں کروں گی جو مکان وہ چاہیں خود ہی کرائے پر حاصل کرلیں نور نے یہ فریضہ نثار اور عذرا کو سونپ دیا۔ دونوں اسلام آباد میں تھیں اور دونوں نے اس سلسلے میں نہ صرف تلاش و جستجو کا تھکا دینے والا کام کیا بلکہ جب میں سامان کے ساتھ اسلام آباد پہنچی تو اس مکان کو گھر بنانے میں بھی میری مدد کی۔ میں پیکنگ کے جھمیلوں سے تھکی ہوئی تھی اور اس تقرر سے ابھی تک خوش بھی نہیں تھی۔ سامان کمروں میں اِدھر اُدھر لایا جارہا تھا اور میں وہیں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

نثار لاہور گئی ہوئی تھیں۔ عذرا کام کرنے والوں کو ہدایات دے رہی تھیں وہ مکان آرام دہ ہونے کے علاوہ خوبصورت بھی تھا۔ لیکن سچی بات ہے کہ اس وقت مجھے بالکل

پسند نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں عذرا نے آکر کہا۔

''ادا بہن آپ کا کمرہ میں نے تیار کروادیا ہے۔''

میرے دل سے عذرا کے لیے دعائیں نکلیں۔ وہ آج بھی میرے لیے چھوٹی بہن کی طرح ہیں۔ نرم خُو، نرم دل اور نرم گفتار' عذرا دوستوں کے لیے سراپا خلوص و ایثار' شناساؤں کی دردمند اور غم گُسار۔ سب سے اہم حقیقت تو یہی ہے کہ وہ محبت کرنا جانتی ہیں۔ مختار مسعود اس زمانے میں وزارتِ صحت کے سکریٹری تھے۔ ایک بار میں نے مختار مسعود سے کہا تھا۔

''آپ کو عذرا پر فخر کرنا چاہیے لیکن یاد رہے کہ یہ تصنیف آپ کی نہیں ہے۔ ان کے مزاج اور رویوں کا تمام حسن اس گھر اور اس ماحول کی دین ہے جہاں انہوں نے آنکھ کھولی تھی۔ بلکہ میرے دل کی پوچھیے تو آپ کی جن تصانیف نے آپ کو صفِ اوّل کے مصنفین میں شامل کیا ہے اس میں عذرا کا بڑا حصّہ ہے۔''

اس پر وہ چونکے مگر میرے دعوے میں مبالغہ نہیں تھا۔ عذرا ایک مثالی بیوی ہیں۔ لکھنے کے لیے جس گوشۂ سکون و فراغت کی آرزو دل میں ہوتی ہے وہ عذرا نے بہ ہر طور انہیں مہیا کیا ہے۔ نہ انہوں نے کبھی مختار مسعود کے مقرر کردہ معمولات میں رخنہ آنے دیا نہ وہ کبھی ان کے وقت کی دعوے دار بنیں۔

عذرا خود بھی خوبصورت نثر لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین میں نے سنے بھی ہیں اور پڑھے بھی ہیں' مگر بہت کم۔ پھر نہ جانے کیوں انہوں نے لکھنا ترک ہی کردیا۔ یہ عذرا نے اپنے اوپر ظلم کیا اور ہمیں بھی مایوس کیا۔ اب بھی جو ان کے خط کبھی کبھار آتے ہیں ان میں وہی ادبی لہجہ اور وہی طرزِ اظہار کا حُسن ہوتا ہے۔ کاش انہوں نے لکھنا جاری رکھا ہوتا۔

مختار مسعود سے ہم دونوں کو ہمیشہ بہت قرب کا احساس رہا ہے۔ اب تو مہینوں ملاقات نہیں ہوتی۔ مگر دوری اب بھی ہمارے درمیان نہیں ہے۔ مختار مسعود صرف صاحبِ طرز ادیب ہی نہیں ہیں۔ اپنے شب و روز کے حساب میں بھی صاحبِ طرز ہیں۔ ان کے طے

شدہ معمولات میں وقت مداخلت نہیں کر سکتا۔ مزاجاً" کاملیت پسند لیکن دوستوں کے بہترین دوست ہیں۔ ہماری خاطر تو وہ اپنے اٹل روزمرّہ کے پروگراموں میں ترمیم بھی گوارا کرتے رہے ہیں۔ نور انہیں "مردِ کامل" کہتے ہیں۔ بے یوں کہ نور ایک ہی سانس میں مختار مسعود کے ناقد بھی ہیں اور مدّاح بھی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ وہ مدّاح زیادہ ہیں اور مختار مسعود کا مدّاح کون نہیں ہے۔

اسلام آباد کی تصویر میں مفتی جی اپنی الگ ہی پہچان رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دھوم قیام پاکستان سے پہلے بھی تھی۔ ملاقات کا اشتیاق بھی بہت دنوں سے تھا اور بہت تھا، مگر ان کی گفتگو اور گفتگو کی جاذبیت، کبھی نصیحت، کبھی ڈانٹ ڈپٹ اور کبھی احترام آمیز انداز۔ یہ سب تو ہم نے جی بھر کر اس زمانے میں دیکھا اور سنا جب وہ ہماری خاطر "سلسلہ" کی رکنیت قبول کر چکے تھے اور یہ تمام مراعات کراچی آنے کے بعد بھی ہمیں حاصل ہیں۔ نور سے ان کی باقاعدہ خط و کتابت ہے۔ وہی گفتگو اور وہی لہجہ خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے۔

مفتی جی تخلیقی ادب کا اتھاہ ساگر ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ وقت کی حدود سے آزاد ہیں۔ مختصر افسانے کے ابتدائی دَور میں بھی ادیبوں کی پہلی صف میں موجود تھے اور آج جدید ترین افسانہ نگاروں کے گروہ کے سرخیل بھی وہی ہیں۔ وقت اپنا سایہ ان پر نہیں ڈال سکا ہے۔ ہم سب انہیں سن رسیدہ بیٹے کا نوجوان باپ کہتے تھے۔ عکسی مفتی ہمارے احترام میں ہمارے سامنے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ رہتے تھے۔

مجھے تو لگتا ہے وقت کے علاوہ مقام کی قید سے بھی وہ آزاد ہیں کہ آپ انہیں اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی باتیں سن رہے ہیں اور عین اسی لمحے وہ کہیں دور کسی برگد کی چھاؤں میں آنکھیں بند کیے کسی اور ہی سے محو تکلم ہیں۔ پہاڑوں، پتھروں کے بیچ کھلے ہوئے کسی اکیلے پھول کی اجنبی خوشبو کی آواز بھی سن رہے ہیں اور رم جھم برکھا میں کسی دیو داسی کسی نرتکی کے راگ ملہار پر جھوم بھی رہے ہیں اس بھید کو کون بُوجھے۔

مفتی جی کی بڑائی اس میں بھی ہے کہ وہ اپنی بڑائی کو سات پردوں میں چھپائے رکھتے ہیں۔ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہاں اپنے پاس بے شمار قلم ضرور رکھتے ہیں جس کسی کو سرنہوڑائے' چپ چاپ بیٹھے دیکھا چپکے سے ایک قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لاڈ' پیار' غصّہ' دھونس جو حربہ بھی استعمال کرنا پڑے دریغ نہیں کرتے۔ وہ بیچارہ سہم کر لکھنا شروع کر دیتا ہے اور پھر لکھتا چلا جاتا ہے۔ لوگ اسے مان لیتے ہیں تو مفتی جی کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

زندگی کے میدانِ حشر میں ہمیں اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود دوستوں بلکہ شناساؤں کا بھی بے کراں خلوص شجر سایہ دار کی طرح ملا ہے۔ اسلام آباد میں اور بھی جو آئینہ تمثال دوست تھے اور ہیں ان سب کی یادیں گراں بہا سرمائے کی طرح دل میں محفوظ ہیں اور صرف اسلام آباد ہی کیوں کہوں دوستوں کے معاملے میں' میں اور نور دونوں اللہ کے فضل و کرم سے بہت خوش قسمت رہے ہیں۔

اب سوچتی ہوں بچپن میں سب سے اتنی الگ تھلگ کیسے رہی۔ ایک محبّت سے محرومی کا وہ کیسا انتقام تھا جو میں اپنی ہی ذات سے لے رہی تھی۔ برسوں کوئی دوست نہیں کوئی سہیلی نہیں۔ اس زمانے میں لوگوں کی رفاقت مجھے منظور ہی نہیں تھی۔ دن کتابوں کی معیت میں گزرتا جنہیں اچھی طرح پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ شام پڑے باورچی خانے میں پیڑھی پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی کسی دھیان کی پُروائی کا دامن تھامے ہوئے' سامنے چُولہے کی آگ سے اُٹھتا ہوا گلابی دھواں' اور توّے سے اترتی ہوئی سنہری روٹیاں' اور پکانے والی ملازمہ کی بے رنگ چوڑیوں کی رنگا رنگ کھنک' اور سامنے پیڑھی پر بیٹھی ہوئی ایک اکیلی لڑکی جو وقت کے جادوگر سے اپنا پتہ پوچھ رہی تھی۔

ایک سب آگ ایک سب پانی

نیو انگلینڈ کی ان دو شاعر خواتین سے میری ملاقات ان کی موت کے بعد ہوئی۔

گمانوں کو چھونے اور خیالوں کو بوجھنے کی عمر میں میرے سامنے دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ دائرہ در دائرہ زیست بسر کرنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا اب اتنی دوری کے بعد نظر آرہا ہے۔ اور صرف ایک جملے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ میں کہاں کہاں پہنچنا اور کس کس کو دیکھنا اور سننا چاہتی تھی مگر مدتوں کھلی ہوا میں سانس لینے کو بھی ترستی رہی' سو اب میں نے وقت اور زمانوں کی حد بندیاں بھی توڑ دی ہیں۔

ایک موسم گرما میں ان دونوں نہایت غیر معمولی خواتین سے ملاقات ہوئی۔ ایک خود اپنا سایہ تھی اور دوسری جیتا جاگتا بھرپور جسم۔ دونوں کے درمیان قریباً" ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ ایک کی رہائی کے لیے موت کو از راہِ کرم اس کے پاس آنا پڑا۔ دوسری خود اپنے قدموں چل کر موت کے پاس گئی۔ ایملی ڈکنسن اور سلویا پلاتھ دونوں کا تعلق نیو انگلینڈ سے ہے۔

نیو انگلینڈ کا پورا علاقہ چھ امریکی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ میساچوسٹس' مین' نیو ہیمپشائر' ورمانٹ' کینک ٹیکٹ اور روڈ آئی لینڈ۔ ان ریاستوں کے درمیان فاصلہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔نئی دنیا کی دریافت کے بعد سب سے پہلے جرأت آزماؤں کے جو قافلے امریکہ پہنچے وہ بوسٹن کے قریب پلائی متھ راک کی خلیج پر رکے۔ رفتہ رفتہ یہ آبادکار آگے بڑھتے گئے اور زمین ان کے قدموں تلے بچھتی چلی گئی۔ اس علاقے کی آب و ہوا اور چھب انگلینڈ سے ملتی جلتی تھی چنانچہ اس پورے علاقے کا نام انہوں نے نیو انگلینڈ رکھ دیا۔

یہ سرزمین قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے۔ دریا، جھیلیں، کوہسار اور سرسبز و شاداب وادیاں۔ چپّے چپّے پر فطرت کا حُسن بکھرا ہوا ہے۔ فصل بہار تو ہر خطّۂ ارض کے لیے رنگوں کا تحفہ لے کر آتی ہے۔ نیو انگلینڈ کا موسمِ خزاں بھی اپنی رعنائی اور دلکشی میں بے مثال ہے۔ شجر شجر ایک طغیان رنگ جس کی دید کے لیے دور و نزدیک کے علاقوں سے لوگ آتے ہیں۔ قطعی ناقابلِ یقین سا منظر ہوتا ہے۔ مصوری کا کوئی نادر شہ پارہ سا جس کے اندر دبے پاؤں ناظر خود بھی پہنچ جائے۔ اکتوبر کے اوائل میں اس رنگوں بھرے موسمِ خزاں کی عمر ہفتہ دس دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ خزاں کی یہ بہار چار روزہ ہی ہوتی ہے۔ موسم کے مزاج کی کیفیت آس پاس کی ریاستوں میں نشر ہوتی رہتی ہے اور سیاح دور دور سے بھی اس موسم بے گل ولالہ و نسرین و یاسمن کے جمال رنگ کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

نیو انگلینڈ جہاں اپنے قدرتی حسن و شادابی کے لیے مشہور ہے وہیں بہت سے باکمال بھی اپنے قیام سے اس کو وقار عطا کر گئے ہیں۔ رابرٹ فراسٹ اور مارک تو ئن جیسے مشاہیر۔ ہیریٹ بیچر جس نے غلامی کے نظام کے خلاف "انکل ٹام کا کیبن" نامی ناول لکھ کر غیر معمولی پذیرائی حاصل کی۔ تنہا تنہا ایملی ڈکنسن اور محفل محفل سلویا پلاتھ دونوں اپنے اپنے رنگ کی شاعری میں ایک مثال۔ اور بھی کئی بڑے نام ہیں جن کا کچھ نہ کچھ تعلّق اور واسطہ اس علاقے سے رہا ہے۔

جب بھی امریکہ جاتی ہوں میرے بچّے مجھے امریکہ کے اندر ہی کسی نہ کسی اور دنیا میں بھی پہنچا دیتے ہیں۔ زبیر اور صبیحہ ہمیں دور دراز علاقوں تک بھی لے گئے ہیں جہاں وقت کبھی ڈھائی گھنٹے کبھی تین گھنٹے پیچھے ہوتا ہے۔ وہ سنگِ زرد کی وادی ہو یا بحرالکاہل کی طویل ترین ساحلی شاہراہ۔ جس کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے سجے سجائے شہر زیادہ تر سیاحوں سے آباد رہتے ہیں اور جن کے اپنے ہی آداب ہیں اور پھر کہیں پتھرائے ہوئے درخت، کہیں نوادرات کے انبار۔ ہمارے ہر سفر میں کوئی نہ کوئی حیرت انگیز اور حیرت فزا سفر بھی ہمارا منتظر ہوتا ہے۔

عزمی اور شعاع ایمرسٹ میں رہتے ہیں اور ہماری مدارات کا اہتمام دوسری طرح کرتے ہیں۔ وہاں جاذبِ نگاہ سیر گاہوں کی تو کوئی کمی ہی نہیں ہے جن کے نام عزمی نے ''دامانِ کوہ'' شکر پڑیاں' باغ جناح' راول ڈیم وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ نیو انگلینڈ کے علاقے میں جو دوسرے قابلِ دید مقامات اور حاصلِ دید مکانات ہیں ان کا تعلق اہل علم اور اہلِ قلم سے ہے۔ اس لیے ان کی زیارت میں اشتیاق کے ساتھ کچھ کچھ عقیدت اور کچھ کچھ محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ قریہ' عاشقانِ پاک طینت کا ہے۔

یہ سب یادیں حکایتیں اپنی جگہ' ابھی تو میں بہار رنگ' خزاں کے شہر میں ایملی ڈکنسن اور سلویا پلاتھ کے تضاد رنگ کو دیکھ رہی ہوں۔

ایملی ڈکنسن کے گھر میں شعاع کے ساتھ گئی۔ سنگ وخشت سے بنا ہوا یہ دو منزلہ مکان ایملی کے دادا کا تھا۔ (امریکہ میں مکانات کی تعمیر میں عموماً'' لکڑی ہی استعمال کی جاتی ہے) اس گھر میں ۱۸۳۰ء میں وہ پیدا ہوئی۔ یہیں کسی پرچھائیں کی طرح رہی اور ۱۸۸۶ء میں اسی گھر سے اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔ اس کی نظم ہے۔

''چونکہ میں موت کے لیے رک نہیں سکتی تھی
اس لیے موت خود از راہِ کرم میرے پاس آکر ٹھہری
رتھ میں صرف ہم دونوں تھے
اور لامتناہی ابدیت''

یہ صاحب ثروت اثر و رسوخ والا خاندان کئی پشت سے ایمرسٹ میں آباد تھا۔ ایمرسٹ کالج بھی ایملی کے دادا سیموئل فاوٗلر ڈکنسن نے قائم کیا تھا۔ یہ خاندان اپنی سخاوت اور دردمندی کے لیے بھی مشہور تھا۔ ایملی کے دادا نے اپنی تمام دولت رفاہی کاموں میں صرف کردی۔ اس حد تک کہ تنگ دستی سے مجبور ہوکر آخر آخر یہ مکان بھی فروخت کرنا پڑا۔ جسے اپنی وکالت چمکنے کے بعد ایملی کے والد نے دوبارہ خریدا۔

یہ گھر جس میں شعاع کے ساتھ میں گئی تھی سادگی اور سادہ مزاجی کا مظہر تھا۔ مکینوں

سے خالی اس مکان میں سروسامانِ خانہ ابھی تک موجود تھا۔ اوپر کی منزل میں وہ کمرہ ہے جہاں ایملی ڈکنسن اپنی بے کراں تنہائیوں کا لمحہ لمحہ جھیلتی رہی تھی۔ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس لکڑی کی ایک چھوٹی سی کرسی رکھی تھی۔ جیسے وہ ابھی ابھی اُٹھ کر کسی کام سے گئی ہو۔ ویسے بھی مہمانوں کے سامنے کہاں آتی تھی۔ دیوار کے ساتھ وہ بڑی سی الماری تھی جس کی درازوں کے کونوں میں اور کپڑوں کی تہوں میں چھپا چھپا کر اپنی نظموں کے ورق ورق رکھتی رہی تھی۔ طعام خانے کی الماریوں کے گوشوں میں بھی یہ دولت بے بہا چھپائی گئی تھی۔

اس گھر کے سوئے سوئے ماحول میں اسے دیکھ لینا بھی کچھ ناممکن نہیں تھا۔ دبلی پتلی' سفید کپڑوں میں ملبوس' حیران سی' لب خاموش اور آنکھیں تنہائیوں کے سمندر پیے ہوئے۔ سو سال پہلے کی امریکی خاتون مجھے پرانے وقتوں کی کوئی مشرقی لڑکی نظر آئی۔ شرمیلی شرمیلی' گھبرائی گھبرائی' بے یقین بے نوا۔

ایملی ڈکنسن کی گوشہ نشینی خود اختیاری تھی۔ جس کی کئی وجوہ تھیں صحت کی خرابی کی وجہ سے اس کی تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ پہلے ایمرسٹ اکیڈمی اور پھر ماؤنٹ ہولیوک کے لڑکیوں کے مدرسے میں داخل ہوئی۔ لیکن صرف سترہ سال کی عمر تک وقفے وقفے سے اسکول جا سکی۔ اس بہانے جو دوست میسّر آجاتے ان سے بھی محروم رہی۔ اور سب سے بڑی اور اوّلین وجہ اس کے بچپن کی یہ بدگمانی رہی کہ وہ اپنی ماں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ ایک جگہ اس نے یہاں تک کہا ہے کہ "میری کوئی ماں کبھی تھی ہی نہیں۔" اس کی شاعری میں بھوک کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ بھوک اس کے یہاں محبت اور توجہ سے محرومی کا استعارہ ہے جس کا احساس اوائلِ عمر ہی سے رہا۔

صاحبِ حیثیت گھرانا تھا۔ اسبابِ زندگی کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن جہاں تک جذباتی آسودگی کا تعلق ہے ایملی ڈکنسن ہمیشہ مفلس رہی۔ ایک نظم میں اس نے لکھا ہے۔

"محبت روئی کی طرح ہے

جب پیٹ بھرا ہو تو ہمیں یاد بھی نہیں رہتی

اور جب فاقے کی نوبت آجائے

تو ہم اس کے خواب دیکھتے ہیں

اس کے گیت گاتے ہیں اس کی شبیہیں بناتے ہیں"

جذباتی طور پر وہ ہمیشہ ایک فاقہ زدہ بچہ رہی۔ اس کی ایک اور نظم ہے۔

"میں ہمیشہ بھوکی رہی

دانا دنکا جو میں نے چڑیوں کے ساتھ حصہ بانٹا

وہ صرف قدرت کے طعام خانے سے ملا"

شاید قدرت نے ایک بڑی شاعرہ کی تخلیق کے لیے یہ دکھ ضروری سمجھا۔ دراصل اس کی ماں اپنی ہی بیماریوں اور غموں میں گرفتار رہی۔ اپنے بچپن سے تین بچوں کی ماں بننے تک وہ لگاتار اپنے بہن بھائیوں کی موت کے صدمے سہتی رہی۔ یہ نو بہن بھائی تھے۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی اور پھر اس کی ماں کا بھی انتقال ہوگیا۔ دل کے زخموں نے اسے اپنے بچوں پر محبت نچھاور کرنے والی ماں بننے کا موقع ہی نہیں دیا۔

ایملی ابھی دو سال کی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ اس کی ماں نے اس خیال سے کہ نوزائیدہ کی پرورش اور اپنی بیماری کی وجہ سے وہ ایملی کا پورا خیال نہیں رکھ سکے گی' اسے کچھ عرصے کے لیے اپنی بہن کے گھر بھیج دیا۔ شاید یہیں سے لاشعوری طور پر ایملی کو اپنے ناقابلِ قبول ہونے کا یقین ہوگیا۔ خالہ کے گھر ایملی کی بڑی نازبرداری ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب واپس آئی تو شدید احساس محرومی کا شکار ہوگئی۔ اپنی کمزور اور بیمار ماں سے اسے وہ توجہ نہیں مل سکی جس کی وہ عادی ہوگئی تھی۔ یہی گم شدہ محبت تھی جس نے اس سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کروایا اور پھر تمام عمر دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر اسی محبت کو وہ اپنی شاعری میں تلاش کرتی رہی۔

ایک جگہ کہتی ہے۔

"پہلے ہمیں پیاس لگتی ہے کہ یہ قدرت کا قانون ہے
اور پھر جب پیاس سے ہماری جان لبوں پر آجاتی ہے
تو چند قطرے انگلیوں سے ہمارے منہ میں ٹپکا دیے جاتے ہیں۔"

یہ بھی کہا گیا کہ اس کی تنہا نشینی اس کی ناکام محبت کا نتیجہ تھی۔ جس شخص کو اس نے چاہا وہ عمر میں اس سے بڑا اور شادی شدہ تھا اور ایملی کے جذبۂ محبت سے آگاہ بھی نہیں تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کا محبوب محض اس کے تخیل کی تخلیق تھا۔

ایملی نے شادی نہیں کی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اس کا عدم تحفظ کا احساس بھی بڑھتا گیا اور لوگوں کی نکتہ چیں اور سوالیہ نگاہوں کا سامنا کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ سو برس پہلے امریکی معاشرے میں بھی عمر رسیدہ کنواری عورت چُبھتی ہوئی نگاہوں کی زد میں رہتی تھی۔ بیس سال کی عمر تھی جب اس نے دنیا والوں سے ترکِ تعلقات کو ترجیح دی اور اٹھائیس سال کی عمر تک قطعی گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

ایملی کے بھائی کا مکان قریب ہی تھا۔ بھاوج سے خوشگوار تعلّقات تھے' لیکن آخر آخر ان سے بھی ملنا ترک کردیا۔ اس عہد کے اہلِ قلم سے اس کے بھائی کے مراسم تھے۔ ایمرسن' لانگ فیلو' وھٹمر اور برائٹ وغیرہ اس دور کے اہم شاعر تھے جس وقت ایملی نے گوشہ نشینی اختیار کی اور اپنے آپ کو صرف خود کلامی کے لیے وقف کیا۔ یہ تمام شاعر معروف ہوچکے تھے اور ان کی شہرت اپنے ملک سے باہر تک پہنچ چکی تھی۔ ایملی کتابیں پڑھتی رہتی تھی اور ان میں سے کچھ شاعروں سے اس کی خط و کتابت بھی رہی لیکن وہ متاثر ان میں سے کسی سے بھی نہیں تھی۔

ایملی ڈکنسن کی زندگی میں اس کی کل سات نظمیں شائع ہوئیں۔ لیکن اس عہد کی شاعری کا جو مزاج تھا اس سے یہ نظمیں اس حد تک مختلف تھیں کہ ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل نہیں کرسکیں۔ ان تمام حالات کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک خول کے اندر سمٹتی چلی گئی۔ اور اپنی شاعری کو بھی ایک محبوب اور عزیز ترین راز کی طرح اپنوں اور غیروں سب

سے چھپاتی رہی۔ کیونکہ وہ تو اپنے آنسوؤں کی لڑیاں پرو رہی تھی۔ محبت' پذیرائی' اولاد اور خود مختار زندگی سے محرومی نے اسے اپنی ایک علیحدہ دنیا اپنے ذہن میں بسانے پر آمادہ یا مجبور کردیا تھا۔ اور اس کی سفید پوشی اس کے گرد ایک حفاظتی دیوار تھی۔

گوشہ نشینی کے باعث ایملی اپنی زندگی ہی میں ایک پراسرار اساطیری کردار کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ سوائے قریبی عزیزوں کے کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ صرف اس کی سوچ تھی جو اس کے پاس تھی۔ صرف اس کے اپنے الفاظ اس کے رازداں تھے۔ لیکن اسے اپنے احساسات اور اپنے الفاظ دونوں پر اعتماد تھا۔ شاعری کے مروّجہ طریقِ اظہار کو اختیار کرنا اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا کہ یہ صداقت سے انحراف ہوجاتا۔ اس کے پاس ایک مرصّع کار کا قلم نہیں تھا جو اس عہد کی روایت تھی۔ وہ صرف اپنے جذبوں کی انگلی تھام کر اپنی زندگی کا سفر پورا کرتی رہی۔

ایملی کی موت کے بعد اس کی بہن کو الماریوں کے کونوں اور درازوں میں اس کی نظمیں ملیں۔ یہ نظمیں دو ہزار سے زیادہ تھیں۔ جو اس کے مرنے کے چار سال بعد شائع ہوکر لوگوں تک پہنچیں اور انہیں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے اندازِ بیان کی سادگی اور صداقت نے اس کے ذاتی جذبات کو آفاقی حقیقت بنا دیا۔ اب اس شاعری کو زمانہ بھی نیا ملا تھا۔ اس شاعری میں فن کاری اور داد خواہی کی کوئی کاوش شامل نہیں تھی۔ اس کا طرزِ اظہار اپنے ہم عصروں سے قطعی مختلف تھا اور بیسوی صدی کی شاعری سے قریب تر۔ اس کی شہرت بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوئی۔ وہ جب تک جیتی رہی کہیں موجود نہیں تھی لیکن اپنی موت کے بعد صفحۂ روزگار پر زندہ ہوگئی۔ اپنے سادہ طریقِ اظہار میں وہ اتنی منفرد نظر آتی ہے کہ اسے اُنیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں گنا جاتا ہے۔

سلویا پلاتھ کو میں نے اسمتھ کالج میں تلاش کیا۔ کالج کی وسیع عمارت سلویا کے خوابوں کی طرح سامنے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ باہر سرسبز میدان کی گود میں سوئی ہوئی جھیل کے کنارے بیٹھ کر میں اس کی پرچھائیں تکتی رہی۔ بظاہر کھوئی کھوئی ایک خود شناس' خود آگاہ

لڑکی۔ ایک ناراض نوجوان عورت جو احتجاج کی گونجتی ہوئی آواز بن کر اپنے عہد سے آگے نکل گئی۔

سِلویا عمر میں ا یملی سے ایک سو دو سال چھوٹی تھی۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والی نسل کی نمائندہ تھی۔ میں نے ان دونوں کے تضاد رنگ کا ذکر کیا۔ سوچتی ہوں کہ زندگی کی ناکامیوں سے کام لینے میں تو دونوں یک رنگ رہیں۔ فرق تھا تو اتنا کہ ایک نے زندگی کو گھونٹ گھونٹ پیا۔ دوسری نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کردیا۔

ا یملی ڈکنسن کی شاعری اور زندگی دونوں میں ہمیں ایک مانوس مشرقیت ملتی ہے۔ اس کی شاعری کو اس کی زندگی کا روزنامچہ کہا جاسکتا ہے۔ سلویا پلاتھ کی شاعری اس کے اعترافات کی حیثیت رکھتی ہے جو اگرچہ اس کے اپنے احساسات و تجربات کی ترجمان تھی لیکن اس کے انداز بیان نے اس کے دکھوں کو صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ وہ اپنی شدت جذبات میں اپنے قاری کو بھی شریک کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر سچے اور بڑے شاعر کی شاعری اس کی سوانح عمری ہوتی ہے۔ لیکن صرف سوانح عمری ہی نہیں ہوتی۔ سلویا کی شاعری اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ وہ پہلی مغربی شاعرہ تھی جس نے پہلی بار کھل کر ایک باشعور مکمل عورت کے جذبات کو عورت کے نقطہ نظر سے پیش کیا۔ جب کہ ا یملی ڈکنسن کبھی مکمل عورت نہیں بن سکی۔ ترکِ دنیا کرکے وہ گویا دوبارہ رحمِ مادر میں پناہ گزیں ہوگئی تھی۔

سِلویا پلاتھ مَردوں کے قائم کردہ نظامِ حیات کی ناانصافیوں کے خلاف سراپا احتجاج تھی۔ اور اس حد تک کہ اس نے کچھ ایسی حدود بھی پار کرلیں جنہیں مغربی معاشرہ بھی مستحسن نہیں سمجھتا۔

خواتین کی شاعری میں نسائی زاویہ نگاہ کی جو تحریک چلی اسے نقطۂ عروج تک یقیناً" سلویا کی شاعری نے پہنچایا۔ اس نے عورت ہونے کے تمام سہانے اور ڈراؤنے منظر دیکھے اور برتے تھے۔ اور ان کو بیان کرنے کی جرأت بھی رکھتی تھی۔ ایک نظم میں کہتی ہے۔

"کسی دیوتا نے میرے بالوں کو جڑوں تک
گرفت میں لے کر مجھ پر قابو حاصل کرلیا
اور میں صحرا میں کسی سنت سادھو کی طرح
اس کے برقی شکنجے میں جُھلستی رہی"

اس نے عورت کی نامرادی اور مظلومی کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اگرچہ وہ شاعری میں مردانہ اور زنانہ خانوں کے خلاف تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ "میرا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ میں عورت پیدا ہوئی۔" کہتی ہے۔

"ایک مسکراہٹ گھاس پر گر گئی
اس کی واپسی ممکن نہیں"

سلویا پلاتھ ۱۹۳۲ء میں بوسٹن (میساچیوسٹس) میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ اوٹو (OTTO)بوسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ وہ نہایت سخت گیر انسان تھا۔ سلویا کی ماں سے اس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ وہ گھر کا مالک اور آقا تھا۔ جس کی توجہ اور خوشنودی حاصل کرنے کے حربے سلویا کو بہت کم عمری میں سیکھنا پڑے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی باپ کی محبت کا مرکز تھا لیکن وہ بہرحال ایک ایسا سائبان تھا جس سے محروم ہو جانے کا خوف اور بعد میں دکھ اسے ہمیشہ رہا۔

اس کی ماں ایک کمزور اور فرماں بردار عورت تھی۔ اس لیے سلویا نے اسے کبھی ایک مثالی ماں نہیں مانا۔ وہ اپنی ماں سے بیک وقت محبت اور نفرت کرتی تھی۔ جس کا ثبوت اس کی سوانحی ناول "دی بیل جار" سے ملتا ہے۔ جسے اپنی ماں کی دل آزاری کے خیال سے اس نے فرضی نام سے شائع کروایا تھا۔ اس کی موت کے بعد یہ کتاب اس کے اپنے نام سے شائع ہوئی۔ سلویا کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ اس کی ماں اس کے باپ سے نفرت کرتی تھی۔ باپ طاقت کی علامت تھا اس لیے کشش رکھتا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنی زندگی میں سلویا کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ سلویا نو سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوا۔ وہ اپنے پیچھے کوئی مالی امداد چھوڑ کر نہیں گیا۔ حالات ابتر تھے اور تمام ذمے داری

اس کی ماں پر آن پڑی تھی جس نے اپنے بچوں کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔
سِلویا کے باپ کا مکان بوسٹن کے قریب ونتھراپ میں سمندر کے سامنے تھا۔ ساحلِ سمندر پر موجوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی وہ بڑی ہوئی۔ شوہر کی وفات کے بعد سلویا کی ماں ملازمت کرکے بچوں کو پال رہی تھی۔ اس نے تھوڑے فاصلے پر ویلزلے میں ایک سستا مکان خرید لیا اور بچوں کے ساتھ وہاں منتقل ہوگئی۔ سلویا کے لیے پرانے اسکول کے ساتھی، پرانا ماحول اور سمندر کی موجیں سب کچھ چھوڑنا ایک تلخ تجربہ تھا۔ گویا باپ کی جُدائی کے ساتھ ہی اس کا بچپن بھی اس سے چھن گیا تھا۔ انہیں صدمات کا ہاتھ تھامے اس نے شاعری میں پناہ تلاش کی۔

نو سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک وہ ویلزلے میں رہی۔ اس کے بعد نارتھ ہیمپٹن میں اسمتھ کالج میں داخل ہوئی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ اسکول اور کالج دونوں میں بہترین رہا۔ اس کی نظمیں امریکہ اور انگلینڈ میں شائع ہورہی تھیں۔ سلویا اپنے عہد کی ایک بے خوف اور توانا آواز تھی جسے نظرانداز کردینا ممکن نہیں تھا۔ اسے مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی لیکن وہ اپنی کامیابیوں سے مطمئن کبھی نہیں رہی۔ اس نے اپنی زندگی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اتنی زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ وہ مسلسل مایوسیوں کا شکار ہوتی رہی۔ ایک خط میں اپنے بارے میں لکھا ہے۔ "وہ لڑکی جو خدا بننا چاہتی تھی۔" اسی وجہ سے ہمیشہ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار رہی۔ کئی بار دماغی مریضوں کے اسپتال میں بھی داخل کی گئی جہاں برقی جھٹکوں کے ذریعے علاج اتنا اذیت ناک ہوتا تھا کہ اسپتال سے واپس آنے کے بعد بھی خوف زدہ رہتی تھی جس کا ذکر اس نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔

شاید یہ عدم تحفظ اور تنہائی کے احساس کی شدت تھی کہ اس نے شہرت اور مقبولیت کی معراج حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے لیے اپنی ذہنی صلاحیت اور جسم دونوں کو داؤ پر لگا دیا۔ لیکن سِلویا پلاتھ کی شہرت اور مقبولیت بامِ عروج پر اس کی خودکشی کے بعد پہنچی۔ یہ ایسا المناک واقعہ تھا جس نے اس کی شعری تخلیقات کے گرد ایک زرّیں

بالہ بنادیا۔ جس سے گزر کر ہی اس کے اشعار کی معنویت اور اس کی حقیقت کرب تک پہنچا جا سکتا ہے۔

تنہائی کا احساس نو دس سال کی عمر میں باپ کی موت سے شروع ہوا اور تمام عمر اس کے ساتھ رہا۔ اکیس سال کی عمر میں بھی اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن بچالی گئی تھی۔ اور عرصے تک نفسیاتی علاج کے لیے اسپتال میں داخل رہی۔

اس بیماری سے صحت یاب ہو کر وہ جنسی تجربات پر بھی آمادہ ہوگئی جن سے اب تک اجتناب کرتی رہی تھی۔ شاید محض تجربے کی خاطر یا شاید محبت کی تلاش میں۔ اب اس کی سہیلیوں کی شادیاں ہو رہی تھیں اور وہ جو اپنے آپ کو سب سے اہم اور سب کے لیے قابلِ رشک سمجھتی تھی ابھی تک شادی کی پیشکش سے محروم تھی۔ اس کے ان تجربات اور تعلقات میں شادی کی توقع بھی موجود تھی۔ ایک گھر اور بچّوں کی آرزو۔ اور اس کو اپنی نامقبولیت کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھی۔ کسی میدان میں بھی کسی سے پیچھے رہنا ناقابلِ برداشت تھا۔ اسے بہرحال اپنی فتوحات سے سروکار تھا۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جو مرد اس کے نزدیک آئے وہ اس کی بے باکی اور ذہانت دونوں سے خائف ہو کر پیچھے ہٹتے گئے۔

اس عرصے میں اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے فل برائٹ وظیفہ مل گیا اور وہ کیمبرج چلی گئی۔ کیمبرج میں بھی وہ ایک مثالی شوہر تلاش کرتی رہی۔ آخر اس کی ملاقات ایڈورڈ ہیو (ٹیڈ) سے ہوئی جو شاعر تھا اور ہر لحاظ سے سلویا کی پسند کے پیمانے پر پورا اترا۔ ۵۶ء میں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اگلے سال دونوں میساچیوسٹس واپس آگئے جہاں گزر اوقات کے لیے سلویا نے اسمتھ کالج میں ملازمت کرلی۔

اس نے مثالی بیوی کا کردار ادا کیا۔ اپنے شوہر کو بہت سی اہم شخصیتوں سے متعارف کروایا۔ اس کے مسوّدے خود ٹائپ کرتی تاکہ اسے لکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ ملازمت کے علاوہ گھرداری کے تمام کام بھی اکیلی انجام دیتی رہی اور ٹیڈ کو شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے تمام مواقع فراہم کیے۔

آمدنی بہت کم تھی اس لیے اپنے پہلے بچّے کی پیدائش سے قبل دونوں دوبارہ انگلینڈ

چلے گئے۔ سلویا کو یقین تھا کہ اب ٹیڈ بھی کوئی ملازمت حاصل کرلے گا۔ لیکن وہ اپنی شہرت اور کامیابیوں کے نشے میں سرشار تازہ تخلیقات میں مصروف رہتا۔ گھر کے اخراجات کی پوری ذمے داری اس نے سلویا پر چھوڑ دی تھی۔ ایسے میں بچی کی پیدائش سلویا کی زندگی کا نہایت اہم اور خوش گوار موڑ تھا۔ جیسے اس نے اپنے آپ کو پالیا ہو۔ اس کی پیدائش سے پہلے اس نے ایک نہایت دل آویز نظم لکھی تھی۔ بعد میں بھی کئی نظمیں لکھیں لیکن اب اس کے کاموں میں اپنی بیٹی کی پرورش اور پرداخت کی مصروفیات کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اور وہ اب بھی اپنے شوہر کے مسودات ٹائپ کر رہی تھی۔

دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد بے انتہا تھکن کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی۔ اپنے تخلیقی کام کے لیے اب اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ جس نے اسے تسکینِ دل و جاں سے بھی محروم کر رکھا تھا لیکن ٹیڈ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس کی ایک نظم کے دو مصرعے ہیں۔

اتنی سرد مہری اور تغافل
خوش فہمیوں کے تمام پرت اتر چکے ہیں

بیمار اور تھکاوٹ سے چور چور جسم کے ساتھ وہ تمام فرائض انجام دیتی رہی۔ کہتی ہے۔

"مرجانا
دوسرے فنون کی طرح ایک فن ہے
میں اس فن میں غیر معمولی مہارت رکھتی ہوں"

لیکن جب اسے اپنے شوہر کی بے وفائی کا علم ہوا تو اس کی طاقت برداشت ختم ہوگئی۔ اس شادی کا انجام چھ سال بعد طلاق پر ہوا اور وہ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ بحیثیت شاعر اور عورت جس مثالی زندگی کا خواب اس نے دیکھا تھا وہ عمر بھر پورا نہ ہوسکا۔ ایک نظم میں کہتی ہے۔

"ایک اکیلی چھوڑدی گئی عورت
جو ایک دائرے میں اپنے سائے کو گھسیٹتی پھر رہی ہے"

اس بار اپنی شکست کا گھاؤ بھی تھا۔ جس نے اس کی زندگی کو جیسے نچوڑ کر ختم کر دیا۔ اس کی آخری نظموں میں موت کا ذکر بار بار آتا ہے۔

طلاق اور علیحدگی کے بعد سلویا نے تقریباً" ہر روز ایک نظم لکھی۔ اس کے ایک ناقد کا خیال ہے کہ "سلویا کی شاعری اتنی بڑی نہیں تھی جتنا بڑا ڈرامہ اس کی زندگی تھی۔ البتہ اپنی زندگی کے آخری پانچ سال میں اس نے بڑی شاعری کی ہے جو منفرد بھی ہے۔" اس کا دوسرا شعری مجموعہ "ایریل" جو وہ ترتیب دے رہی تھی اس کی موت کے بعد ۶۵ء میں شائع ہوا۔

فروری ۶۳ء کی گیارہ تاریخ تھی جب اس نے خود کشی کی۔ اس کی چار فروری کی ایک نظم ہے۔

دل تھم گیا ہے
سمندر کی لہریں پیچھے ہٹ گئی ہیں
آئینوں پر چادریں ڈال دی گئی ہیں

(پرانی قوموں میں دستور تھا کہ کسی کی موت واقع ہوتی تو آئینے ڈھانپ دیے جاتے تاکہ موت کسی اور روح کو نہ دیکھ لے)

اس سال لندن شدید برفانی طوفانوں کی زد میں تھا جو ڈیڑھ سو سال کے بعد آیا تھا۔ ہڈیوں میں پیوست ہو جانے والی سردی میں دو بچوں کے ساتھ وہ بے سہارا تھی اور بیمار۔ بجلی کا نظام معطّل ہو چکا تھا۔ گھر کو روشن اور گرم رکھنا ناممکن تھا۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا تھا اور برف کے انبار میں موٹر چلانا دشوار تھا۔ حالات ناقابلِ برداشت ہو چکے تھے۔ جینا دو بھر تھا اور مرجانا آسان۔

اس نے بچوں کے بستر کے قریب دودھ کے گلاس رکھے۔ دروازے تولیے لگا کر بند کیے

اور باورچی خانے میں جاکر گیس کا چولھا کھول دیا۔ سلویا پلاتھ کی آخری نظم جو اس نے پانچ فروری کو لکھی اس کا عنوان ہے "آخری کنارا" اس نظم کے ابتدائی مصرعے ہیں۔

"عورت نے اپنی تکمیل کا مقام حاصل کرلیا ہے
اس کا بے جان جسم
کاملیت کی مسکراہٹ کا غماز ہے۔"
اسی نظم میں آگے چل کر کہتی ہے۔

"اس کے ننگے پَیر
جیسے کہہ رہے ہوں
ہم نے طویل سفر طے کیا ہے
سفر تمام ہوا۔"

اس کی موت کے بعد ان مصرعوں نے بے پایاں شہرت حاصل کی۔
ان دونوں خواتین کا تعلق میرے اپنے قبیلے سے ہے۔ وہ مغربی معاشرہ تھا اور اپنا اپنا ردعمل۔میرے دیس میں تو مدتوں' پہلی سانس لینے سے قبل بھی عورت زندگی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوتی رہی ہے۔

آمش

مجھے ایک اور امریکی قبیلہ یاد آ گیا۔

سویرے سویرے شہر کے اسپتال جانے کے لیے ڈاکٹر گھر سے نکلتا۔ آس پاس رہنے والے اپنے اپنے زرعی علاقوں اور کھیتوں کو جاتے ہوئے ملتے ایک مسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا اور بس۔ بڑے بے ضرر قسم کے پڑوسی تھے۔ طبعاً" خوش اخلاق' نرم مزاج' چہروں پر طمانیت اور ایک خاص قسم کی بے نیازی کی چھاپ۔ ملتے بھی نہیں تھے کھنچتے بھی نہیں تھے اور کسی کو ان کی طرف بڑھنے کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ صرف اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ شہر میں ڈاکٹر کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا اس لیے ان شناسا اجنبی چہروں کے درمیان رہنا دل پر بوجھ نہیں بنتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر کو ایک عجیب سی نامعلوم خلش محسوس ہوئی۔ جیسے اس کے روزمرہ کے معمول میں کوئی رخنہ آ گیا ہو۔ مصروف انسان تھا زیادہ توجہ نہیں دی لیکن خلش بڑھتی گئی۔ کئی دن بعد اچانک یاد آیا کہ وہ پندرہ سولہ سال کی شگفتہ چہرے اور بولتی ہوئی آنکھوں والی نسبتاً" شوخ سی لڑکی جو ہر صبح پڑوس کے گھر سے نکلتے ہی اس کو صباح الخیر کہتی تھی ڈیڑھ دو ہفتے سے نظر نہیں آئی تھی۔

برسوں کا پڑوس تھا۔ سالہا سال کا خاموش' غیر رسمی اور اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے خوشگوار ساتھ تھا۔ ڈاکٹر سے رہا نہ گیا۔ پڑوسی کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ فوراً" ہی کھل گیا۔ سامنے وہی جانا پہچانا چہرہ تھا جس کے ساتھ ڈاکٹر نے ایک عمر بسر کی تھی۔

"بچی کیسی ہے؟ باہر کیوں نہیں آتی؟"

ڈاکٹر نے بے ساختہ سوال کیا۔

"شارزینے؟ وہ بیمار ہے" باپ نے جواب دیا۔

گویا سِن رسیدہ ڈاکٹر کی تشویش بے جا نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی لڑکی کے علاج کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جن کو بڑے اخلاق اور اعتراف تشکر کے ساتھ ٹال دیا گیا۔ پڑوس کا ساتھ بہت دنوں کا سہی لیکن درمیان میں جو اجنبیت کی دیوار تھی وہ بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ ڈاکٹر کی اپنی مصروفیات تھیں لیکن اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے اسے بیمار لڑکی یاد آجاتی۔

آخر اس کے دل نے فیصلہ کیا۔ پھر اس دروازے پر دستک دی اور اس مرتبہ ان لوگوں کے اور اپنے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر لڑکی کے طبی معائینے پر اصرار بھی کیا۔ اس بار لڑکی کا باپ اپنے ہی اخلاق کے تقاضے کے آگے مجبور ہو گیا۔ معائنہ ہوا۔ لڑکی کو کینسر تھا۔ حالت ایسی تھی کہ اسپتال میں فوراً داخلہ ضروری تھا۔ لیکن اس کے باپ کو اس اقدام پر راضی کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تو مرض کی تباہ کاریوں سے آشنا ڈاکٹر نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی مجبوری بتائی اور انسانی جان بچانے کی کوششوں اور ذمہ داریوں کے بارے میں محکمۂ صحت اور عدالت کی روایات کا ذکر بھی کیا۔ لیکن تمام واضح اور غیر واضح اشاروں کے باوجود ڈاکٹر اس گھر کے کسی فرد کو بھی جدید طبی سہولتوں کے ساتھ لڑکی کے باقاعدہ علاج پر آمادہ نہیں کر سکا۔ یہاں معاملہ صرف اصولوں کا نہیں دِین کا بھی تھا۔ غم زدہ باپ آمش فرقے کے دِین سے انحراف نہیں کر سکتا تھا کہ دکھ اور بیماری سب اللہ کی طرف سے ہے اور وہی قادر مطلق مداوا بھی کرتا ہے۔ اور زندگی کا سفر بہرحال جاری رہتا ہے اور حیات فانی کے بدلے حیات جاودانی خسارے کا سودا نہیں ہے"

حیرت ناک بات یہ تھی کہ وہ لڑکی خود بھی کسی قسم کا ڈاکٹری علاج کروانے پر رضامند نہیں تھی۔ اُدھ کِھلا پھول مُرجھا رہا تھا اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھنے پر مجبور تھیں۔ چارہ

گر اتنا بے بس تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ چند ہفتے بعد لڑکی کا انتقال ہو گیا۔

یہ قصہ صبیحہ نے ورجینیا کے ایک نہایت شاداب اور غیر آباد علاقے سے گزرتے ہوئے موٹر میں مجھے سنایا۔

واشنگٹن شہر اور اس کے آس پاس کے مشہور قابل دید مقامات جو سیاحوں کے لیے کشش رکھتے ہیں میں نے ۶۸ء سے اب تک کئی بار دیکھے ہیں اور اب وہ میرے لیے اپنی کشش کھو چکے ہیں۔ بس اسمتھ سونین نمائش گاہ کے سلسلے کی عمارت ہے جس میں ایک بار داخلہ اپنے ہر قیام کے زمانہ میں مجھ پر لازم سا ہو جاتا ہے۔ یہ عمارت سائنسی انکشافات اور علم و دانش کی فتوحات سے متعلق ہے۔ یہاں تمام ایجادات کے تدریجی مراحل کے نمونے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اور انسانی ذہن کی تازہ ترین فتوحات کے ماڈل بھی۔ اب تو اپنے بچوں اور ان کے بچوں کو دیکھنے کی خاطر عموماً ہر دو سال کے بعد امریکہ جانا ہوتا ہے لیکن جب بھی اس نمائش گاہ میں جاتی ہوں کوئی نہ کوئی حیرت انگیز اور دلچسپ اضافہ ملتا ہے۔ شوق و جستجو کے سفر کا کوئی اور مرحلہ' سعی اور عزم کی رسائی کے کچھ اور پہلو نگاہوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ خلائی شٹل کا جدید ترین ماڈل' یا کسی تازہ خلائی سفر کی متحرک تصویر جس میں دیکھنے والے بھی وقتی طور پر شریک سفر ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہوئے انسان کا ایک نہ ایک واضح نقشِ قدم آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

جس کہانی کی ابتداء انسان کی حیرتِ اوّلین سے ہوئی تھی وہ آج بیسویں صدی کے اواخر تک انسان کی وسعتِ علم اور اس کے حوصلۂ تسخیرِ کائنات کی تفسیر و تشریح بَن کر داد طلب بھی ہے اور مسحور کن بھی۔ اس جگہ پہنچ کر یقین آجاتا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے باوجود انسان ابھی تک اشرف المخلوقات ہے شاید کبھی محبت کی حکمرانی پر بھی اسے یقین آجائے۔ خلا میں بے وزن انسان کے قیام و خرام کی فلم کے علاوہ بھی عناصر پر انسانی ذہن کی روز افزوں کامرانیوں کے بارے میں کئی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ نہ دیکھنے والے کم ہوتے ہیں نہ دکھانے والے تھکتے ہیں۔ وہاں قومی حیثیت کی کسی عمارت میں داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیشہ ان تمام عمارات کے اندر میلے کا سا سماں رہتا ہے۔

واشنگٹن میں بس ایک سرکاری عمارت ہے جو متعدد بار اس شہر میں قیام کے باوجود میں نے آج تک نہیں دیکھی اور کبھی دیکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔ وہ امریکی صدر کی رہائش گاہ قصرِ ابیض ہے۔ جس کا ایک حصّہ نمائش کے لیے مخصوص ہے۔

یہ عمارت صبیحہ کے پہلے گھر سے کچھ دور بھی نہیں تھی۔ ہر روز ہمیں لوگوں کی ایک طویل رینگتی ہوئی قطار اس سفید مکان کے پاس نظر آتی تھی۔ رہنما کتاب میں لکھے ہوئے مقامات دیکھے جا چکے۔ چنانچہ اب ہمارے واشنگٹن قیام کے عرصے میں معمول یہ ہے کہ صبیحہ اور زبیر ہم دونوں کو کوئی پرائیوٹ آرٹ گیلری' کوئی خوبصورت وادی' آبشار اور پارک' قدرتی یا مصنوعی جھیل' غیر آباد محلات اور شاداب ویرانے دکھانے لے جاتے ہیں۔ موٹر کے ذریعے یہ آوارہ خرامی قریبی ریاستوں ورجینیا' میری لینڈ' فلاڈیلفیا وغیرہ کے مختلف علاقوں تک دن بھر میں بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی ایک خاموش علاقے میں جہاں عموماً" سیاحوں کی آمدورفت نہیں ہوتی ہم نے ایک سیاہ گھوڑا گاڑی سڑک پر گزرتی دیکھی جس میں ایک باریش آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

امریکہ میں گھوڑا گاڑی دیکھ کر جو ہماری اگلے وقتوں کی بگھی سے ملتی جلتی تھی مجھے بڑا تعجب ہوا تھا۔ صبیحہ نے بتایا کہ یہ ایک شدّت پسند مذہبی فرقہ ہے جو سائنس کی ایجادات کو اللہ کے قانون سے انحراف سمجھتا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں بجلی یا مشینوں کا استعمال ناجائز ہے۔ یہ فرقہ آمش کہلاتا ہے۔ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں آباد یہ قبیلے غیر آمش لوگوں سے میل جول بھی نہیں رکھتے۔ آمش لوگوں کے بارے میں صبیحہ نے اتنی ناقابلِ یقین روایتیں بیان کیں کہ ان سے وہی دلچسپی پیدا ہوگئی جو اساطیر سے ہوتی ہے اور داستانوں کے جیتے جاگتے کردار نزدیک سے دیکھنے کا اشتیاق ہونا ہی تھا۔ میں ان لوگوں سے ملنا اور ان کے گھروں میں جھانکنا چاہتی تھی۔ میری حیرت اور دلچسپی اس لیے نہیں تھی کہ یہ سادہ رہن سہن میرے لیے انوکھا تھا۔ میرے وطن کی آبادی کا زیادہ حصّہ آج بھی اور آج تک اسی طرزِ رہائش پر مجبور بھی ہے اور قانع بھی۔ مٹی کے تیل سے روشن مکانوں اور جڑی بوٹیوں میں ہر مرض کی شفاء ڈھونڈنے اور پھر مولا کے حکم پر

راضی بہ رضا رہنے والوں سے میرا بندھن تو بہت پرانا اور بڑا قریبی ہے۔ یہ سب کچھ عجوبہ تو امریکہ کے حوالے سے بن گیا تھا۔ سائنس کی جدید ایجادات نے جو سہولتیں انسان کو مہیا کی ہیں یہ تو ارادتاً" ان سے احتراز اور اجتناب تھا۔ یہاں کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ایک نہایت ترقی یافتہ ملک کے ایک آسودہ حال فرقے کا یہ رویّہ ایک انہونی سی بات تھی۔ آسائشوں کو ٹھکرا دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

انہیں دنوں میں عزمی کے پاس ایمرسٹ چلی گئی۔ میرا یہ انجینئر' بیٹا اپنی فرصت کے لمحات رنگوں اور لفظوں کی دنیا میں بسر کرتا ہے۔ مصوری کا شوق ہے۔ زبان غیر میں شعر بھی کہتا ہے۔ افسانے لکھتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تحریریں وہاں کے جرائد میں شائع بھی ہو جاتی ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب کی کتابوں کا بڑا خوبصورت انتخاب گھر میں موجود ہے۔

جب شعاع یونیورسٹی اور عزمی دفتر چلے جاتے تو میں اور نور ان کتابوں میں غرق رہتے۔ جب شام کو دونوں واپس آتے تو ہماری گفتگو بھی انہیں کتابوں کے بارے میں ہوتی۔ ہمارے ذوق اور فرمائش کے مطابق مزید کتابیں کسی نہ کسی لائبریری سے بھی آتی رہتی ہیں۔ عزمی کے گھر ہم دونوں کا یہی دستور العمل ہے۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے' علمی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ صبیحہ اور زبیر کے پاس بھی ہے۔ عصری لٹریچر کے علاوہ عربی و فارسی کلاسیکی ادب کے انگریزی تراجم بھی اور خصوصاً" اقبالیات کے سلسلے کی تصانیف۔ زبیر کلامِ اقبال کے عاشق بھی ہیں اور حافظ بھی۔ مشاہیر کی سوانح عمری بھی زبیر کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ہمیں کتابوں کی کمی ان کے گھر بھی نہیں ہوتی لیکن ایمرسٹ کی طرح دیگر کتب خانوں کی وہ سہولت نہیں ہے کہ تنگیٔ داماں کا گلہ ہو جائے۔

میساچیوسٹس کا یہ پورا علاقہ اعلیٰ ترین جامعات اور درس گاہوں کے لیے مشہور ہے۔ ایم آئی ٹی اور ہارورڈ یونیورسٹی بوسٹن شہر کے مضافات میں کیمبرج کے علاقے میں ہیں۔ اور ایمرسٹ کو پانچ درس گاہوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ ہیمپشائر۔ ماؤنٹ ہولیوک۔ ایمرسٹ اور اسمتھ کالج کے علاوہ یونیورسٹی آف میساچیوسٹس۔ طلبہ کو ان تمام درس گاہوں کے کتب خانوں سے استفادے کے لیے ہر قسم کا تعاون حاصل رہتا ہے۔ ضرورت

مندوں کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں لکھی ہوئی ہر قابلِ ذکر اور لائقِ مطالعہ کتاب سب سے پہلے اس شہر کی لائبریری میں پہنچتی ہے۔

میساچیوسٹس یونیورسٹی کی لائبریری دو لاکھ مربع فٹ میں پھیلی ہوئی چھبیس منزلہ عمارت ہے۔ اس لائبریری کے مستقل کُل وقتی ملازمین صرف سترہ افراد ہیں۔ کیونکہ پورا نظام کمپیوٹر کے تحت ہے۔ تقریباً" سو طلبہ رضاکارانہ جز وقتی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس کتب خانے میں بیس لاکھ سے زیادہ علمی کتب اور ان کے علاوہ مخطوطے' اشاریے اور مائکرو فلمیں طلبہ کے افادے کے لیے موجود ہیں۔ یہ لائبریری ہفتے میں سو گھنٹے کُھلی رہتی ہے شب و روز کے دورانیے میں تقریباً" پندرہ گھنٹے۔ اور اس پورے وقت میں آباد بھی رہتی ہے۔

ہوشمند لوگوں میں علم کی قدر و قیمت کی مثال اس واقعے سے ملتی ہے کہ جب اس لائبریری کی صفائی اور ترتیبِ نو کا کام شروع کیا گیا تو چار ہزار رضاکاروں نے یہ تمام خدمات انجام دیں۔ جن میں ممبران' ملازمین' اساتذہ اور موجودہ اور فارغ التحصیل طلبہ کے علاوہ عام شہریوں نے بھی حصّہ لیا۔ مالی امداد بھی دی' مزدوری بھی کی اور رضاکارانہ خدمت کی قابلِ فخر اور قابلِ تقلید مثال قائم کی۔

۸۶ء کے موسم گرما میں جب میں ایمرسٹ پہنچی تو آمش قبیلے کی کُرید لگی ہوئی تھی۔ بچوں سے ذکر کیا۔ میں اس کوچے کا پھیرا لگانے پر مصر تھی۔ پتہ چلا کہ اس فرقے کے بارے میں لٹریچر موجود ہے۔ جس سے ان کی کسی نزدیک ترین بستی کا پتہ مل سکتا ہے۔ خیال تھا کہ وہیں کہیں آنکھ اوٹ ایسی کوئی آبادی موجود ہوگی۔

ایمرسٹ میں ہمیں عزیز نت نئے مقامات دکھاتے ہی رہتے ہیں۔ ہر مرتبہ میرے قیام کے موقع پر وہ پہلے ہی سے کوئی نہ کوئی تاریخی یادگار تلاش کر رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ تلاش کا کام شجاع نے کیا۔ مجھے ساتھ لے کر پانچوں لائبریریوں کے چکّر لگائے۔ کبھی کتاب نہیں ملی کہیں ملی تو اس سے ان کا پتہ دست یاب نہیں ہو سکا۔ آخر کامیاب تو ہونا ہی تھا مگر کالجوں سے یونیورسٹی تک جستجو کا اپنا یہ سفر مجھے اچھا لگا۔ اس ماحول میں پاکیزگی

تھی، اعتماد تھا، امنگیں تھیں۔ یہاں آنکھوں کے سامنے انسان کی نئی نسل تھی۔ گورے، کالے، سانولے سب چہرے حرف دعا کی طرح روشن یہاں ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یہ سب تہذیب انسانی کے نمائندے تھے۔

مطلوبہ کتاب مجھے مل گئی۔ معلوم ہوا کہ آمش علاقے ایمرسٹ کے مقابلے میں واشنگٹن سے زیادہ نزدیک ہیں۔ ان دونوں شہروں کے درمیان ایک گھنٹے کی پرواز کا فاصلہ ہے۔ میں واشنگٹن پہنچی تو صبیحہ اور زبیر پنسلوینیا میں لنکا سڑ کاؤنٹی لے گئے۔ جسے امریکہ کے باغات کا علاقہ کہا جاتا ہے۔

امریکہ میں آمش بستیاں مختلف شہروں اور علاقوں میں آس پاس کی آبادی سے الگ تھلگ بسی ہوئی ہیں۔ ڈیلاویر، فلوریڈا، انڈیانا، کین ٹکی، مسوری، نیویارک، پنسلوینیا، اوہایو، اوکلاہاما، ٹنی سی، وسکانسن اور ان کے علاوہ دوسرے مقامات۔ خاص طور پر اوہایو، انڈیانا اور پنسلوینیا میں ان کی بہت بڑی آبادیاں ہیں کنیڈا کے بعض شہروں میں بھی یہ قبیلے آباد ہیں۔ آمش بستیوں میں کہیں کہیں عام لوگوں کے اِکّا دُکّا مکان بھی اب تک موجود ہیں۔ دوسرے عقیدے والوں سے میل جول اس خاص مذہب میں ممنوع ہے۔ لیکن امن پسند اور منکسرالمزاج لوگ ہیں۔ اس لیے اچھے پڑوسی ثابت ہوتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں آمش لوگوں نے امریکہ میں آباد ہونا شروع کیا۔ جن میں برطانیہ، جرمنی، ہالینڈ، سوئزرلینڈ، فرانس اور اسکنڈے نیویا کے تارکینِ وطن تھے۔ ترکِ وطن کی وجہ اور مجبوری ان کے مخصوص اور شدید مذہبی عقاید تھے۔ یہ شدّت پسند مذہبی فرقہ سولھویں صدی میں سوئزرلینڈ میں وجود میں آیا تھا۔ رومن کیتھولک مذہب سے آمش عقیدے کے بہت زیادہ اور سخت اختلافات تھے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کا آغاز ایک رومن کیتھولک پادری نے کیا۔ سترھویں صدی کے آغاز تک اس انتہا پسند مذہب کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ اس کے اثرات یورپ کے دوسرے ممالک تک پہنچ گئے اور ان کے گروہ بھی قائم ہوگئے۔

آمش مذہب کا عیسائی مذہب سے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ آمش ناسمجھ بچوں کے

بپتسمہ کے خلاف ہیں۔ ان کا خیال اور یقین ہے کہ عقل و شعور سے عاری چھوٹے بچّوں کو اس رسم کی ادائیگی کے تحت عیسائی مذہب میں داخل اور قبول کرنا اصولی طور پر غلط ہے۔ یہ رسم بچّوں کے جوان ہونے کے بعد ادا ہونی چاہیے تاکہ وہ سوچ سمجھ کر پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ اپنے دین کو قبول کریں اور اس پر عمل پیرا رہیں۔

رومن کیتھولک مذہب کے اور بھی بہت سے اصولوں اور طریقوں سے انہوں نے انحراف کیا اور تبدیلیاں کیں۔ مذہب میں تحریف بہت بڑا اقدام تھا۔ چنانچہ چرچ کی طرف سے یہ فرقہ عبرت ناک سزاؤں کا مستحق ٹھہرا۔ ان کو ہر طرح سے تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ یہاں تک کہ یہ لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔

لنکاسٹر میں جو آمش آباد ہیں وہ زیادہ تر جرمنی اور ہالینڈ سے آئے تھے۔ ان کی زبان جرمن اور ڈچ ملی ہوئی انگریزی ہے جسے سمجھنے کے لیے عام آدمی کو کوشش کرنا پڑتی ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اس لیے اس علاقے کی شادابی میں ان کا بڑا حصّہ ہے اور اس خطۂ زمین پر قدرت بھی مہربان ہے۔ مغربی کنارے پر سک ہان (Sasque Hanna) دریا، شمال مغربی اور جنوب مشرقی اطراف میں پہاڑیاں جن کی ڈھلانوں پر سبز چادر بچھی ہوئی، درخت ہاتھ میں ہاتھ تھامے ہوئے، جگہ جگہ قدرتی چشمے اور جھیلیں اور میدانی علاقے میں پانی کی وافر موجودگی کے علاوہ دہقان کا پسینہ ہے جس نے اس علاقے کو غیر معمولی حسن اور شادابی عطا کی ہے۔

جس شاہراہ پر ہماری موٹر جارہی تھی وہ امریکہ کی ایک عام سی رہ گزر تھی۔ کہیں دکانوں کی رونقیں، کہیں سبزہ زار میں خوابیدہ مکان اور کہیں دورویہ درختوں کی قطاریں۔ واشنگٹن سے ہماری منزلِ مقصود دو ڈھائی گھنٹے کے فاصلے پر تھی۔ نزدیک پہنچے تو سبزہ کچھ اور شاداب اور اشجار کچھ اور نکھرے ہوئے نظر آئے۔ آگے ہمارے راستے کے دونوں جانب لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ چراگاہ میں مویشی اور مرغیاں اور کچھ دور ایک بگھی نظر آئی۔ اگر ان کا لباس اتنا غیر معمولی نہ ہوتا تو اپنے دیس کے کسی گاؤں کا گمان ہوتا۔

امریکہ جیسے ملک میں دو سو سال سے یہ قدامت پسند مذہب پرست فرقہ کوئی تبدیلی کسی قسم کی آسائش قبول کیے بغیر بسر کر رہا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ آسانیاں اور سہولتیں عیش پسندی کی علامت ہیں اس لیے ترکِ راحت ہی عین مذہب ہے۔ زندگی صرف اللہ کے واسطے اور مذہب کی پیروی میں گزارنا چاہیے جس کا اظہار لباس' مکان' رہائش اور کام ہر طریقے سے لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق اور رازق ہے اس لیے آمش لوگوں نے مجموعی طور پر زراعت کا پیشہ اختیار کیا اور زمین کی کوکھ سے روزی پیدا کرتے ہیں۔ وہ رحیم و کریم ہے اس لیے یہ لوگ نرم خو اور آشتی پسند ہیں۔

جدید دنیاوی علوم حاصل کرنا ان کے یہاں ترک مذہب کے مترادف ہے ان کا کہنا ہے کہ "دنیاوی دانش آخرت کا زیاں ہے۔" آمش عقیدے میں سگرٹ' شراب' رقص و سرود' تھیٹر اور سینما ہی نہیں دلکش رنگ اور دیدہ زیب لباس تک ممنوع ہیں۔ یہ لوگ سادگی' انکسار اور یکسانیت پر زور دیتے ہیں۔ کوئی فرد اپنا کوئی انفرادی حق بلکہ رائے تک نہیں رکھتا جو لوگ ان سخت مذہبی قوانین کی پیروی نہ کریں ان کی سزا دائمی اور مکمل قطع تعلق ہے۔ ان کو برادری سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ پھر کوئی ان سے نہ ملتا ہے نہ بات کرتا ہے نہ کسی کام میں شریک کرتا ہے۔ اس سزا کے خوف سے لوگ سرتابی کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔

آمش فرقے کے لوگ اپنی خاص وضع اور لباس کی وجہ سے فوراً" پہچانے جاتے ہیں اور عام لوگوں کی جھانکتی کریدتی ہوئی نگاہوں کا مرکز بھی بن جاتے ہیں جو ان کے لیے یقیناً" کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔

آمش مرد عورت سولھویں صدی کے ڈچ کاشتکاروں والا لباس آج بھی پہنتے ہیں۔ عورتوں کے بجھے بجھے رنگوں کے لمبے فراک ٹخنوں سے چند انچ اونچے ہوتے ہیں۔ لباس کے اوپر اسی رنگ کا اپرن ہوتا ہے اور سر ہمیشہ رومال یا گھر میں سلی ہوئی مخصوص قسم کی ٹوپی سے ڈھکا رہتا ہے۔ مرد ڈھیلے ڈھالے پتلون واسکٹ اور کوٹ پہنتے ہیں۔ جن میں بٹن کی جگہ ہک لگے ہوتے ہیں کیونکہ بٹن کا اطلاق آرائش و زیبائش پر ہو سکتا ہے۔ سر کے

بالوں کا انداز بھی طے شدہ اور یکساں ہے۔ شادی شدہ مرد داڑھی رکھتے ہیں۔

یہ دلچسپ ' سادہ ' غیر معمولی لوگ سڑک پر اور کھیتوں میں نظر آ رہے تھے لیکن ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ ان سے مخاطب ہونا تہذیب کے خلاف ہو گا۔ جبکہ امریکہ میں سڑک چلتے لوگوں سے بھی مزاج پرسی کے طور پر اخلاقاً "ہائے" کہنے کا دستور ہے۔

ہمیں ایک مکینوں سے خالی مکان دیکھنے کی اجازت تھی۔ آمش گھر عموماً بڑے ہوتے ہیں لیکن ان کی تعمیر میں کسی خاص خوبصورتی کا خیال نہیں رکھا جاتا اور گھر کی آرائش میں بھی صرف سادگی اور انکسار کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ لکڑی کے فرش ننگے لیکن صاف اور پالش کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھڑکیوں پر سیاہ پردے اور کبھی ڈرائنگ روم میں جو چرچ کی طرح استعمال کیا جاتا ہے سفید پردے ہوتے ہیں یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں آرائش کا واحد امکان جو ہمیں نظر آیا وہ دیوار پر آویزاں ایک فریم تھا۔ نزدیک سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کے اندر کاغذ پر افرادِ خاندان کی پیدائش اور موت کی تاریخیں درج تھیں۔ یہی کمرہ شادی بیاہ کے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ لکڑی کی دیواروں کو کھسکا کر اس کا رقبہ بڑا کر لیا جاتا ہے۔ اس کمرے میں پورا کنبہ عبادت کے لیے اکٹھا ہوتا ہے۔ عبادت ہر پندرھویں دن باری باری ہر گھر میں ہوتی ہے۔ بیٹھنے کے لیے لکڑی کی سادہ بینچیں استعمال کی جاتی ہیں جو گھوڑا گاڑی پر آسانی سے لائی لے جائی جا سکتی ہیں۔ ان گھروں کو مٹی کے تیل کے لیمپ روشن کرتے ہیں۔ بجلی' ٹیلی فون' ریڈیو' ٹیلی ویژن' ٹریکٹر' موٹر وغیرہ ان میں سے کوئی چیز یہ لوگ استعمال نہیں کرتے۔ ان کا سفر گھوڑے کی پیٹھ پر یا بگھی میں ہوتا ہے۔ چونکہ مختلف امریکی ریاستوں میں یہ قبیلے آباد ہیں اس لیے راستے میں قیام کرتے ہوئے یہ لوگ ضرورتاً دور دراز تک سفر کر لیتے ہیں۔

آمش لوگوں کی اپنی سادہ پرانی دنیا امریکہ کی نئی نمائشی دنیا سے اس قدر مختلف ہے کہ ان دونوں طبقوں میں میل جول ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ آمش صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان کا مذہب بھی غیر مسلک کے لوگوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا۔ موجودہ صدی میں کچھ تبدیلیاں ان لوگوں میں بھی آئی ہیں اور اب یہ لوگ دو فرقوں میں

تقسیم ہو گئے ہیں۔ پرانے آمش اور چرچ آمش۔ چرچ آمش انتہائی مجبوری کی صورت میں اسپتال میں علاج کروالیتے ہیں اور کبھی کبھی ضرورتاً" ٹیکسی استعمال کرتے ہیں لیکن یہ لوگ بھی خود موٹر کبھی نہیں خریدتے نہ ان کے گھروں میں برقی روشنی ہوتی ہے۔

ہم لوگ جس گھر میں داخل ہوئے وہ پرانے آمش فرقے کا تھا۔

آمش گھروں میں باورچی خانے کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہیں مٹی کے تیل کے چولھے پر کھانا پکایا جاتا ہے اور اس کے اوپر چمنی لگا کر صرف اس ایک کمرے کو برف باری کے زمانے میں گرم رکھنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ لوہے اور تانبے کے بڑے بڑے دیگچوں دوسرے برتنوں اور باورچی خانے کی دیگر ضروریات کے علاوہ یہاں ایک کونے میں ایک آرام دہ کوچ بھی بچھی رہتی ہے جس پر گھر کے بڑے بوڑھے آرام کرتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کا موقع ہو یا کوئی بیمار ہو تو یہ کوچ اس کے کام آتی ہے۔

باورچی خانہ خاصا بڑا ہوتا ہے۔ بیچ میں کھانے کی میز اور اس کے گرد چند کرسیاں اور بچوں کے لیے ایک بنچ تھی۔ ایک کونے میں کرسی کے سامنے سلائی کی مشین بھی رکھی ہوئی تھی۔ آمش خواتین گھر والوں کے لیے لباس تیار کرنے کے علاوہ ہماری سندھی رلی سے ملتے جلتے دوہر اور رضائیاں بھی بناتی ہیں اور بچوں کے لیے گڑیاں بھی۔ سلائی کا تمام کام باورچی خانے ہی میں انجام پاتا ہے۔

گھر کی ہر خوابگاہ میں پلنگ پر کپڑے کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی ہوئی دلائی یا رضائی موجود تھی۔ دیوار کے ساتھ کیل پر ایک دو لباس لٹکے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ کپڑوں کی انھیں ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

بیرونی برآمدے میں ایک زنانہ اور ایک مردانہ غسل خانہ تھا۔ پانی کنوئیں سے ہوا چکّی کے ذریعے کھینچا جاتا ہے اور نل کے ذریعے ضروریات پوری کرتا ہے۔ نلکوں سے گرم پانی بھی مہیا ہوتا ہے۔

اس گھر کا سب سے دلچسپ کمرہ باورچی خانہ ہی تھا۔ جہاں نوجوان نسل کی قسمتوں کے فیصلے بھی ہوتے ہیں۔ بیس سال کی عمر ہوتے ہوتے نوجوان اپنے لیے شریکِ حیات کا

انتخاب کر لیتے ہیں۔ عشق بھی ہوتا تو ہوگا۔ دستور یہ ہے کہ شادی کے بارے میں پہلے پہل گفتگو باورچی خانے میں ہوتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کی ملاقات مذہبی اجتماع میں یا گھر سے باہر کہیں بھی ممکن ہے۔ البتہ شادی کی درخواست لڑکے کو باورچی خانے میں پیش کرنا ہوتی ہے۔

کسی رات جب بزرگ آرام کرنے جا چکے ہوں لڑکا کھڑکی پر ٹارچ کی تیز روشنی ڈالتا ہے۔ اگر لڑکی کو اپنا یہ مہمان عزیز ہو تو وہ باورچی خانے کا دروازہ کھول کر اس کی پذیرائی کرتی ہے۔ اس کی تواضع بھی کرتی ہے اور پھر بیٹھ کر دونوں اپنی نئی زندگی کے بارے میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح بات طے ہو جانے کے بعد لڑکے کے خاندان کا کوئی بزرگ یا مذہبی پیشوا لڑکی کے خاندان سے رسمی طور پر اس رشتے کے لیے سلسلہ جنبانی کرتا ہے۔ اور پھر کسی مذہبی اجتماع میں اس نسبت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر لڑکی محفل میں شریک نہیں ہوتی۔ چرچ میں اعلان ہونے کے بعد لڑکا اپنی منگیتر کے گھر جا کر اس کو خوش خبری سناتا ہے۔ زیورات "مذہبا" ممنوع ہیں اس لیے انگوٹھی نہیں پہنائی جاتی۔

شادی کی تقریب آمش لوگ بڑے اہتمام سے منعقد کرتے ہیں۔ لڑکی کے والدین کی جانب سے ضیافت کا انتظام ہوتا ہے۔ جس میں دور دور کے علاقوں سے بھی آمش برادری مدعو ہوتی ہے۔ شادی کی تقریب میں شرکت کرنے والے غیر شادی شدہ مہمان گھر میں پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ شادیاں صرف نومبر اور دسمبر کے مہینے میں منگل اور جمعرات کو ہوتی ہیں۔ دلہن کا لباس مدھم نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں کوئی گلدستہ نہیں ہوتا۔ کوئی تصویر نہیں کھنچتی۔ آئندہ یہ جوڑا کُھلی گھوڑا گاڑی کے بجائے چھت والی بگھی استعمال کرتا ہے۔ کہ یہی دستور ہے۔

ان سادہ مزاج لوگوں کا طریق حیات کسی کہانی سے کم دلچسپ نہیں تھا۔

پھر ہم نے ایک ناقابل یقین سا منظر دیکھا۔ ان لوگوں کی عبادت شعاری اور حقیقت پسندی معلوم تھی۔ قناعت اور توکل کے نمونے سامنے تھے۔ مگر سُپردگی کا یہ عالم پہلے کہاں نظر آیا تھا۔ ہم اس مکان کے آخری کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک خالی تابوت

کھلا ہوا رکھا تھا۔ وہ آخری سفر جو سبھی کو کرنا ہے اسے یاد رکھنے کا ایسا اہتمام کون کرتا ہے۔

سلسلے

کہتے ہیں ایک عابد شب زندہ دار' زاہد تہجد گزار' پاک طینت' نیک خو کسی دریا کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ آگے بڑھے تو موجِ نسیم کی طرح ذکر کی جاں پرور صدا آئی۔ ٹھٹک کر سننے لگے۔ دریا پار کوئی درویش اپنے حالوں یادِ الٰہی میں غلطاں تھا۔ بزرگ کو حروف کی ادائیگی یا لہجے میں کسی کمی بیشی کا احساس ہوا۔ تصحیح اپنا فرض جانا۔

پاس ہی کنارے سے لگی ایک کشتی نظر آئی۔ مالک سے اجازت لے کر مرد بزرگ نوکا کھیتے ہوئے دوسرے کنارے گئے۔ درویش کو آداب و طریقِ ذکر سے آگاہ فرمایا۔ لہجہ درست کیا۔ پھر کشتی واپس موڑی اور درویش کی آواز سنتے ہوئے اپنی اصلاح سے مطمئن ساحل تک واپس پہنچے۔ سفر آغاز کیا مگر پھر ٹھہرنا پڑا۔ درویش کی صدائے بے تابانہ میں ایک بار پھر سہو کا احساس ہوا۔ دوبارہ کشتی لی۔ ندی پار کی۔ ایک بار پھر اس کو الفاظ کا دروبست سمجھایا۔ اصلاح کا حق ادا کیا اور واپس ہوئے۔ کنار دریا کچھ دور تک درویش کی آواز کان میں آتی رہی پھر اچانک سکوت ہو گیا۔ چونکے اور مڑ کر دوسرے کنارے کی طرف نگاہ کی۔ دیکھا کہ درویش دریا کی سطح پر قدم بڑھاتا ان کی طرف چلا آرہا ہے۔ نزدیک پہنچا تو معذرت خواہ ہوا کہ ایک بار پھر جناب کی بیش قدر اصلاح ذہن سے محو ہو چکی تھی۔

شاید محترم بزرگ کو مزید زحمت سے بچانے کی عجلت میں درویش خاک نشیں کو ندی اور ناؤ کا دھیان ہی نہیں آیا۔ ایک نظم میں کہا تھا۔

اس تضادِ شب و روز میں

زندگی رقص آئینہ گر

اور میں آئینہ

شہرجاں میں کوئی رنگ مدھم نہیں

وحشت شوق کو زادرہ کے لیے

اک نگہ کم نہیں

ایک بار شہاب صاحب سے پوچھا کہ ایک خصوصی حلقے میں انہیں صاحب اسرار کہا جاتا ہے اس کا اصل ماجرا کیا ہے۔ انسان بھید لینے کی خواہش سے اتنا مغلوب نہ ہوتا تو یہ ہدایت کیوں کی جاتی کہ کسی کی ٹوہ میں نہ رہو۔

شہاب صاحب افسانہ وافسانہ نگار کے بہانے بات کو ٹالتے رہے۔ میرا اصرار بڑھا تو کہنے لگے داستاں طراز جس کے قریب ہو اسی کو داستاں بنا دیتا ہے۔ مفتی جی خوش ہو جاتے ہیں۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ لہجہ ایسا تھا جیسے معذرت کررہے ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے ایک قصہ سنایا۔

کہنے لگے چوتھی یا پانچویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ سارا سال دوستوں کے ساتھ کھیلتے گھومتے کٹا۔ امتحان نزدیک آئے تو پریشانی لاحق ہوئی۔ ایک دوست نے خبردی کہ کچھ دور ایک ٹیلے پر ایک پیر کی خانقاہ ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ لوگ جھولیوں بھر مرادیں پا رہے ہیں۔ طے پایا کہ یاران ہم مشرب وہم درس پیر کے در پر حاضری دیں۔ ایک تعویذ حاصل ہوجائے تو ساری ابتلا دور ہو۔

ایک بھری دوپہریہ چار پانچ دوست پیر کے آستانے پر جا پہنچے۔ پیر اپنے مریدوں کے حلقے میں چٹائی پر آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی کوئی نعرہ لگا دیتے۔ سامنے کچھ کاغذ کوئی قلم پنسل اور ایک دوات رکھی تھی۔ ان لوگوں نے جاتے ہی سلام کے بعد اپنا مدعا بیان کیا۔ پیر نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ قلم اٹھایا دوات کی طرف رخ کیا جو بالکل خشک تھی۔ منہ سے کچھ نہیں بولے۔ قلم واپس رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ مرید نے لڑکوں کو سمجھایا کہ تم نے کوئی نذرانہ پیش نہیں کیا اس لیے دوات خشک ہو گئی ہے۔ تعویذ لکھوانا ہے تو

نذرانہ ساتھ لاؤ۔

دوسرے دن شہاب صاحب اور ایک دو ساتھی پانچ پانچ آنے (یا شاید پیسے اب مجھے یاد نہیں) لے کر گئے۔ اب کے پیر صاحب نے قلم اسی خشک دوات میں ڈبو کر تعویذ لکھ دیے۔ اور امتحان میں کامیابی بھی حاصل ہوئی شہاب صاحب کہنے لگے کہ عرصے تک انہیں یہ حیرت انگیز واقعہ یاد رہا۔ حیرت زائل اس وقت ہوئی جب انہوں نے فاؤنٹین پین دیکھا۔ وہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے کہانی سنا رہے تھے۔ میں انہیں خوش کرنے کے لیے مطمئن ہو گئی۔

برسوں کے میل جول کے عرصے میں ہم دونوں شہاب صاحب کی ایک ہی کرامت پر ایمان لائے۔ اور وہ یہ تھی کہ وہ نہایت پاک طینت انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس کا احترام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ویسے شہاب نامے کے ایک دو باب اب بھی ایسے ہیں جن کے بارے میں ان سے کچھ پوچھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ مگر اب وہ ہمارے یقین و گماں کی پگڈنڈیوں سے بہت آگے جا چکے ہیں۔

۵۸ء میں شہاب صاحب سے ہمارا رسمی تعارف کراچی میں ہوا تھا۔ جب وزیرِ خزانہ کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے سرکاری امور کے سلسلے میں نور کا ان سے رابطہ قائم ہوا۔ شہاب صاحب اس وقت صدر مملکت جنرل ایوب خاں کے سکریٹری تھے۔

کراچی میں ایک شام ہم دونوں ان سے ملنے گئے۔ "یا خدا" میں پڑھ چکی تھی اور میں دراصل ایک منفرد ادیب اور مصنّف سے ملاقات کے لیے نور کے ساتھ گئی تھی۔ اس کے بعد شاید ہم دونوں ہی واپس آنا بھول گئے۔

بعد کے برسوں میں اسلام آباد میں شہاب صاحب اور عفت شہاب سے ہمارے بہت قریبی مراسم رہے۔ ان کا اکلوتا بیٹا ثاقب میرے بیٹے عامر سے ایک ڈیڑھ سال بڑا ہے۔ عامر اپنے بہن بھائی سے عمر میں زیادہ تفاوت کی وجہ سے ہمارے گھر میں اکیلے تھے۔ اس لیے کبھی ثاقب اپنی آیا کے ساتھ ہمارے گھر بھیج دیے جاتے کبھی ہم عامر کو ان کے گھر چھوڑ جاتے۔ ابھی ان دونوں نے اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا کبھی دونوں بچوں میں

لڑائی ہو جاتی تو اس کا اظہار بڑے غیر معمولی طریقے سے ہوتا۔ بچوں کے کمرے سے جب کوئی آواز نہیں آتی تو ہم لوگ جھانکتے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے اپنے اپنے کھلونے سامنے رکھے خاموش بیٹھے نظر آتے۔ معلوم ہو جاتا کہ لڑائی ہو گئی ہے۔ دونوں کی دوستی اب بھی قائم ہے۔ ماشاء اللہ دونوں ڈاکٹر ہیں۔

شہاب صاحب کے ذکر کے ساتھ ایک واقعہ یاد آگیا۔ ہم لوگ اسلام آباد میں تھے۔ اس زمانے میں شہاب صاحب وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے۔ اب شعروادب کے دیار وزہ گزار سے میری جلاوطنی کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ ۶۸ء میں دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا تو عام رسائل و جرائد سے بھی پرانے رشتوں کی تجدید ہو گئی۔ اب تقریباً" سبھی رسالے میرے پاس آتے رہتے تھے۔ اسی دوران میں ایک دبلے پتلے "کم سن" ماہنامے کے تین شمارے بڑی پابندی سے وصول ہوئے۔ اس رسالے کا نام اب یاد نہیں۔ ایک جدید افسانہ نگار نے پہلے پرچے میں عالی دوسرے میں انشا اور تیسرے میں شہاب صاحب کے خلاف بہت کچھ تحریر کیا تھا۔

تیسرے شمارے کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ یا پھر مجھے نہیں ملا۔ میں نے شہاب صاحب سے پوچھا کہ چوتھے نمبر میں کس کی باری تھی۔ کہنے لگے کسی کی نہیں۔ میں نے ان صاحب کو بے روزگاری سے نجات دلوادی ہے۔ ایک پڑھے لکھے نوجوان کے لیے بے کاری عفریت ہوتی ہے۔ عفو و درگزر کا یہ انداز شہاب صاحب ہی کے مزاج کا حصہ ہو سکتا تھا۔

جنرل یحییٰ خاں کے زمانے میں شہاب صاحب جس آزمائش سے گزرے اور لندن میں انہوں نے جو صعوبتیں برداشت کیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ کڑے امتحان کے دن تو گزر گئے لیکن عفت کی صحت جواب دے گئی۔ جب بیماری بڑھتی نظر آئی تو وہ اسلام آباد سے اپنی بہن کے گھر راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ پھر علاج کے لیے لندن چلے گئے۔

عفت کے انتقال کے بعد شہاب صاحب کی زندگی میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ کچھ عرصے عام سوشل زندگی سے کنارہ کش رہے۔ ان کے بہنوئی اسلام آباد منتقل ہو گئے تھے

اور وہ انہیں کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر سے صرف مسجد جانے کے لیے باہر نکلتے۔ شاید اسی زمانے میں انہوں نے خود اپنے سائے میں پناہ تلاش کی ہو۔ یا کچھ لوگوں نے ایسا سوچا ہو۔

"سلسلہ" وہ پہلی محفل تھی جس میں ہمارے اصرار پر انہوں نے شریک ہونا قبول کیا۔ اسلام آباد میں جس صبح، نور کا تبادلہ رکوانے کی کوشش میں ناکام ہوئی اسی شام "سلسلہ" وجود میں آیا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی اور جو دوست موجود تھے انہوں نے اس کی تائید کی۔ ہم سب جمیل نشتر کے گھر جمع تھے۔

اس شام ظاہر ہے کہ میں کچھ خوش نہیں تھی۔ بے شک اسلام آباد مجھے پسند تھا۔ وہاں ہمارے عزیز دوست بھی موجود تھے لیکن لاہور سے اس طرح اچانک روانگی کے خیال سے افسردہ تھی۔ کسی مکان کو گھر بناتے بناتے وقت لگتا ہے۔ پھر اس کو چھوڑتے دکھ بھی ہوتا ہے۔ نور بھی کچھ خوش نہیں نظر آرہے تھے اور عامر کے اسکول کا مسئلہ بھی تھا۔ "سلسلہ" شاید اس افسردگی اور الجھن سے میرا انتقام تھا۔ اس لیے بڑے اہتمام سے شروع کیا گیا۔ خوشیوں کے تو ریزے ہی چننا پڑتے ہیں۔ وہ تو پریشانیاں اور نومیدیاں ہوتی ہیں جو آندھی اندھیاری کی طرح مقابل آتی ہیں۔

لاہور سے گھر کے سامان کے ساتھ واپس اسلام آباد پہنچنے کے بعد میں نے "سلسلہ" کا منشور لکھا۔ خریطہ جس پر اراکین کے دستخط ہونا تھے عذرا نے تیار کیا تھا۔ یہ خریطہ میرے پاس موجود ہے۔

"خاصانِ سلسلہ" کے لیے ایک ہی شرط تھی۔ کہ ادب سے ان کا قریبی رشتہ ہو۔ براہ راست قلم کے ذریعے یا شریکِ حیات کے واسطے سے۔ جمیل نشتر کے گھر یہ سب طے ہو رہا تھا۔ کہنے لگے "ادا بہن پھر شعروادب کی اس محفل اور خوان نعمت سے ہم تو محروم ہی رہ جائیں گے" جمیل نشتر کے خاندان کا تعلق تو شاعری اور علم و ادب سے رہا ہے چنانچہ انہیں "خاصانِ سلسلہ" میں شامل کرتے ہوئے ان کے سپرد ایک نہایت اہم فریضہ کیا گیا۔ اور وہ یہ تھا کہ ہر مجلسِ "سلسلہ" میں وہ کوئی ایسی نادر تحریر، نظم یا غزل پیش کیا کریں گے جو صاحب فن کے کمال کا نمونہ ہو۔ اور جو وقت کے غبار میں آنکھوں سے

اوجھل ہو گیا ہے۔ انہوں نے خوشی سے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ اور بے شک اس تمام عرصے میں جو برسوں پر محیط ہے ہر ماہ منعقد ہونے والی اس محفل میں کوئی نہ کوئی شاہکار ادب پارہ پیش کیا۔ جمیل نشتر ہماری یادوں میں ہی نہیں ہمارے دلوں میں بھی زندہ ہیں۔ نہ جانے انہیں منزل یقین پر پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ ابھی تو حیاتِ بے اعتبار کی راہیں منور بھی تھیں اور گل پوش بھی۔

نور جب ان کے سوئم میں شرکت کے بعد پشاور سے گھر پہنچے تو ان کا چھ صفحات کا طویل خط نور کو ملا۔ جو اس قیامت کے دن سے ایک دو روز قبل تحریر کیا گیا تھا۔ پانچ مہینے پہلے وہ اسلام آباد میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے۔ خط میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ ادا بہن میرا گھر ضرور دیکھیں۔ میں امریکہ گئی ہوئی تھی۔ واپس آکر جب اس سجے سنورے گھر میں گئی تو وہ خود جا چکے تھے۔ اس گھر میں ایک خوشی کے علاوہ سب کچھ سواگت کے لیے موجود تھا۔ اس روز رفعت سے صرف آنسوؤں کی زبان میں گفتگو ممکن تھی۔ سدا ہنستی مسکراتی شگفتہ خاطر رفعت سے اس وقت میں کیا کہتی اور کیا سنتی۔ میں نے ان دونوں کو بہت دیکھا ہے۔ رفو کے پیکر میں ایک شاعر اور ایک مصور بھی نہاں اور عیاں موجود ہے۔ ان کا گھر اور خانہ باغ اور آرائش برگ و گل کے نت نئے زاویے اس یقین کی گواہی کے لیے کافی ہیں۔

جمیل نشتر جیسے لوگ آج کی دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ پھولوں سے محبت اور خوشبو کی نگہبانی کرنے والے اس شخص میں بڑی خوبیاں تھیں۔ دوستوں کے دلوں اور محبت کے رشتوں کا اتنا خیال رکھتے جیسے برگِ گل کو چھو رہے ہوں۔ انہیں اپنے صحنِ چمن سے اتنی دلچسپی تھی کہ ان کے نام کے ساتھ مجھے پھول ہی یاد آرہے ہیں۔ ادیب و شاعر نہیں تھے لیکن شعر و ادب کی محفل میں ان کی موجودگی اجالا بکھیر دیتی۔

ابتدا میں "خاصانِ سلسلہ" میں جمیل نشتر' رفعتِ جمیل' مختار مسعود' عذرا مسعود' نثار عزیز بٹ' اصغر بٹ' قدرت اللہ شہاب' آغا ناصر' صفیہ' ضیا جالندھری' شفقت ضیا' اختر جمال' احسن علی خاں' سید ضمیر جعفری' مسعود مفتی' بشریٰ مسعود' کرنل محمد خاں' اور ہم

دونوں شریک تھے۔ دو تین ماہ بعد ممتاز مفتی' جنرل شفیق الرحمن' منظور الٰہی اور زہرا بہن بھی ہمارے مستقل اراکین میں شامل ہوئے۔ زہرا بہن نے اپنا پہلا افسانہ ہماری فرمائش پر محفل "سلسلہ" میں ہی سنایا تھا۔

جنرل شفیق الرّحمن سے پہلی بار ہم ۴۸ء میں ملے تھے۔ "محفلِ سلسلہ" میں ان کی شمولیت کے بعد ملاقات کا باقاعدہ سلسلہ جاری ہو گیا۔ چہرے پر متانت اور سنجیدگی' گفتگو میں کفایت شعار اور اپنی مزاحیہ تحریروں میں دریا دل۔ دوسروں کو خوشیاں بانٹنے والے سخی انسان ہیں۔

"خاصانِ سلسلہ" میں مسعود مفتی کی شرکت کی کہانی بھی سنا دوں۔ نامور افسانہ نگار ہیں۔ میرا ان سے بھرپور تعارف ان کے ایک افسانے کے ذریعے ہوا۔ یہ تحریر دلگداز سچائیوں کا آئینہ تھی۔ جس کا تعلق مشرقی پاکستان کے آخری دنوں سے تھا۔ ۷۱ء کی المناک جنگ ختم ہوئے چند مہینے گزر چکے تھے۔ ابھی تک اسیرانِ جنگ کی واپسی کی ساعت نہیں آئی تھی۔ دلوں میں انتظار کا کرب تھا۔ گھروں میں اداسیوں کے ڈیرے تھے۔ انہیں دنوں یہ افسانہ "نقوش" میں شائع ہوا جس پر افسانہ نگار کا نام نہیں لکھا تھا۔ طفیل بھائی سے ملاقات ہوئی تو میرے اصرار پر انہوں نے مسعود مفتی کا نام بتایا۔ وہ بھی بھارت کے کسی کیمپ میں محصور تھے۔ اور ان کے نام کی اشاعت ان کے لیے مزید مشکلات کا باعث بن سکتی تھی۔ یہ افسانہ وہاں سے کسی مہربان شخص کے ذریعے لاہور بھیجنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

مسعود مفتی جب طویل اسیری کی سختیاں جھیل کر واپس اسلام آباد پہنچے تو دردِ مشترک کے رشتے ہم دونوں ان سے ملنے گئے۔ اور پھر بشریٰ بہن اور مسعود مفتی ہمیشہ ہمارے عزیزوں میں شمار ہوئے۔

صدر "سلسلہ" کا منصب مختار مسعود کو سونپا گیا تھا۔ جب وہ آر۔ سی۔ ڈی کے سکریٹری کی حیثیت سے ایران چلے گئے تو ہمارے اصرار پر شہاب صاحب نے صدارت قبول کر لی۔ "سلسلہ" کو بے شک یہ فخر حاصل ہے کہ شہاب صاحب ہماری خاطر لکھنے کی

جانب دوبارہ مائل ہوئے۔ ورنہ عفت سے دائمی جدائی کے بعد وہ اپنے آپ سے بھی جدا ہو گئے تھے۔ ان کی خودنوشت اور اور دوسری گراں مایہ ادبی نگارشات ان کے پاس کچھ مکمل کچھ نامکمل موجود تھیں۔ لیکن وہ وقتی طور پر ان سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ "سلسلہ" جیسے ایک بہانہ بن گیا کہ شہاب صاحب دوبارہ اپنی تخلیقی زندگی کی طرف واپس آئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ ہر دوسرے مہینے وہ کچھ نہ کچھ ضرور سنائیں گے یہ ان کے مزاج کی خوبی بھی تھی اور ان کا بے پایاں خلوص بھی کہ انہوں نے ہماری اس فرمائش کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ شہاب نامے کے کئی باب ایسے ہیں جو خاص طور پر ہماری خوشی کے خاطر مکمل ہوئے اور سب سے پہلے ہم نے سنے۔

"سلسلہ" بڑے اہتمام سے شروع کیا گیا تھا۔ اس کی پہلی محفل جنوری ۱۹۷۸ء میں میرے گھر منعقد ہوئی۔ جس میں اختر ریاض الدین کے علاوہ لاہور سے آئے ہوئے دو مہمان شیخ منظور الٰہی اور محمد طفیل بھی شریک تھے "خاصان سلسلہ" ہمیشہ میزبان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نشست گاہ میں چاندنی کے فرش پر موم بتیوں کے سانولے اجالے بکھرے ہوئے تھے۔ آتشدان پر رکھے ہوئے فانوس سے چھنتی ہوئی روشنی نے دیوار پر آویزاں صادقین کے خطوط کو گویا تاب گویائی بخش دی تھی۔ آیات ربّانی کے قدموں میں چھوٹی سی تپائی پر روپہلی تھالی میں سبز ریشم کا خریطہ مقیش کی سنہری ڈوریوں میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔ جس کے پاس سبز بلوریں شمع دان روشن تھا۔ "خاصانِ سلسلہ" نیم دائرے کی صورت فرش پر اٰبیٹھے تھے۔ سامنے ترکستانی قہوہ دان اور فنجان سنبھالے ہوئے دو طشت تھے۔ یہاں میزبان اور مہمان کی تمیز ناروا تھی۔ اس لیے ہر عزیز کو اپنا پیالہ خود بھرنا تھا۔ آگے ایک بادیے میں کھجوریں تھیں۔ اور پس منظر میں عاشق رسول کی غیر فانی نظم کے مصرعے دہراتی ہوئی مغنی کی دھیمی آواز۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات

اس رات کچھ استعارے بھی شریک بزم تھے۔ اہتمام زیادہ ہی کیا گیا تھا۔ بجلی کے

قمقمے ایک تسلسل کے ساتھ روشن ہوتے گئے۔ خریطہ کھولا گیا۔ اور سفید کپڑے کے ورقِ سادہ پر "خاصانِ سلسلہ" نے دستخط کیے۔ اب دیکھتی ہوں کہ اس محضر میں بڑے انمول دستخط بھی موجود ہیں۔ محفل کا آغاز ضمیر جعفری صاحب کی نعت سے ہوا۔

"خاصانِ سلسلہ" کے ناموں کا انتخاب ہم سب نے متفقہ طور پر کیا تھا۔ اور اب بھی ہر فیصلہ تمام اراکین کی اتفاقِ رائے سے کیا جاتا ہے۔ یہ محفل ہر مہینے کسی ایک رکن کے گھر منعقد ہوتی ہے۔ ضیافت میں تمام اراکین ایک ایک ڈش کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

"سلسلہ" زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلانا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ادب کے ناتے بہت سی عزیز شخصیات اسلام آباد میں بھی اور کراچی میں بھی اس میں شریک نہیں ہو سکیں جس کا ہمیشہ افسوس رہا۔ ہم انہیں بطور مہمان مدعو کرتے رہتے ہیں۔

"سلسلہ" کسی شہرت طلبی کے لیے قائم نہیں کیا گیا تھا۔ ہمارے منشور کے مطابق شامِ سلسلہ کی روداد کسی اخبار میں شائع کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ اس کی رکنیت بھی محدود تھی۔ اس لیے کچھ بزرگوں نے اسے افسر شاہی کی "خفیہ تنظیم" کہا۔ نور اس وقت اسٹیبلشمنٹ سکریٹری تھے اور ہمارے ممبران میں شہاب صاحب اور مختار مسعود جیسے سینئر سرکاری افسر بھی تھے۔ جنہیں میں نے صرف ادیب اور اہلِ قلم کے مرتبے سے پہچانا تھا اور پہچاننا چاہا تھا۔

ہمارے منشور کی ایک شق کے مطابق غیبتِ خاص کی اجازت عام تھی۔ اب ہم اس باصوابِ غیبت کے ثواب کی توقع کس کس سے رکھتے۔ "سلسلہ" کا یہ الگ تھلگ قسم کا منظرنامہ مفتی جی کو برابر کھَلتا رہا۔ کہتے آپ بچّے کو پالنے سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ اس کی نشوونما کیسے ہو گی۔ میں گزارش کرتی، مفتی جی سڑک پر ٹریفک کا ہجوم ہے۔ جو بچّہ کچل گیا تو کیا ہو گا۔

مجھے یاد آیا۔ انہیں دنوں بیرونِ ملک اقامت گزیں ایک خوش نوا نے مجھ سے کہا کہ سنا ہے کہ آپ نے امیر ادیبوں کی ایک انجمن قائم کی ہے۔ میں نے اقرار کیا کہ جن

اصحاب کو اس انجمن میں شریک کیا ہے۔ بے شک ان میں بیشتر رئیسانِ ادب ہی ہیں۔
سلسلہ اپنوں سے غیر رسمی ملاقات کا وسیلہ تھا۔ نور نے مجھ پر ادبی محفلوں میں شریک ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پابندی عائد نہیں کی انہوں نے میری شاعری سے ناپشیاں محبت کی ہے۔ لیکن ان کی اپنی مصروفیات تھیں اور تنہا کسی محفل میں شریک ہونا ایک عمر تک میرے لیے دشوار رہا۔ یہ فیصلہ میرا اپنا ہی تھا۔

عورت ایک ہی مہلتِ حیات میں کئی جیون جھیلتی ہے۔ قلم ہاتھ میں تھام لے تو جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے آداب کچھ کہتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملنے کے راستے کہیں اور نکلتے ہیں۔ "سلسلہ" اپنے پاس رُکنے ٹھہرنے کا بہانہ بھی بنا۔ لفظ کو سانس لیتے دیکھنا کتنی بڑی نعمت ہے۔ انہیں دنوں لکھا تھا۔

وہ سارے الفاظ جو ابھی تک
کسی زمیں پر
کسی زباں میں لکھے گئے ہیں
ہمارے خوابوں کے سلسلے ہیں

اسلام آباد میں "سلسلہ" بڑا جیتا جاگتا سلسلہ تھا۔ ضیا جالندھری اپنے اشعار کے علاوہ اپنی شگفتہ گفتگو سے بھی اس محفل کی رونق اُجاگر کر دیتے۔ اور شفقت کو ان دنوں ہم نے باقاعدہ افسانہ نگار بنا دیا تھا۔ لکھتی تو وہ پہلے بھی رہی تھیں لیکن کم کم۔

آغا ناصر بھی ایک عرصے کے بعد دوبارہ تخلیقی ادب کی جانب متوجّہ ہوئے۔ ان کے کئی ڈرامے اور افسانے ان محفلوں میں ہم نے سنے۔ اور صفیہ اپنے تیکھے جملوں کے ساتھ بہترین سامع کا فریضہ ادا کر رہی تھیں۔ ان دونوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تصنّع اور دِکھاوا نہ ان کی زندگی میں ہے نہ دوستی میں۔

اس کی سالگرہ خاص اہتمام سے منائی جاتی۔ ایک مرتبہ لازم قرار پایا کہ ہر شریکِ محفل کم از کم ایک طبع زاد شعر سنائے۔ سب ہی نے طبع آزمائی کی۔ لکھا بھی اور سنایا

بھی۔ اس محفل میں جمیل نشتر نے اپنی ایک خوبصورت نظم پہلی اور آخری بار سنائی۔ ایک بار کچھ اور دور کی سوجھی۔ طے ہوا کہ افسانہ نگار اراکین ایک مشترکہ افسانہ پیش کریں۔ اس تجویز کے ساتھ ہی سید ضمیر جعفری نے ہدایت نامہ جاری کیا کہ افسانے کے ہیرو کو بس میں نہ بٹھایا جائے روزا یکسیڈنٹ کی خبریں آتی ہیں۔ موٹر یا ہوائی جہاز سے بھی سفر نہ کرے۔ بُرے وقت کی کس کو خبر ہوتی ہے غرض افسانہ ختم ہو جائے لیکن ہیرو ختم نہ ہو۔

افسانے کا آغاز آغا ناصر نے کیا جس میں ہیرو کے سفرِ آخرت کا پورا انتظام موجود تھا۔ ستر اسّی سال کی عمر مایوسیوں، محرومیوں میں گھرا ہوا اور خودکشی پر آمادہ۔ حروف تہجی کے لحاظ سے نثار کا نام افسانہ نگاروں میں آخری تھا۔ ہیرو کی موت یا زندگی انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ان کا کمال تھا کہ اس افسانے کا انجام ضمیر جعفری صاحب کی خواہش کے مطابق ہوا۔ زندگی جیت گئی۔

یہ افسانہ ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ لیکن منفرد لہجوں اور مختلف اسالیب کا نمائندہ یہ افسانہ یقیناً "افسانوی ادب میں قابلِ ذکر ٹھہرے گا۔

سلسلے کی ایک اور محفل یاد آگئی جو سید ضمیرِ جعفری نے "آستانۂ کھینارہ شریف" میں منعقد کی۔ یہ جگہ مندرہ کے قریب ہے۔ یہاں ان کے پرنانا سیّد محمد شاہ کا مزار ہے۔ ہم نے ابھی تک ضمیر بھائی کو مسکراہٹوں اور قہقہوں کی سوغات تقسیم کرتے ہی دیکھا تھا۔ اس محفل میں انہیں مکمّل سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے بھی دیکھا۔

نہایت روایتی اور ہمارے لیے کچھ کچھ افسانوی ماحول تھا۔ ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ مہمانوں کا استقبال اور دور مزار پر لہراتے ہوئے رنگین پرچم اور فضا میں سید محمد شاہ کے ابیات کی گونج۔

ضمیر جعفری نے کبھی پیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن اس دن اس گاؤں میں اس مزار کے پاس معتقدین کے ہجوم میں وہ مرشد کی حیثیت رکھتے تھے۔ یوں بھی شفقت اور مروّت ان کے مزاج کا حصّہ ہے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے مقبول ترین شعراء میں ہوتا ہے

ساتھ ہی وہ اچھے انسان بھی ہیں۔ ایسا انسان جس کی اس دنیا اور اس زندگی کو اجالنے کے لیے ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔

نور کا تبادلہ این آئی ٹی کے منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ہوا تو ہمیں کراچی آنا پڑا۔ لیکن "سلسلہ" اسلام آباد میں کئی سال اسی آن بان سے جاری رہا۔ سنا ہے اب مفتی جی نے توسیع کے بعد اس کا نام "رابطہ" تجویز کیا ہے۔

کراچی کے ادبی اور علمی حلقوں میں ہمارے عزیز دوست اور شناسا موجود تھے۔ اور ایسی شخصیات بھی جن سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن جنہیں کبھی دور بھی نہیں سمجھا تھا۔ یہ میری اپنی برادری ہے۔ اور مجھے عزیز ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری جانب سے یہ عزیزداری قطعی غیر نمائشی اور غیر مشروط رہی ہے۔

کراچی میں رئیس امروہوی صاحب سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ ایک دوبار ان کی دعوت پر انجمن ساداتِ امروہہ کے مشاعروں میں شریک ہوئی تھی۔ اس بار کراچی آنے کے بعد خاص طور پر مشفق خواجہ اور سلیم احمد سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا۔ پہلے ہم دونوں عالی جی کے ساتھ مشفق خواجہ صاحب کے گھر گئے۔ میں اسلام آباد میں تھی جب ان کا مجموعۂ کلام "ابیات" شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ بھی ملا تھا۔ پھر اخباروں کے صفحات پر اس کی رُونمائی کی رُوداد شائع ہونے کا یقین رہا۔ لیکن نہ آج ایسی کوئی خبر شائع ہوئی نہ کل۔ حیرت ہوئی کہ اس نمائشی دور میں کوئی شاعر ایسا بھی ہے جو رسمِ تعارف کے تکلّف سے بے نیاز رہے۔ میں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی تعارفی تقریب منظور نہیں کی اس لیے خواجہ صاحب کی یہ وضع خصوصاً" اچھی لگی۔

خواجہ صاحب کی خصوصیت تو یہ بھی ہے کہ وہ نہ کسی مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں اور نہ کسی جلسے میں ان کی شرکت کی خبر نگاہ سے گزری۔ انہوں نے خود گوشۂ تنہائی اختیار کیا ہے اور ان کے علمی اور تحقیقی کارنامے منظرِعام پر ہیں۔ اس خواجہ گوشہ نشیں کے مریدان باصفا کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں نئی پرانی' دوسری تیسری ہر دنیا آجاتی ہے۔ قابلِ قدر انسان ہیں۔

دوسرا گھر جہاں ایک دوپہر عالی جی کے ساتھ ہم دونوں گئے شاعر اور دانشور سلیم احمد کا مسکن تھا۔ ان سے ملاقات ٹی وی مشاعروں میں بھی ہوئی۔ گاہے گاہے نجی ادبی محفلوں اور دعوتوں میں بھی۔ میرے گھر بھی ایک شعری نشست میں وہ اپنی مصروفیت کے باوجود شریک ہوئے۔ ان کے گھر کی محفلوں کے چرچے بھی بہت سنے تھے۔ جن میں علمی اور ادبی اور دیگر قابلِ فکر موضوعات پر بہت دلچسپ اور خیال آفریں گفتگو ہوتی تھی۔ وہاں جاکر یہ باتیں سننے کی خواہش مندر رہی لیکن میری اپنی کچھ خود عائد کردہ پابندیاں تھیں جو میری اس خوشی کی راہ میں حائل رہیں۔

میں اسلام آباد میں جیتا جاگتا ادبی سلسلہ چھوڑ کر آئی تھی۔ کراچی آکر اس پھلتے پھولتے شجر کی ایک شاخ یہاں بھی لگائی گئی۔ یہاں "خاصانِ سلسلہ" میں جمیل الدین عالی' طیبہ عالی' مشفق خواجہ' آمنہ مشفق' ہاجرہ مسرور' احمد علی خاں' جمیل جالبی' نسیم جالبی' رضیہ فصیح احمد' لطف اللہ' زاہدہ' شان الحق حقی' سلمیٰ حقی' میجر ابن الحسن' افتخار احمد عدنی' منّان اللہ بیگ اور اقبال منّان شامل ہوئے۔

منّان بھائی کا فریضہ جمیل نشتر کی طرح کھوئے ہوؤں کی جستجو رہا۔ جس کی دلچسپی سے انکار ممکن نہیں۔ کراچی میں اس کے ایک دو رکن بعد میں کم بھی ہوئے اور پھر انور عنایت اللہ' عسکری' نفیس اور خوش فکر شاعرہ سحاب قزلباش کا اضافہ بھی ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی سے ہماری پہلی ملاقات ان کی تصنیف "پاکستانی کلچر" کی معرفت ہوئی تھی اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان کو وجود میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس کتاب کے حوالے اب بھی دیے جاتے ہیں اور اس کے بعد سے اب تک تحقیق و تنقید کے باب میں ان کی تمام تصانیف نہایت گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس لگن اور محنت سے وہ مسلسل اردو ادب کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ انہوں نے ادب کو عبادت کا درجہ دے رکھا ہے۔ ان کے علمی' تنقیدی اور تحقیقی کارناموں کے علاوہ ان کی متوازن اور سنجیدہ شخصیت بھی اپنا مقام رکھتی ہے کراچی کے "سلسلہ" کی صدارت ان کے سپرد ہوئی۔

ابتدائی برسوں میں اسلام آباد کی طرح کراچی میں بھی اس کی رونق برقرار رہی۔ خصوصاً سالگرہ کی تقریب جو زمن بھائی کے گھر ہوتی تھی۔ اس کا پروگرام بھی وہی ترتیب دیتے اور عدنی بھائی اس کے لیے وڈیو کیمرے کا انتظام کرتے۔ وہ ان دنوں نیپا میں اہم عہدے پر فائز تھے۔ سالگرہ کی تین شامیں مشاہیر کے نام کی گئیں۔ امیر خسرو' نظیر اکبر آبادی اور ولی دکنی۔ کسی البم کے صفحات کی طرح سجی ہوئی تعارفی تقریر زمن بھائی کی ہوتی جس میں وہ تحقیق کا حق بھی ادا کرتے۔ اس کے بعد سازو آواز کے ساتھ شاعر کا کلام پیش کیا جاتا۔ زمن بھائی کے گھر ایک قوالی کی محفل بھی ہوئی۔ جس میں میر محفل ممتاز مفتی تھے۔ جو اُن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے۔ ایک اور قوالی کی محفل ڈاکٹر جمیل جالبی کے گھر ہوئی جس میں فیض صاحب میر مجلس تھے۔

ایک اور نشست یاد آگئی۔ یہ ایک غیر معمولی مشاعرہ تھا جو لطف اللہ کے گھر سنا گیا۔ اس شام ہماری فرمائش کے مطابق صرف ان شعراء نے اپنا کلام سنایا جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اس مشاعرے میں تقدیم و تاخیر کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ یہ آواز کو محفوظ رکھنے کے فن کا کرشمہ تھا۔ لطف اللہ صاحب کے پاس آڈیو کیسٹ کا نادر ذخیرہ ہے جو وہ برسوں سے فن کارانہ مہارت کے ساتھ تیار کر رہے ہیں۔ ہر موضوع اور ہر عنوان کے تحت۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ ذخیرہ ہمارے ملک میں بے مثال ہے۔

کراچی میں ہماری مجلس "سلسلہ" کی رونق زیادہ تر مہمانوں کی مرہون منت رہی۔ جن میں عصمت چغتائی' شوکت صدیقی' فیض صاحب' خدیجہ مستور' ساقی فاروقی' ڈاکٹر وحید قریشی' کمانڈر انور اور دورِ جدید کی منفرد افسانہ نگار زاہدہ حنا شامل ہیں۔ لیکن ہماری عام محفلوں میں اس چھوٹے سے ادبی حلقے کا ادبی رنگ نکھر کر سامنے نہیں آسکا۔

اسلام آباد میں اس کی کامیابی کا بڑا سبب یہی تھا کہ تمام شرکاء ان محفلوں کے لیے خاص طور پر لکھتے اور سناتے۔ وہاں ہر محفل ادبی محفل ہوتی تھی۔ کراچی میں ایسا نہیں ہو سکا۔ بس زمن بھائی اور عدنی بھائی اس محفل کے لیے مضامین لکھتے اور سناتے رہے۔ عدنی بھائی فی البدیہہ مزاحیہ اشعار کہنے میں مہارت رکھتے ہیں اور کئی انوکھے مضامین لکھنے میں

بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی گفتگو زیادہ دلچسپ ہوتی ہے یا ان کے مضامین۔

جہاں تک "سلسلہ" کا تعلق ہے مشتاق یوسفی نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ کراچی شہر کا مزاج دوسرا ہے۔ "سلسلہ" کو مشکل سے راس آئے گا۔ مگر اس وقت جی چاہا تھا کہ صاحب طرز مزاح نگار کی سنجیدگی سے کہی ہوئی بات کو بھی مزاحیہ جملہ مان لیا جائے۔ چنانچہ مان لیا اور پھر یوسفی بھائی کی پیش بینی پر ایمان بھی لانا پڑا۔ واقعی کراچی کا مزاج کئی لحاظ سے دوسرا ہے۔

کچھ اور اُجالے

۱۹۶۱ء میں نور ممبر فنانس واپڈا کے عہدے پر لاہور پہنچے۔ یہ ہمارا لاہور میں دوسری بار قیام تھا۔ لاہور کے ساتھ میری بہت سی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔

بچپن میں مجھے ہندوؤں کے تہوار ہولی دیوالی وغیرہ سبھی بہت دلچسپ نظر آتے تھے۔ مگر ان کا سب سے خوبصورت تہوار راکھی بندھن ہے۔ جو ہر سال ساون کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کی ندرت کو میں ابھی تک نہیں بھول سکی ہوں۔

اس دن بہنیں اپنے بھائیوں کی کلائی پر راکھی باندھتی ہیں اور ان کی درازی عمر اور خوشیوں کے لیے دعائیں مانگتی ہیں۔ اس تقریب کا حسین ترین پہلو یہ ہے کہ سگی بہن کے علاوہ بھی اگر کوئی لڑکی چاہے تو راکھی باندھ سکتی ہے۔ اور اسے حقیقی بہن کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب کسی قانونی حیثیت سے نہیں ہے لیکن اس رشتے کو سماج تسلیم کرتا ہے۔ راکھی کے کچے دھاگے میں کتنا مقدس رشتہ کتنی مضبوطی سے بندھا ہوتا ہے۔

اب جو لاہور یاد آیا تو سب سے پہلے مجھے اپنے بھائی میرزا ادیب یاد آگئے۔ لگتا ہے کبھی کسی خواب میں میں نے بھی ایک بہن کے پورے مان کے ساتھ میرزا ادیب کو راکھی بھیجی تھی جس کو وہ آج تک ایک بھائی کی محبّت اور خلوص کے ساتھ 'جس میں شفقت بھی شامل نظر آتی ہے نباہ رہے ہیں۔

پتہ نہیں پہلے پہل میں نے انہیں بھائی لکھا یا انہوں نے مجھے بہن کہا لیکن اس رشتے کا تمام حُسن انہوں نے قائم و دائم رکھا ہے۔ آج بھی میرے ساتھ ان کا برتاؤ ایک محترم بھائی کے خلوص کی صداقت کا مظہر ہے۔ بے شک وہ سراپا مہر و مروت ہیں۔ میں خط لکھنے میں ہمیشہ سے کاہل لیکن ان کے دعاؤں بھرے خطوط اسی طرح آتے رہتے ہیں۔ کبھی میری

غیر معمولی خاموشی پر فکر مند، کبھی میری خوشیوں میں پوری اپنائیت کے ساتھ شریک، ملاقات کے مواقع کم ملے لیکن ان سے دوری کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ جس کے لیے میں ان کی احسان مند ہوں۔ وہ جتنے بڑے ادیب ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں۔

خاندان سے باہر جس ہستی نے مجھے پہلی بار بہن کہا تھا وہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔ میں بڑی حویلی کی چار دیواری کے اندر تھی اور اپنی شاعری کی دنیا میں سانس لے رہی تھی اس لیے اکیلی بھی تھی۔ انہوں نے بہن لکھ کر مجھے اس حیرت آمیز مسرّت سے آشنا کیا تھا کہ قلم کے رشتے سے میری ایک برادری ایک کنبہ موجود ہے۔ ایک ایسا تعلق جو غیر مشروط بھی ہوتا ہے۔ بے تعلق اور غیر واضح بھی ہو سکتا ہے لیکن زندہ اور تابندہ رہنے کی توانائی بھی رکھتا ہے۔

ندیم بھائی نے بہن کہہ کر میرے عجیب سے احساسِ تنہائی کو یقیناً" کم کر دیا تھا۔ لاہور میں مختلف عہدوں پر نور کا تقرر تین مرتبہ ہوا۔ ندیم بھائی سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن ہمارے اسلام آباد کے قیام کے زمانے میں ان سے ملاقات کا سلسلہ زیادہ نکھرا ہوا ہو گیا تھا۔ نور سے ان کی باقاعدہ خط و کتابت بھی رہتی تھی اور وہ جب بھی اسلام آباد آتے میرے گھر شعری نشست منعقد ہوتی۔ جس میں شرکت کے لیے کراچی سے عالی جی اور ابن انشا کو بھی کسی نہ کسی بہانے اسلام آباد بلا لیا جاتا۔ راولپنڈی سے جمیل ملک، یوسف ظفر، مختار صدیقی، صادق نسیم، ڈاکٹر ظہیر فتح پوری، توصیف تبسّم، احمد ظفر، فتح محمد ملک، شہاب صاحب، اور دوسرے ممتاز ادیب اور شاعر شریک ہوتے۔ شام کی یہ محفلیں رات کے بارہ بجے تک جاری رہتیں اور کسی کا اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان محفلوں کے سامعین بھی بہت ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے۔ جیسے کسی بند کمرے سے کھُلی فضا میں آ گئے ہوں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں بیوروکریٹ کہا جاتا ہے۔ ان مواقع پر اکثر ہمارے یہ دوست اپنے گھر میں بھی شعر و سخن کی محفل کا اہتمام کرتے تھے۔ ندیم بھائی نے میرے تیسرے شعری مجموعے "غزالاں تم تو واقف ہو" کی اشاعت کے سلسلے میں میری مدد بھی کی۔ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اس کی کتابت کی تصحیح پر نگاہ رکھی۔ اس کتاب کا

پہلا ایڈیشن مکتبۂ فنون سے ہی شائع ہوا۔

لاہور میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے ملاقات ہوتی رہی جو رفتہ رفتہ محبّتوں کی امانت دار ثابت ہوئی۔ پہلی بار ان دونوں بہنوں کو ۴۸ء یا ۴۹ء میں دیکھا تھا۔ جب وہ مجھ سے ملنے آپا کے گھر آئی تھیں۔ تعارف کی تو خیر کبھی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جدید افسانے میں قرۃالعین حیدر کے علاوہ یہ دو نام ایسے تھے جو سامنے آئے تھے اور نئے تھے۔

دونوں بہنیں بہت زیادہ اپنائیت سے ملتی تھیں۔ مگر ان دنوں خدیجہ میرے دل کے زیادہ قریب تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خدیجہ کو شعرو سخن سے خاص لگاؤ تھا۔

پھر ہم لوگ اسلام آباد چلے گئے۔ اور ہاجرہ مسرور کراچی پہنچ گئیں۔ خدیجہ مستور لاہور میں تھیں۔ لیکن ان کی تخلیقات مسلسل شائع ہورہی تھیں اس لیے دُوری کا احساس نہیں تھا۔ مگر انہیں تو بہت دُور جانا تھا۔ بہت جلد چلی گئیں۔ انہیں اس سفر پر روانہ ہونے کی نہ جانے اتنی عجلت کیوں تھی۔ زندگی کو حُسن اور اعتبار بخشنے والے اس طرح بھری محفل سے کیوں اُٹھ جاتے ہیں۔

اب اتنا یاد ہے کہ میں کسی ادبی محفل میں شریک تھی۔ وہیں یہ سناؤنی سنی اور وہیں سے اُٹھ کر ہاجرہ کے گھر چلی گئی۔ خدیجہ بیمار تو عرصے سے تھیں لیکن جب علاج کے لیے لندن گئیں تو ہنستی بولتی اپنے قدموں سے چلتی ہوئی گئی تھیں اور لندن سے واپس ایک لکڑی کا صندوق آیا۔ اس رات میں نے اپنی اس عزیز دوست کے نام ایک نظم لکھی اور دوسرے دن ان کی بیٹی کرن کو بھیج دی۔

خدیجہ نے بہت لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ ان کے ناول "آنگن" کا چینی اور ہندی زبان میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

افسانہ نویسی کے سلسلے میں ان دونوں بہنوں کا نام ایک ہی سانس میں لیا جاتا ہے۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا اور دونوں نے زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے گداز دل رکھنے والی ہاجرہ مسرور کو دُور سے دیکھا جائے تو سنجیدگی کی دبیز قبا میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ مگر میں نے انہیں پاس سے دیکھا ہے۔ اپنے نظریات کی سختی سے پابندی

کرتی ہوئی ہاجرہ سراپا محبت ہیں۔ ہمدرد' غم گسار اور مخلص ہاجرہ مسرور میری دوست ہی نہیں میری بہن بھی ہیں۔

ممبر فنانس واپڈا کی حیثیت سے نور لاہور میں ۶۱ء سے ۶۵ء تک رہے۔ گلبرگ ون میں ہمارا مکان تھا۔ وسیع سبزہ زار سے گھری ہوئی یہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ اتنی کشادہ کہ ہمارے پاس جو فرنیچر تھا وہ ان کمروں میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ شروع شروع میں اتنے "بے تحاشا" گھر میں رہنے سے گھبراہٹ ہوئی۔ پھر عادت پڑ گئی۔

یہ کوٹھی بیگم فدا حسن کی تھی۔ جو نہایت خلیق خاتون تھیں۔ سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں مشغول رہتی تھیں۔ طویل عرصے تک اپوا کی لاہور برانچ کی صدر رہیں۔ اپوا کے جلسوں کی خاطر ہی انہوں نے اس مکان کا ڈرائنگ روم خاص طور پر طویل و عریض بنوایا تھا۔ ان دنوں فدا حسن اسلام آباد میں مرکزی حکومت میں سکریٹری تھے اور مکان واپڈا کی تحویل میں تھا۔

اسی زمانے میں لاہور میں ابن الحسن برنی اور ارجمند بہن کا بھی قیام تھا۔ آنا جانا رہتا تھا۔ لیکن ان دونوں کو زیادہ قریب سے ہم نے لندن میں دیکھا۔ جہاں وہ بی سی سی آئی سے منسلک تھے۔ انکسار' خلوص اور محبت کے ایسے پیکر کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

برنی صاحب شعر و ادب کے دلدادہ تھے خود بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اپنا کوئی شعر سنایا کبھی نہیں۔ نہ شعر گوئی کا اقرار کیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد ارجمند بہن نے ہم پر یہ راز کھولا۔ وہ چلے گئے لیکن اپنے دوستوں کے دلوں میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ اب ارجمند بہن سے زیادہ تر ملاقات خط کے ذریعے رہتی ہے۔ شمو کے ہانگ کانگ جانے کے بعد ایک بار واشنگٹن جاتے ہوئے ہم دونوں نے کچھ دن لندن میں ان کے گھر قیام بھی کیا۔ وہی محبتوں میں بھیگی ہوئی فضا تھی۔

لندن شہر مجھے پسند کبھی نہیں آیا۔ گھر سے باہر نکلو تو دُھندلا دُھندلا عجیب اداس سا منظر ہوتا ہے۔ تنگ سڑکیں' کائی لگی ہوئی اونچی اونچی عمارتیں' بادلوں کی مَیلی چادر اوڑھے ہوئے آسمان اور گیلی زمین۔ ہاں ان عمارتوں کے اندر جایئے تو شاپنگ سینٹر

نہایت شاندار ہیں اور روشن بھی۔ ہمارے لیے لندن کو دلکشا وہاں برنی صاحب اور مشتاق یوسفی کی موجودگی نے بنا دیا تھا۔

ہر دوسرے سال ہم بچوں کے پاس امریکہ جاتے ہوئے لندن میں کچھ دن نور کے چھوٹے بھائی شمع الحسن جعفری کے گھر قیام کرتے تھے۔ جب بھی پہنچتے شمو' زرینہ اور بچے سراپا انتظار ملتے۔ دن رات ہماری خاطر مدارت میں لگے رہتے۔ ہمارے دوستوں کی دعوتیں بھی ہوتیں۔ ان دنوں شمو کا تعلق بی سی سی آئی سے تھا۔

لندن فاصلوں کا شہر ہے لیکن وہاں مشتاق یوسفی کا گھر ہم دونوں کے لیے شاید کسی ایسی مرکزی جگہ پر تھا کہ ہم بازار دوکان جہاں بھی جاتے واپسی میں چائے وہیں پی رہے ہوتے۔ برنی بھائی اور یوسفی بھائی دونوں کے اصرار اور حکم پر ہی میں نے اردو مرکز لندن کا پروگرام منظور کر لیا تھا۔ میں تو جلسوں جلوسوں سے ہمیشہ گھبراتی ہوں۔ عام مشاعروں میں بھی نہیں جاتی۔ اور یہ تو ایک پوری شام کا قصہ تھا ایک پورا پروگرام اور میں۔

اردو مرکز نے اردو کے منفرد شاعر افتخار عارف کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں لندن شہر کو مغربی دنیا میں اردو زبان کا مرکز بنا دیا تھا۔

افتخار عارف مجھے پہلے بھی کئی بار بڑے خلوص سے مدعو کر چکے تھے۔ اور میں ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی تھی۔ اس شام کے لیے برنی صاحب نے کراچی عامر کو فون کرکے میری خودنوشت کے ابتدائی اوراق بھی کوریئر سروس سے منگوا لیے تھے۔ تاکہ کلام شاعر نثر میں بھی سنا جائے۔ اس وقت تک یہ خودنوشت افکار میں شائع ہونا شروع نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اردو مرکز کی روایت کے مطابق یہ ایک بھرپور شام تھی۔

مشتاق یوسفی سے ملاقاتیں ان کے لندن جانے سے پہلے کراچی میں بھی ہوتی رہی تھیں۔ ان کی تحریر اور شخصیت کے سحر میں ہم جب بھی گرفتار تھے اور اب بھی ہیں۔ ان کی گفتگو میں بھی اتنی ہی دلکشی ہے جتنی ان کی تصانیف میں۔ صاحبِ طرز ایسے کہ ان سے پہلے کسی نے ایسی نثر لکھی نہ آئندہ کوئی اس رنگ کو اختیار کرنے کی راہ پا سکتا ہے۔ ان کا لکھا ہوا ہر لفظ ان کی انفرادیت کی گواہی دیتا ہے۔ اپنی تمام علمی اور ادبی فتوحات کے

ساتھ ساتھ یوسفی بھائی اپنے حلقۂ احباب میں بھی ہر لحاظ سے قابلِ قدر شخصیت ہیں۔ یوسفی بھائی کا ذکر کرتے ہوئے ادریس بھن کی محبت کا اعتراف بھی کرنا چاہتی ہوں۔ ایسے اہلِ خلوص دوست زندگی میں خوش نصیبوں کو ملتے ہیں۔

واپڈا کے وسیلے سے لاہور میں ہم ۶۱ء سے ۶۵ء تک رہے۔ اس عرصے میں صادقین سے پہلی بار ہماری ایک نہایت غیر معمولی اور یک طرفہ ملاقات ہوئی۔ ملاقات تو میں ان کے اس عظیم تمثیلی شاہکار کے حوالے سے کہہ رہی ہوں جس کے کچھ حصّے وہاں موجود تھے اور ہم سے مخاطب بھی۔ مصوّر نے معائینے کے لیے آئے ہوئے سرکاری افسر کے سامنے آنا منظور نہیں کیا تھا۔ یہ بھی اس بے نیاز فنکار کے مزاج کا ایک اہم پہلو تھا۔

اس زمانے میں واپڈا کی نگرانی میں منگلا ڈیم کی تعمیر ہو رہی تھی جو اب تکمیل کے مراحل میں تھی اور صادقین اس کے لیے میورل بنا رہے تھے۔ میں نے صادقین کا نام بہت سنا تھا۔ ان کے فن پارے دیکھے بھی تھے اور ان سے ملاقات کی خواہش بھی بہت تھی۔

نور اکثر منگلا ڈیم جاتے رہتے تھے جو جہلم شہر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک بار میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ نور سرکاری امور سے فارغ ہوئے تو جس کمرے میں صادقین کام کرتے تھے ہمیں وہاں لے جایا گیا۔ میورل کے کچھ حصّے دیوار سے لگے ہوئے رکھے تھے۔ سامنے ایک کینوس یا تختے پر کچھ عیاں کچھ نہاں نقوش نظر آ رہے تھے۔ آس پاس پینٹ' بُرش' خالی بوتلیں اور سگریٹ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ زمین پر گیلے رنگوں کے چھینٹے بتا رہے تھے کہ نقاش ابھی ابھی یہاں سے اُٹھ کر گیا ہے۔ عملے کے کچھ لوگوں نے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن صادقین کہیں نہیں ملے۔

صادقین سے ہماری ملاقات لاہور میں ۶۶ء میں ہوئی اور اس بار انہیں کی فرمائش پر ہوئی۔ بڑے اشتیاق اور محبت سے ملے اور آئندہ بھی ملتے رہے۔ نور کے چھوٹے بھائی قمر جعفری سے ان کی دوستی تھی اس لیے ادب آداب بھی ہمیشہ مد نظر رکھتے۔ حالانکہ قابلِ تعظیم تو ان کا فن تھا۔ ان کی شخصیت تھی۔ نور کا تبادلہ اسلام آباد ہو چکا تھا۔ سرکاری

افسر تو نور اب بھی تھے لیکن اب صادقین سے ہمارے رشتے دوسرے تھے۔ اب میں ان کی بہن تھی۔ بڑی بہن کہا تو آخری سانس تک اس رشتے کو نبھایا۔

صادقین لاہور' کراچی' اسلام آباد جہاں بھی رہے ہم سے دُور نہیں رہے۔ ہمارے گھر آتے رہتے۔ کبھی ہمیں ان کے پاس جانے میں دیر ہو جاتی تو ان کا تقاضا آتا۔

ان کے انتقال کے بعد کاغذات میں ان کا لکھا ہوا ایک پرچہ ملا جس پر تحریر تھا۔

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

میں نے کاغذ کے اس بیش بہا ٹکڑے کو فریم کروا کر ان کے شاہکار "اِنّا انزلنا" کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم کی آبرو بنا لیا ہے۔

جب کراچی میں ۷۰ء میں پہلی بار ان کی خطّاطی کی نمائش ہوئی تو میں نور کی طویل بیماری کے سلسلے میں وہیں جناح اسپتال میں تھی۔ کہیں جانے کی ہمّت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ صادقین کا پیغام ملا تو بچّوں کو ساتھ لے کر اس نمائش میں گئی۔ بہت خوش ہوئے۔ اپنے سب کارنامے دکھاتے رہے۔ ان سے باتیں کرتی' داد دیتی' گھومتی پھرتی جب میں "کُن فیکون" کے سامنے پہنچی تو سحرزدہ سی دیکھتی ہی رہ گئی۔ فنکار نے تخلیقِ کائنات کی ایسی منظر کشی کی تھی کہ موجود اور ناموجود دونوں ہی نگاہوں کے سامنے تھے۔

"کہئے کیسی ہے؟"

انہوں نے کہا تو میں چونکی۔ نور کی طویل علالت سے دل دُکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا "صادقین اس کی توصیف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ صرف آنسو کا نذرانہ پیش کر سکتی ہوں۔" نمائش ختم ہو گئی۔ ہم لوگ بھی اسلام آباد پہنچ گئے تو ایک دن فون آیا "کُن فیکون" کی خطّاطی منگوا لیجیے۔"

میں حیران رہ گئی: میں نے کہا

صادقین مجھے علم ہے کہ اس خطاطی کو خریدنے کے خواہش مند بہت لوگ تھے جن میں ایران کا ایک وزیر بھی تھا۔ لیکن آپ نے تو خریدار کو مایوس کیا تھا قطعی انکار کر دیا تھا۔ اور اب آپ یہ بے مثال تحفہ مجھے دے رہے ہیں۔ میں آپ کا شکریہ بھی کیسے ادا

کروں"

کہنے لگے۔

سیٹھوں اور وزیروں کے چیک واپس کرنے کا اپنا مزہ ہے۔ اور آپ کو معلوم نہیں ہے آپ نے اس کی قیمت ادا کردی ہے۔"

ان کے بھائی کاظمین مرحوم اسلام آباد میں رہتے تھے۔ ان کی آخری بیماری کے زمانے میں ہم نے صادقین کا ایک اور روپ بھی دیکھا۔ بہت کماتے اور بہت لٹاتے ہوئے تو ہم نے انہیں دیکھا تھا لیکن بھائی کی بیماری میں انہوں نے اپنے آپ کو بھی تج دیا اپنا شغل پینا پلانا سب چھوڑ دیا تھا۔ قلم اور مُوقلم ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔ تین مہینے وہ بھائی کے پلنگ کی پٹی سے لگے بیٹھے رہے۔ بڑی مشکل سے ایک دو بار بڑے اصرار سے انہیں اسلام آباد کلب لے گئے تاکہ وہاں وہ اپنا شوق پورا کرسکیں جو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ان کے دکھ کی چبھن کو کچھ کم کردے۔

اس پاک طینت شخص کو اس کے انتقال کے بعد میں نے عمرے کے موقع پر مکہ معظمہ میں خواب میں دیکھا۔ صاف شفاف کپڑے پہنے ہوئے' بے حد خوش' کسی شاندار دعوت کے انتظام میں مصروف' اور حسبِ عادت مجھ سے داد طلب کرتے ہوئے۔

اپنے بھائی کاظمین کے انتقال کے بعد جب وہ اسلام آباد آتے تو کبھی کبھی ہمارے گھر قیام کرتے اور یہ ان کے طریقِ روز و شب کے لیے آسان فیصلہ نہیں تھا۔ ہمارے گھر جب ان کی تشنگی پر دو تین دن گزر جاتے تو ایک صبح بڑی لجاجت سے مجھ سے "روزہ" کھولنے کی اجازت مانگتے اور دن بھر کے وعدے پر اپنے کسی ہم مشرب دوست کے گھر چلے جاتے۔ یہ ایک دن ہمیشہ چار پانچ دن طویل ہوتا۔ واپس آتے تو پھر چھوٹے بھائی کی طرح معافی مانگتے۔

کبھی کبھی میں انہیں یاد دلاتی کہ جب واپڈا کے زیر اہتمام وہ منگلا ڈیم کے لیے میورل بنا رہے تھے تو انہوں نے ہم سے ملنا گوارا نہیں کیا تھا۔ شرمندہ کبھی نہیں ہوئے۔

واپڈا کے محکمے میں معائینے اور ترقیاتی پروگرام کے تحت نور مختلف کم آباد دور دراز

علاقوں تک بھی جاتے رہتے تھے۔ سفر موٹر سے ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے ساتھ چھوٹے بڑے شہروں کے علاوہ اپنے دیس کے بہت سے خوبصورت آنکھ او جھل مناظر دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ پاکستان میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے معروف اور مشہور قابلِ دید مقامات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور اب تو آسانیاں بھی بہت ہیں۔

اس پانچ سال کے عرصے میں دل و نگاہ نے بڑی آسودگی حاصل کی۔ پہاڑ' وادی' ندی' نالے' میدان جدھر بھی موقع ملا جا نکلے۔ اور ہر پھیرے کا حاصل کوئی تجربہ' کوئی اَن دیکھی دنیا' بات یوں ہے کہ اگر مطالبہ ہی کم کیا جائے تو چٹکی بھر خوشی سے بھی دامن بھر جاتا ہے۔

ایک بار واپڈا کے کسی منصوبے کے سلسلے میں نور اپنے عملے کے کچھ لوگوں کے ساتھ جمرود گئے۔ راولپنڈی سے ہم نے عطیہ اور معین حُسن کو بھی ساتھ لیا۔

جمرود قبائلی علاقہ ہے۔ ان لوگوں کو پہلے سے اِطّلاع دے دی گئی تھی۔ اور وہاں اس مختصر سے قافلے کا انتظار ہو رہا تھا۔ مگر انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس میں عطیہ اور میں دو غیر متوقع مہمان بھی شریک ہیں۔ بہرحال اس کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بیٹھک میں سب کو بٹھایا' قہوہ پیش کیا اور مرد گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ ہمارے سب میزبان پوری طرح مسلح تھے۔ جنہیں دیکھ دیکھ کر میں اور عطیہ سہمی بیٹھی تھیں۔ اور وہاں دور دور تک کوئی عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بیٹھک سے ملحق جو مکان تھا وہ باہر سے پہاڑی کا حصّہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ پتھروں سے بنی ہوئی چٹان سی دیوار جس کی اونچائی پر جگہ جگہ مَوکھے تھے جو دشمن کو دیکھنے اور اس پر گولی چلانے کے لیے ان گھروں میں بنائے جاتے ہیں۔ اس گھر کے اندر جانے کا بظاہر کوئی دروازہ نہیں تھا۔

ہم سے زیادہ دیر صبر نہیں ہو سکا۔ کچھ گھبراہٹ' کچھ جستجو اور کچھ اشتیاق بھی۔ آخر ہم نے زنان خانے میں جانے کی خواہش کا بے ساختہ اظہار کر ہی دیا۔ احساس ہوا کہ ہماری یہ فرمائش بھی ہماری آمد کی طرح ان کے لیے خلافِ توقّع تھی۔ لیکن یہ قبائلی لوگ جتنے درشت مزاج نظر آتے ہیں اتنے ہی نرم خو بھی ہوتے ہیں۔ خصوصاً اپنے مہمانوں

کے لیے فوراً ہی ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر ہم ایک چھوٹے سے دروازے کے آگے کھڑے تھے۔ مرد کی دستک پر دروازہ کھلا اور ڈھکے چھپے خوف اور تجسس کی انگلی تھامے ہم اندر کی جانب بڑھے۔ ہمارا رہ نما واپس چلا گیا۔

سامنے صاف ستھرا پکا صحن تھا۔ ایک طرف پانی کا نلکا لگا ہوا اور دیواروں کے ساتھ کچھ حجرے۔ خاصی آباد حویلی تھی لیکن ہمیں دیکھ کر ان میں سے کسی چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ پریشانی' نہ اجتناب' نہ خیر مقدم۔

وہ ہمیں ایک حجرے میں لے گئیں جہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھی رہیں ہم نے گفتگو کرنا چاہی لیکن زبان کی اجنبیت نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ تھوڑی دیر کی بعد ایک بہت بڑے طباق میں چاول جس پر بُھنے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے پارچے رکھے ہوئے تھے اور طباق ہی کے سائز کی روٹیاں اور چپلی کباب ہمارے سامنے رکھے گئے۔ بھوک بالکل نہیں تھی لیکن انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ آخر بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور ہم اپنے خوش اطوار اور بے نیاز میزبانوں سے رخصت ہوئے۔ یہ صدیوں پرانی روایت میں گندھا ہوا معاشرہ تھا۔

ہماری واپسی کے وقت قبیلے کے ایک معتبر شخص نے مہمان بیبیوں کو کچھ نذرانہ پیش کرنا چاہا جسے بڑی مشکل سے نامنظور کیا جا سکا۔

قبائلی علاقے میں یہ میرا پہلا اور آخری سفر تھا۔

پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہم کئی بار گئے۔ ان پہاڑوں اور وادیوں میں جبروت بھی ہے اور حُسن بھی۔ قدرتی مناظر میں نے باہر کے ملکوں میں بھی دیکھے ہیں۔ وہاں ان کی دیکھ بھال اور سجاوٹ کا خاص اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ جس میں دولت اور مہارت دونوں ہی کا حصہ ہے۔ مگر اپنے دیس میں فطرت کا جو حُسن ہم نے دیکھا وہ دستِ انسان کا مرہونِ منت ہوئے بغیر بھی مسحور کر دینے والا تھا۔ پاکستان میں محکمۂ سیاحت تو بعد میں وجود میں آیا ہے۔ ہم نے جو دیکھی وہ تو ایک اور ہی دنیا تھی۔ حمد و ثنا کی دنیا۔ متمدّن اور مہذب معاشرے کی تمام آلودگیوں' تکلف اور تصنع کی ملاوٹ سے پاک' الگ تھلگ' بے نیاز و

بے پروا۔

فرش پر جھرنوں کی چاندی بکھری ہوئی' ہواؤں میں نکہتوں کے رنگ گھلے ہوئے۔ اکثر جگہ تو روپ اور سنگار نے پھولوں اور تتلیوں میں فرق ہی نہیں رہنے دیا تھا۔ گلِ خنداں اور گلِ رقصاں اور دونوں ہی حد نگاہ تک۔

تتلیاں کبھی ہمارے باغیچوں میں بھی نظر آیا کرتی تھیں۔ اب تو اچھے دنوں کی طرح کراچی سے تتلیاں بھی کہیں دور دیس ہجرت کر گئی ہیں مگر ابھی تو میں اچھے موسموں کی اچھی باتوں کو یاد کر رہی ہوں۔ اور وہ بھی صرف چند وادیوں اور کچھ مناظر کی حد تک۔ محبت کے لمحۂ اوّلین کی طرح نگاہوں کی پہلی پہلی حیرت اور محویت کو تفصیل سے بیان بھی کیسے کیا جائے۔ اور کیوں۔ میں کوئی سفرنامہ تو تحریر نہیں کر رہی ہوں۔

ایک نہایت خوبصورت شام یاد آگئی جس کے عقب میں میرے لیے خوف سے اَٹی ہوئی ایک پوری رات بھی تھی۔ کسی نے مانسہرہ کے قدرتی مناظر کی تعریف کی اور ہم ایک دو دن کے لیے روانہ ہو گئے۔ صبیحہ اور عزی ساتھ تھے۔ عامر ابھی ہماری دنیا میں نہیں آئے تھے۔

ایبٹ آباد سے مانسہرہ کا راستہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ پہلو بدلتے رخ موڑتے ہوئے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ شاداب درختوں نے سڑک کی دوسری جانب کی گہری کھائیوں کو بھی دلفریب بنا دیا تھا۔ دن ڈھلے ہم وہاں پہنچے اور بڑا سی میں پہاڑی کی چوٹی پر اونچے گھنے درختوں سے گھرے ہوئے تنہا ڈاک بنگلے کو آباد کیا۔ جہاں دور دور تک وادی میں بھی کسی بستی کسی گھر کے آثار موجود نہیں تھے۔ ڈاک بنگلے میں صرف ایک بوڑھا چوکیدار تھا جو اس طلسماتی ماحول میں کسی پرانی روح کی طرح نظر آتا تھا۔

اس بلندی سے آس پاس کا منظر قابلِ دید تھا۔ دُوریاں بھی نزدیک آگئی تھیں۔ کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ قدموں تلے سبز گھاس کی چادر بچھی ہوئی۔ سر پر گھنے درختوں کی چھاؤں کا سائبان سامنے ایبٹ آباد کی جانب بے تابانہ دوڑتی ہوئی سڑک۔ تیز ہوا میں کسی سفید آنچل کی طرح لہراتی بل کھاتی ہوئی۔

ہم لوگ پتھروں کا سہارا لیتے' موہوم پگڈنڈیوں کو ڈھونڈتے ڈاک بنگلے سے نیچے وادی کی جانب کچھ دور تک سنبھل سنبھل کر چلتے اور گھومتے رہے۔ وہ ایک دلکش اور شگفتہ شام تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور اونچی ڈھلانوں پر اُڑتا ہوا اور بکھرا ہوا دھوپ کا بسنتی رنگ جس کے عکس سے نیچے وادی میں سبزہ و گل دور سے بھی نگاہوں کو تھام رہے تھے۔ خوشگوار خنک ہوا دھیمی چال چل رہی تھی۔ رخصت ہوتے ہوئے سورج کی آخری نارنجی شعاعوں کے ساتھ ہم ڈاک بنگلے میں واپس آگئے۔ اس پہاڑی بنگلے سے غروبِ آفتاب کا نظارہ بے حد حسین تھا۔

لمبے سفر اور سیر و تفریح کی ہنگامہ خیزی سے تھک کر نور اور دونوں بچے کھانا کھا کر فوراً ہی سو گئے۔ مگر پہاڑوں کے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے سکوت نے مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دیا۔

یہ سرکاری سفر نہیں تھا اس لیے نور نے دفتر سے ڈرائیور یا کوئی چپراسی ساتھ نہیں لیا تھا' اس غیر آباد علاقے اور ویران بنگلے میں دو چھوٹے بچوں کے ساتھ صرف ہم دونوں تھے۔ نہ وہاں ٹیلی فون تھا نہ اس علاقے میں دور دور تک کسی سے واقفیت۔ شام کو نور اپنے بائیں بازو میں درد کی شکایت بھی کر رہے تھے۔ سناٹوں کا شور بڑھا تو مجھے ایک چھوٹی سی خبر بھی یاد آگئی۔ کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ انہیں دنوں اس علاقے کے پہاڑوں میں کوئی چیتا دیکھا گیا تھا۔

انسان واقعی تھڑدلا ہے۔ میں خوف کے تشنج میں اسیر تھی اور ہم سب کی حفاظت کرنے والا ہمارے پاس' ہمارے ساتھ اس لمحے بھی موجود تھا وہ جو قدرتوں والا ہے اور رحیم و کریم ہے۔ وہ جو زندہ ہے اور زندگی بھی ہے۔

یہ گناہ مجھ سے ہوا کہ میں نے وہ پوری رات واہموں میں گرفتار کُھلی آنکھوں کاٹی۔ کبھی دروازوں کا جائزہ لیتی کبھی شیشوں میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کرتی۔ کہیں دور اتفاقاً کوئی جگنو بھی نظر آجاتا تو وہ مجھے اس چیتے کی آنکھ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

اور پھر جب پہاڑ کی صبح اپنی تمام ندرتوں کے ساتھ حیاتِ نو کی طرح طلوع ہوئی تو

اس طویل رات کا سارا ظلم و جور بھول ہی گئی۔ نور سے ذکر بھی نہیں کیا۔

مانسہرہ سے گڑھی حبیب اللہ اور بالاکوٹ کی جانب روانہ ہوئے تو راستے ہی میں ایک شوخ و شنگ پہاڑی ندی سے ملاقات ہوئی۔ یہ تمام پہاڑی ندی نالے جو آگے جاکر بڑے دریاؤں میں مل جاتے ہیں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔

بالاکوٹ میں ہم نے حضرت اسمٰعیل شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ تھوڑی دیر شوخ رفتار دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھے رہے۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن تنک مزاج تھا اور بہت ٹھنڈا بھی۔ اس لیے زیادہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ شفاف پانی کی تہہ میں لہروں کی دھار سے ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر بے حد خوبصورت نظر آرہے تھے۔ ان پر کہیں کہیں رنگوں کی دھاریاں بھی تھیں۔

کہتے ہیں کہ کسی مغل شہزادی نے اس پہاڑی دریا کو "نین سُکھ" کا لقب دیا تھا۔ شہزادی کو آشوبِ چشم کی شکایت تھی۔ اس نے کشمیر جاتے ہوئے راستے میں اس کے پانی سے آنکھیں دھوئیں تو آرام آگیا۔ گڑھی حبیب اللہ میں چھوٹا سا بازار بھی تھا۔ وہیں کہیں کسی کھوکھے سے میں نے کالی چاندی کے کنگن خریدے۔

کچھ عرصے کے بعد ہمارا اگلا سفر بھی کم دلچسپ نہیں تھا۔ جب منگورہ اور سیدو شریف ہوتے ہوئے ہم سوات کی صد رنگ وادی تک پہنچے۔ کہیں سرکشیدہ پہاڑ، کہیں گلیشئر، کہیں تند و تیز دریا، ہرے بھرے ناہموار میدان اور سڑک کے کنارے اخروٹ خوبانی وغیرہ کے درخت۔

تیز رفتار دریائے سوات مدین اور بحرین تک ہمارا ہم سفر رہا۔ بحرین میں کچھ اور پہاڑی ندی نالے بھی آکر اس سے مل جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کی تند رفتاری اور شور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں دریا کی بے قراری دیدنی تھی۔ بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتا، جھاگ اُڑاتا ہوا رواں دواں۔ بحرین میں ہر جگہ پانی کے اس شفاف اور مضطرب آئینے کی کرچیاں اور ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے یہ پورا قصبہ ہی سطحِ آب پر تعمیر کیا گیا ہو۔ کہیں کہیں دریا عبور کرنے کے لیے رسّی یا لکڑی کے پُل بھی بنے ہوئے تھے۔

سب سے انوکھی جگہ بحرین میں ہمارے لیے وہ قیام گاہ تھی جو دریا کے پاٹ پر لکڑی کے تختے جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ دو کمروں کے اس چھوٹے سے دلچسپ ریسٹ ہاؤس میں ہم نے کچھ دیر قیام کیا۔ پانی کی پیہم روانی دیکھ کر لگتا تھا جیسے ہم کسی بجرے میں سوار ہیں۔ انہیں تند خُو برگشتہ مزاج پانیوں کو قابو میں لاکر کالام میں بجلی گھر بنانے کی تجویز تھی۔ جس کے طفیل ہمیں یہ خوبصورت علاقے دیکھنے کا موقع مِل گیا۔

کالام کا راستہ آسان نہیں تھا۔ اس زمانے میں بڑی حد تک خطرناک بھی تھا۔ ایک جانب پہاڑ کا ناہموار سلسلہ دوسری طرف گہرے کھڈ اور اتنی پتلی سڑک کہ اس پر صرف یک طرفہ ٹریفک جاری رہ سکتی تھی۔ اس لیے کالام جانے اور وہاں سے واپس آنے والی گاڑیوں کے لیے اوقات مقرر تھے۔

سامنے سے آتا ہوا اونٹوں کا ایک قافلہ مِلا تو ہماری موٹر چٹانوں کے بیچ ایک کونے میں دبک گئی۔ قافلہ گزرنے کے بعد آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوا۔

یہ پورا پہاڑی سلسلہ بنجر تھا۔ اوپر نیلا آسمان نیچے گھاٹیوں میں دمکتا ہوا اُجلا سفید پانی اور کہیں کہیں جھاڑیاں۔ یہی بے تاب و بے سکون پہاڑی ندی نالے اپنی تکمیل کی جستجو میں سرگرداں، اپنا راستہ خود بناتے ہوئے آس پاس کی ندیوں کی سنگت میں آگے بڑھ کر میدانی علاقوں میں سُبک خرام، نرم مزاج اور وسیع داماں دریا کا رُوپ دِکھاتے ہیں۔ مقصدِ حیات حاصل کرلینے کے بعد کی آسودگی۔

کالام کی وادی میں داخل ہوئے تو راستے کی سختیوں کو بھول ہی گئے۔ سر سبز و شاداب وادی، خیر مقدم کرتے ہوئے درخت، سامنے ہری بھری گھاس کا فرش بچھا ہوا۔ اور دور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں سورج کے مقابل روشنی برساتی ہوئی۔

یہاں ہمارا قیام ایک ہفتے رہا۔ آس پاس کے کئی علاقوں تک گئے اتروڑ، اوشو وغیرہ۔

ایک بار حجاب امتیاز علی کے سامنے اتروڑ کا نام لیا تو گھبرا کر پوچھنے لگیں کہ "اس لفظ کی ادائیگی سے آپ کے گلے میں خراش تو نہیں آگئی؟"

اس زمانے میں دوسرا قابلِ ذکر سرکاری سفر ہم نے وادئ کاغان کا کیا۔ بالا کوٹ سے

جیپ میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ ان راستوں پر صرف جیپ ہی جا سکتی تھی۔ یہ پانچ گاڑیوں کا قافلہ تھا۔ ہمارے ساتھ فریدہ اور وسیم جعفری بھی تھے اور ہمارے تینوں بچے صبیحہ، عزمی اور عامر۔ دو گاڑیوں میں ہم تھے۔ ایک میں کھانے پینے کا سامان، ایک میں بستر وغیرہ اور ایک میں نور کے عملے کے کچھ لوگ۔

یہ تقریباً تیس برس پہلے کی بات ہے۔ اب ان تمام علاقوں میں آمد و رفت کی دشواریاں دور ہو چکی ہیں۔ سڑک بھی پختہ ہے اور سیاحوں کو تمام سہولتیں بھی حاصل رہتی ہیں۔

اس وقت ہمارا قافلہ جس سڑک پر جا رہا تھا وہ نیم پختہ تھی۔ راستے میں گلیشئر اور پہاڑی تودوں کے گرنے کا خطرہ بھی موجود تھا۔ یہ سڑک پہاڑوں کے سلسلے کے ساتھ ساتھ ایک سہمی ہوئی پتلی سی لکیر کی طرح تھی جس کی دوسری جانب گہرے کھڈ اور گھاٹیاں تھیں جن میں پگھلی ہوئی برف کا پانی دمک رہا تھا۔ راستہ دشوار گزار تھا مگر منزلیں دور نہیں تھیں۔ اچانک ہی کسی موڑ پر ہم کسی سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ جاتے۔

ہمارا پہلا پڑاؤ شوگراں تھا اور اس کے بعد کاغان۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کے حصار میں یہ دونوں نہایت سرسبز و شاداب خطّے ہیں۔ شیریں پانی کے چشمے، سربلند درخت اور سبزہ و گل کی افراط۔

ہماری منزل ناران تھا جہاں کئی دن قیام کیا۔ ایک طرف دیودار کا گھنا جنگل، سامنے سر اٹھائے ہوئے پہاڑ، کہیں نزدیک ہی گنگناتا ہوا دریائے کنہار اور چپّے چپّے پر رنگ ہی رنگ۔ زمین کی ہتھیلی پر پھول ہی پھول اور ہوا کے دوش پر گل پیرہن تتلیاں۔ کسی مصوّر نے ایسی مکمل تصویر کہاں بنائی ہو گی۔

کنہار دریا میں ٹھنڈے پانی کی مچھلی ٹراؤٹ پرورش پاتی ہے۔ جو ہر روز کھانے کی میز پر موجود ہوتی۔ اس مچھلی کے شکار کے لیے خاص طور پر اجازت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کے عملے کو مہمانوں کے لیے ٹراؤٹ پکڑنے کی اجازت تھی۔

مجھے کاغان، ناران اور دوسری وادیوں کے حسین مناظر یاد ہیں۔ اور اس حُسن کی گود میں

جو دُکھ اور محرومیاں نظر آئیں وہ بھی نہیں بھُولی ہوں۔ جہاں نگاہوں کو راحتیں بانٹنے میں قدرت اتنی فیّاض ہے وہیں جفاکش مَردوں اور محنتی عورتوں کے چہرے پر چھایا ہوا مفلسی اور ناداری کا کثیف دھواں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کِھلتے ہوئے گلاب جیسے چہروں والے بچے چیتھڑوں میں ملبوس تھے۔ اور برف پر ننگے پاؤں چلنے پر مجبور۔ کسی رخسار پر آنسو کی لکیر جمی ہوئی، کسی ہونٹ پر سہمی ہوئی مسکراہٹ۔ مرد روزی کی تلاش میں میدانوں کا رخ کرتے ہیں تو عورت دہرا عذاب سہتی ہے۔

ہم ناران میں ایک ہفتہ ٹھہرے۔ وہیں سے لالہ زار اور جھیل سیف الملوک دیکھنے بھی گئے۔ پہلے لالہ زار گئے۔ بوڑھے پہاڑوں کی اونچی دیوار اوٹ دلکش اور شاداب، لالہ زار قابلِ دید مقام ہے۔ مگر اس کے راستے میں جس کیفیت سے میں دوچار ہوئی وہ قابلِ رشک نہیں تھی۔ جن سنگین حجابوں میں یہ وادی مستور ہے انہیں عبور کرنا ہمّت آزما تھا۔

تھوڑا فاصلہ طے ہوا نگاہ اٹھائی تو سامنے والی جیپ جیسے کسی دیوار پر مصروفِ سفر نظر آئی ہم تقریباً" عمودی سڑک پر جارہے تھے۔ سہم کر بچّوں کو اپنے قریب کھسکالیا۔ اور جو دعائیں یاد آئیں پڑھنا شروع کردیں۔

بچے اس منظر سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ عامر تو بہت چھوٹے تھے صبیحہ اور عزمی کہنے لگے اگر یہاں ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کتنا مزا آئے گا۔ ہم لوگ دریا کے ساتھ سیدھے کراچی پہنچ جائیں گے۔

مجھے کراچی جانے کا یہ سیدھا راستہ منظور نہیں تھا۔ مگر بچّوں کو خوف زدہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کچھ اور انہماک سے دعاؤں میں مشغول ہو گئی۔

لالہ زار کے حسن و رنگ میں تو کوئی شبہ نہیں مگر شاید بچّوں کے جملوں کا اثر تھا کہ وہاں پہنچ کر بھی اسی سڑک سے واپسی کا خیال ذہن پر حاوی رہا۔

جھیل سیف الملوک کا راستہ بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔ جگہ جگہ سڑک پر سخت جمی ہوئی برف کی وجہ سے پھسلن پیدا ہو گئی تھی۔ ایسی جگہ ہم لوگ پیدل آگے بڑھتے اور

ڈرائیور درختوں کی سُوکھی ٹہنیاں برف پر بچھا کر جیپ کے لیے گزر گاہ بنا لیتے۔ ایک جگہ گلیشئر نے سڑک کو بند کر دیا تھا۔ یہاں ہمیں خاصا فاصلہ برف پر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے طے کرنا پڑا۔ سُوکھی ٹہنیوں اور بیلچے کی مدد سے جیپ رینگتی ہوئی آگے بڑھ سکی۔ مگر یہ راستہ دلچسپ تھا۔

اور پھر ہم رنگ و نور کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے جہاں پلک جھپکنا آنکھ کی تقصیر معلوم ہو۔ فاصلے سے دیکھا تو جیسے سفید بدلیوں کے ساتھ آسمان کا کوئی ٹکڑا زمین پر بچھا ہو۔ اور پاس پہنچے تو دور پہاڑوں پر دمکتی ہوئی برف اب ہمارے قدموں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی اور سامنے سیف الملوک جھیل کا نیلا پانی ہمیں تک رہا تھا۔ اُجلی دھوپ اور ہوا میں پاکیزگی سی۔ جھیل کے آس پاس بکھرے ہوئے پتّھروں کے درمیان برف کی قربت سے بے نیاز چھوٹے چھوٹے پودے جن کے سبز پتّوں کی ہتھیلیوں پر اودے اودے پھول سجے ہوئے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا چائے خانہ بھی کسی نگینے کی طرح جَڑا ہوا تھا۔

جھیل سیف الملوک میں سیّاحوں کی مدارات کے لیے دو کشتیاں موجود تھیں۔ ملّاح چپّو چلا رہے تھے اور ہم کبھی آس پاس کے منظر کو دیکھتے کبھی بچّوں کو سنبھالتے۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ چھونے کی ہمّت نہ ہو سکے۔ اور اس پانی کی کوئی تھاہ بھی نہیں تھی۔ واپس زمین پر پہنچے تو اطمینان کی سانس لی۔

جھیل کے آس پاس کچھ چھوٹے چھوٹے پتّھر نظر آئے جن پر افشاں سی چھڑکی ہوئی تھی۔ ایسے دھیمے دھیمے جھلملاتے ہوئے سنگ پارے میں نے کبھی کہیں نہیں دیکھے۔ فضا ایسی تھی کہ کہانیوں والی پریوں کے وجود پر یقین کرنے کو جی چاہا۔

سیف الملوک سے واپسی میں چند پتّھر اور کچھ اودے پھول بھی اپنے ساتھ لے چلی۔ پھولوں کے پودے تو فوراً ہی مرجھا گئے۔ پشیمانی سی ہوئی۔ مگر پتّھر اپنی مدھم مدھم دمک کے ساتھ کافی عرصہ میرے پاس رہے۔ پھر شاید پریاں انہیں واپس لے گئیں۔

کچھ اور یادیں

لاہور کے ساتھ یادوں کے بہت سے سلسلے ہیں۔ ۷۶ء میں ایک مرتبہ پھر وہاں نور کا تقرر اسٹاف کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ہوا۔

سچی بات یہ ہے کہ اس بار اپنا اسلام آباد کا گھر چھوڑتے ہوئے میں بہت اداس تھی۔ کراچی سے دارالحکومت کی منتقلی کے بعد جب ہم لوگ اسلام آباد کے نئے بنے ہوئے گھروں میں بسائے گئے تھے تو وہ دراصل گھر نہیں تھے جہاں کوئی درخت نہ ہو سبزہ وگل نہ ہو اسے اپنا گھر کیسے مان لیا جائے۔ مگر ہمیں رہنا اسی سرکاری مکان میں تھا۔ اور ابھی تو پورا شہر ہی نیم خوابیدہ تھا۔

ہمارے گھر کے صحن میں کیاریاں بنی ہوئی تھیں مگر ان میں بھی کچھ سوکھی ہوئی شاخیں سی لگی ہوئی دکھائی دیتیں۔ کونپلیں کہیں تھیں بھی تو ڈری سہمی اندھیروں اُجالوں سے اپنا پتہ پوچھ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے رنگ اور خوشبو سے ہمارا رابطہ قائم ہو رہا تھا۔ کئی طویل مہینے اسی بے سروسامانی میں گزارنا پڑے۔ اور پھر انہیں سُوکھی ٹہنیوں کو ہم نے نوخیز اور نکہت بار درختوں کے روپ میں بھی دیکھا۔ ہوائیں شگوفوں کو چُھو کر ہمارے پاس آتیں۔ جس خطۂ زمین کی ویرانیوں سے نباہ کرنا پڑا تھا اسے بہاراں بہاراں شہر دیکھنے کی راحت بھی حاصل ہوئی۔

اس سعی مشکور میں کیپیٹل ڈوپلمنٹ اتھارٹی کے ساتھ ہم سب مکینوں کی شرکت بھی کم نہیں تھی۔ اسلام آباد سے لاہور روانہ ہو رہی تھی تو اپنے گھر کے سب درختوں کے پاس گئی۔ افسردہ نگاہوں نے ان سے رخصت چاہی جو دس گیارہ سال میرے رفیق رہے تھے۔ بے شک نور کا تبادلہ ترقّی کے ساتھ ہوا تھا اور وہ بہت خوش تھے۔ میری اُداسی

دور کرنے کے لیے بار بار اسٹاف کالج کے سبزہ زار، درختوں اور پھولوں کا ذکر کرتے۔ مگر مجھے اندیشہ تھا کہ اس نئے گھر کے پرانے درختوں سے میرا رشتۂ اخوت قائم نہیں ہو سکے گا۔

اسلام آباد کا جو گھر چھوڑ رہی تھی اس میں میری خوابگاہ کے دریچے کے سامنے وہ خوبصورت ہرا بھرا درخت بھی تھا جس کے ننھے سے پودے کو اپنے آنگن میں میں نے خود لگایا تھا۔ اس سے ایک وعدہ بھی کیا تھا اور "میلادِ بہار" نظم لکھی تھی۔

رازداں بہاروں کے!
تم کہ طفلِ ناداں ہو
جانے کس گُلستاں سے
میرے پاس آ پہنچے
کتنے پیار سے میں نے
اپنے گھر کے آنگن کی
تم کو آبرو بخشی
سال بیت جائیں گے
جب بہار آئے گی
ریشمیں شگوفوں کی
پنکھڑیوں کے سازوں پر
زمزمے بکھیرو گے
اپنے آپ میں کھو کر
نکہتوں کے شہ پارے
لوحِ جاں پہ لکھو گے
سوچ ہر جوانی کی

ناز سب حسینوں کے
ایک جیسے ہوتے ہیں
(اپنے عکس کے آگے
سارے رنگ پھیکے ہیں)
جب بہار آئے گی
جانے میں کہاں ہوں گی
پیچ و خم سے بنتی ہے
منزلوں کی پگڈنڈی
تم تو بھول جاؤ گے
لمس میرے ہاتھوں کا
خواب میری آنکھوں کے
میں تمہیں نہ بھولوں گی
میں کہ فطرتاً ماں ہوں

پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج کی تمام عمارتیں مال روڈ پر تقریباً" آٹھ دس ایکڑ کے رقبے میں ہیں۔ سامنے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل' ایک طرف گورنمنٹ ہاؤس اور دوسری جانب ایچی سن کالج۔

کالج کی مرکزی عمارت جہاں اب تدریسی اور تربیتی کام ہوتا ہے اور ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم ہے وہاں پہلے پنجاب کلب تھا۔ یہ عمارت رومن طرزِ تعمیر کے مطابق بنی ہوئی ہے۔ جس کے پورچ اور برآمدوں میں اونچے اونچے سفید گول ستون ہیں۔ یہ ایک تاریخی عمارت ہے۔ یہیں ریڈ کلف ایوارڈ کے کاغذات تیار ہوئے تھے۔

مرکزی عمارت کے علاوہ اس احاطے میں ہوسٹل اور پرنسپل اور عملے کے مکانات ہیں۔ ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ اور شاداب سبزہ زار ہیں۔

ماحول شاندار بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ ہمارے گھر کے دروازے پر درختوں کا پہرہ تھا اور نشست گاہ کے پیچھے سفید اونچے ستونوں والا باوقار برآمدہ اور چبوترہ۔ سامنے دور تک فرش زمیں پر سبزہ و گل اور اس سے آگے حد نگاہ تک جواں سال اور عمر رسیدہ درخت۔

لاہور پہنچ کر مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ مگر میرے لیے کچھ مشکلات بھی تھیں۔ کالج کے پورے احاطے میں گیارہ مالی کام کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی ہمارے لان میں ہروقت موجود ہوتا۔ اور میں سویرے سویرے وہاں اوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر ننگے پاؤں بکھرے بالوں گھومنا چاہتی۔ میرا یہ رویّہ اس گھر کے آدابِ رہائش کے خلاف تھا۔ مجھے یوں دیکھ کر ان اجنبی آنکھوں میں ایسا استعجاب ہوتا جس کی تاب لانا دشوار ہو جاتا۔

نور کے دفتر اور عامر کے ایچی سن کالج جانے کے بعد میں دروازے کی جالیوں سے جھانکتی اور بیگانہ نگاہوں کی مداخلت سے بچتی ہوئی باہر نکلتی۔ اور پھر گلابی دھوپ اور کاسنی چھاؤں اور ریشمیں گھاس کی خوشگوار نمی اور باتیں کرتی ہوئی تنہائی اور میں۔ وہی تو اپنے آپ سے ملاقات کی ساعت ہوتی۔ میرے لیے تو وہی نور ظہور کا وقت ہوتا تھا۔

ایک دن میں اس وسیع و عریض سبزہ زار کے ایک ایسے آنکھوں سے اوجھل کونے تک پہنچ گئی جو مالیوں کے التفات سے محروم تھا۔ وہاں اونچے اونچے پرانے درختوں کی چھاؤنی تھی۔ سرپر پتّوں اور شاخوں کا شکستہ سائبان جس میں الجھ کر دھوپ کے کچھ ٹکڑے زمین پر بکھر گئے تھے اور قدموں میں سُوکھے ہوئے پتّے۔ جیسے کسی جنگل کا کوئی حصّہ چُھپ چُھپا کر اس ہرے بھرے علاقے میں پہنچ گیا ہو اور وہاں پہنچ کر شرمندہ بھی نہیں تھا۔ اس کی اپنی ہی ایک آن تھی جو دل کو چُھوتی تھی۔

مجھے ان بزرگ درختوں کی سنگت پسند آ گئی۔ یہاں میری سوتی جاگتی تنہائی کا طلسم ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ جس صبح موقع ملتا ہاتھ میں قلم اور کاپی لے کر میں اس کونے میں پہنچ جاتی اور زمین پر پڑے ہوئے سُوکھے پیڑ کے تنے پر بیٹھ کر سوچتی رہتی۔ لکھتی رہتی مگر یہ آسایش بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔

میں لکھنے میں منہمک تھی اچانک کاپی کے ورق پر ایک مہیب سایہ آکر ٹھہر گیا۔ گھبرا کر نگاہ اٹھائی تو سامنے دفتر کا چپراسی ہاتھ میں ڈاک تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جتنی حیرت تھی اس سے زیادہ سوال تھے۔

اس نے اس بے سروسامانی کے عالم میں گھٹنے پر کاپی رکھ کر لکھتے ہوئے یہاں کسی کو کب دیکھا تھا۔ گھر کے کھلے ہوئے برآمدے میں میز بھی تھی، کرسیاں بھی تھیں اور وہاں سے دستور کے مطابق لان میں کام کرتے ہوئے مالیوں کو ہدایات بھی دی جاسکتیں تھیں۔
میں نے وہ گوشہ بھی چھوڑ دیا۔

لاہور میں ہمارے بہت عزیز دوست تھے۔ ادبی شخصیات تھیں اور زندگی خوبصورت تھی۔ اس شہر کو اردو ادب کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ میں جلسوں اور عام مشاعروں سے ہمیشہ گریزاں لیکن ادیبوں اور شاعروں سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے اس سے محروم بھی نہیں رہی۔ وہاں ملاقات کا ایک سلسلہ خود بھی شروع کیا جو رائج الوقت ادبی سیاست اور مصلحت سے الگ تھلگ تھا۔

پہلی محفل گھر کے کھلے چبوترے پر آدھے مہینے کے چاند کی گواہی میں منعقد ہوئی۔ مضامینِ نظم و نثر پڑھنے کے لیے ضرورتاً بجلی کا لیمپ روشن کر دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے میری فرمائش پر پڑھنے کے لیے منظور الٰہی نے اسی وقت عامر کے کمرے میں جاکر ایک مضمون لکھا تھا۔

پھر حجاب امتیاز علی نے "مَن و سَلویٰ" کے نام سے اس تقریبِ ملاقات کو باقاعدہ پروگرام بنا دیا۔ انہوں نے اس کا نہایت دلچسپ منشور لکھا جو ابھی تک میرے پاس موجود ہے۔ مَن و سَلویٰ کی ہر محفل بہت دلچسپ اور کامیاب ہوتی۔ حجاب امتیاز علی اس کی صدر تھیں۔ اور اس کی پذیرائی اور کامیابی کا باعث بھی۔

حجاب اور امتیاز علی تاج سے ہماری رسم و راہ بہت پہلے سے تھی۔ ایک قسم کی عزیز داری بھی کہی جاسکتی ہے۔ امتیاز علی تاج بھی نہایت نفیس طبع انسان تھے۔
من و سلویٰ کے اراکین میں انتظار حسین اور عالیہ' کشور ناہید' منظور الٰہی' اور

زہرا' جمیلہ ہاشمی' محمد طفیل' صلاح الدین محمود اور ہم دونوں شامل تھے۔ شاید کچھ نام میں بھول گئی ہوں۔ کبھی کبھی مہمان بھی مدعو کیے جاتے۔ مجھے فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' محمد خالد اختر اور فاطمہ حسن کی شرکت یاد ہے۔ مزاحیہ نثر میں صاحبِ اسلوب محمد خالد اختر سے ان کا کوئی مضمون سُننے کی کوشش میں ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ فاطمہ حسن نے خوبصورت نظم سنائی۔ ان کا نام اس وقت تک ادب کی دنیا میں نیا تھا۔ شاہدہ حسن کی شاعری کا بھی وہ ابتدائی دَور تھا یہ دونوں نام تقریباً" ایک ساتھ ہی سامنے آئے تھے۔

ہماری اردو شاعری میں شاعر خواتین اپنی الگ پہچان بھی رکھتی ہیں اور ساکھ بھی۔ اپنا اپنا رنگ سخن ہے اور اپنی اپنی جراَتِ اظہار۔ زہرہ نگاہ' کشور ناہید' فمیدہ ریاض' پروین شاکر' شاہدہ حسن' فاطمہ حسن' عشرت آفریں' شبنم شکیل' پروین فنا سیّد' عرفانہ عزیز' تنویر انجم' عذرا عباس' منصورہ احمد اور میری ایک اور بہن زیتون بانو جو شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میں اپنی پہچان رکھتی ہیں اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بعد متعارف ہونے والی خواتین میں بھی کئی اور معتبر نام ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتی۔

برصغیر میں اور اب شمالی امریکہ اور کینیڈا میں بھی ایسی کئی شاعر خواتین موجود ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جائے گی۔ حمیرا رحمان' صبیحہ صبا' نسیم سیّد' نیر جہاں اور دوسری خوش فکر خواتین۔ مجھے ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی بھی یاد آگئیں اگرچہ ان سے ملاقات صرف ان کی نگارشات کے ذریعے ہی ہو سکی ہے۔ ان دونوں کا تعلق ہندوستان سے ہے۔

یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ جن سخن ور خواتین کو میں جانتی ہوں اور جن سے ملاقات ہوتی رہتی ہے ان سب کی جانب سے مجھے ہمیشہ محبّت اور قربت کا احساس ہی رہا ہے۔ مختلف گروہ یا محاذ صرف مَردوں کے علاقے میں ہوتے ہیں۔

میں من و سلویٰ کی بات کر رہی تھی۔ اس کے وسیلے سے کشور ناہید کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شگفتہ باتیں کرنے والی خود اعتماد اور بے تصنّع کشور ناہید ہماری ان

محفلوں کی رونق تھیں۔ لاہور اور کراچی کے درمیان فاصلے کے باوجود وہ اب بھی بہت قریب ہیں۔

من و سلویٰ کے ایک اور رُکن لاہور میں بسنے والے انتظار حسین میرٹھ اور بدایوں کے ناتے ایک لحاظ سے پڑوسی ہی ٹھہرے۔ مگر بہ حیثیت بہترین دوست اور انسان ہم پر بہت دیر میں منکشف ہوئے۔ داستاں گو ایسے کہ جب چاہتے ہیں بیتی ہوئی صدیوں کے سفر پر نئی پگڈنڈیاں تراشتے ہوئے اپنے سامع اور قاری کو ساتھ لے کر چل پڑتے ہیں۔ نہ خود تھکتے ہیں نہ دوسروں کو تھکنے دیتے ہیں۔ الف لیلہ کی شہرزاد نے کہانی سے کہانی کی کڑیاں جوڑنے کا ہنر شاید انتظار حسین ہی سے سیکھا تھا۔

منظور الٰہی اور زہرا بہن کا ذکر من و سلویٰ کے حوالے سے کیوں کروں۔ ان سے ہماری ملاقات اسلام آباد میں ایک عرصے سے تھی۔ شروع میں کچھ رسمی سی کیونکہ ہمارا اور ان کا حلقۂ احباب جُدا تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ ہم دونوں ان کے قریب آتے چلے گئے۔ جب وہ لاہور اپنے گھر منتقل ہوئے انہیں دنوں نور کا تقرر اسٹاف کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے لاہور میں ہو گیا۔ اور ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔

لاہور میں بھائی منظور الٰہی اور زہرا بہن کا گھر ایسا تھا جہاں ہمیشہ بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ ایسے دوست زندگی میں بہت کم میسّر آتے ہیں۔ دردمند' خلیق' متواضع اور پُر خلوص۔

صاحبِ طرز نثر نگار شیخ منظور الٰہی کو علم و ادب میں جو مقام حاصل ہے اس سے سب ہی آگاہ ہیں۔ اب زہرا بہن بھی اپنے افسانوں کے مجموعے کے ساتھ ہماری ادبی برادری میں شامل ہیں۔ خوشی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنا افسانہ پہلی بار ہماری محفل "سلسلہ" میں سنایا تھا۔

خوشگوار یادوں کے صحیفے میں کچھ نام اور بھی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا تعلق بھی لاہور سے ہے۔ لیکن ان سے تعارف کراچی میں مشفق خواجہ کی معرفت ہوا۔ محقّق بھی ہیں' تنقید نگار بھی اور شاعر بھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر جمیل جالبی سے پہلے مقتدرہ قومی زبان

کے صدر نشیں تھے اور میں اس وقت بھی ذیلی دفتر مقتدرہ کراچی کی نگراں تھی۔ اس زمانے میں انہیں زیادہ نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے انہیں علمی کاموں میں منہمک بھی دیکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی نہایت دلچسپ گفتگو بھی سنی ہے۔ بڑے ادیب اور اچھے انسان ہیں۔

تحقیق' تنقید اور شاعری میں دو اور اہم نام ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کے ہیں۔ ملاقات ان سے کم کم ہوئی لیکن گفتگو ان کی نگارشات کے حوالے سے رہی ہے۔ خصوصا" ڈاکٹر وزیر آغا کی تخلیقات ہمیشہ موصول ہوتی رہی ہیں۔ جو ہر لحاظ سے وقیع اور گرانقدر ہیں۔ یہ حرف و بیاں کے رشتے میرے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے بڑی حد تک اپنی ادبی زندگی گوشہ نشینی میں بسر کی ہے۔ اس کے باوجود اپنے ان عزیزوں سے مجھے ہمیشہ خلوص کی سوغات ہی ملی ہے۔ اور ان میں سے جن اصحاب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا خوشی حاصل ہوئی۔

کراچی آکر ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے میری ملاقات اور گفتگو ذیلی دفتر مقتدرہ قومی زبان کے بہانے سے ہوتی رہی۔ نور انجمن ترقی اردو کی صدارت کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ اردو ڈکشنری بورڈ میں بھی مشیر مالیات کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں اظفر بھائی اردو ڈکشنری بورڈ کے چیئرمین اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری وہاں چیف ایڈیٹر تھے۔ یوں ان سے ہم دونوں ہی کا رابطہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں تکلف اور تصنع کہیں بھی نہیں ہے۔ علم و ادب اور تحقیق کے میدان میں باوقار مقام رکھتے ہیں اور درویش صفت انسان ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمیشہ محبت اور اپنائیت کا برتاؤ رہا ہے۔

کراچی آنے کے بعد ہی ڈاکٹر اسلم فرخی سے بھی رابطہ رہا۔ میری ملاقات ان سے زیادہ تر ٹیلی فون کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب انجمن ترقی اردو میں مشیر علمی و ادبی' اور میں ماہنامہ "قومی زبان" کے حلقۂ ادارت میں شامل ہوں۔ "قومی زبان" کے لیے "غزل نما" ترتیب دے رہی تھی۔ کبھی ان سے کسی کتاب کی فرمائش کرتی کبھی سنہ ہجری اور سنہ عیسوی کا معمہ حل کرنے میں مدد لیتی۔ اور پھر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ اور

مختلف گلی کوچوں ہوتا ہوا دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء تک بھی جا پہنچتا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب طرزِ نثر نگار ہیں۔ الفاظ سے تصویریں بناتے ہیں۔ عالم، محقق اور ادیب ہیں مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت نیک دل اور نیک خو انسان ہیں۔

میرے تاثرات کی کتاب میں اور بھی اہم نام ہیں۔ اخلاص کی اور بھی تصویریں ہیں۔ ان میں ڈاکٹر حنیف فوق، سحر انصاری، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، فردوس حیدر، ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، تاج سعید، ڈاکٹر غلام ربانی آگرو، جمیل ملک، فارغ بخاری، نسیم درانی، طاہر مسعود، آصف فرخی، پریشان خٹک، سرشار صدیقی، ادیب سہیل، امراؤ طارق اور دوسری کئی شخصیات جن کا تعلق میری ادبی برادری سے ہے۔ ناموں کی طویل فہرست تیار کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے لیے تو اہم یہی ہے کہ قلم کے ناتے جو میرے عزیز ہیں وہ سب مجھے عزیز ہیں۔

میری یادوں کے البم میں تو انشا جی، مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری بھی موجود رہیں گے۔

اسلام آباد چھوڑ کر کراچی آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر اچھا لگا کہ یہاں باجی بیگم مجید ملک سے ملاقات کے زیادہ مواقع ملے۔ اسلام آباد میں طاہرہ بہن اور جنرل شاہد حامد سے جو روابط تھے ان کے وسیلے بھی باجی ہمارے قریب تھیں۔ یوں بھی باجی بیگم مجید ملک رہتی تو کراچی میں ہیں مگر ان کے حسنِ اخلاق کے اسیر پورے ملک میں موجود ہیں۔ اپنے پرائے سب کے لیے محبت اور شفقت کی گھنیری چھاؤں ہیں۔ ایسی چھاؤں جو انسان کی خوبصورتی اور پاکیزگی کا اعتبار قائم رکھتی ہے۔

باجی اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ ہیں۔ ادبی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے سبھی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ ان کے پاس سے ہر شخص کچھ نہ کچھ آگہی حاصل کر کے ہی اُٹھتا ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب کی طرح ہیں جس کا ہر لفظ دل میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور ہر ورق اپنی خاص کشش رکھتا ہے۔

کراچی میں میرے عزیز بھائی صہبا لکھنوی بھی ہیں۔ اقبال نے کہا تھا میں اپنی تسبیح

روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ' صہبا بھائی نے اس کی روشن اور قابلِ تقلید مثال پیش کی ہے۔ لگن اسی کو کہتے ہیں۔ لحہ لحہ ادب کی خدمت میں مصروف رہنے والے صہبا بھائی جس پابندی سے ماہنامہ "افکار" نکالتے ہیں اسی اہتمام سے لکھنے والوں کو مزید لکھنے کی تاکید بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہمہ عزم و استقامت قابلِ قدر شخصیت ہیں۔

انہیں کے پیہم اور مسلسل اصرار نے مجھے خود نوشت لکھنے پر آمادہ ہی نہیں مجبور بھی کیا۔ اس کی اُنیس قسطیں افکار میں شائع ہوئیں۔ اب یہ تو نہیں جانتی ہوں کہ ان کی اس فرمائش نے مجھے کتنے عجیب سفر پر روانہ کردیا۔ بُھولی بِسری یادوں کی رہ گزر سے تھم تھم کر گزرنے کے لیے وقت بھی تو بہت چاہیے۔ جہاں قیام کا ارادہ کیا وہیں ایک اور موڑ سامنے آگیا۔ بے شک لکھنے کی آسودگی اور راحت بھی حاصل ہوئی جس کے لیے صہبا بھائی کی شکر گزار ہوں۔

"مَن سَلویٰ" کے ذکر کے ساتھ مجھے اپنے کئی اور عزیز بھی یاد آتے گئے۔

لاہور میں ہم دونوں بہت خوش تھے۔ کالج کا پُرسکون علمی ماحول نور کو پسند تھا۔ اور میں کسی ادبی خانقاہ سے آشیرباد لیے بغیر شعر و ادب کی دنیا میں مگن تھی۔

اور اب ۷۷ء تھا نا قابلِ فراموش الیکشن کا زمانہ' دیکھتے دیکھتے شہر آسیب زدہ نظر آنے لگا۔ صاف ستھری سڑکوں پر دن بھر توڑ پھوڑ' شور ہنگامے اور رات کو کرفیو زدہ گلیوں بازاروں میں چیختے ہوئے سناٹے۔ جن کے عقب میں ایک طویل مارشل لا کے اندھیرے تھے۔

ہَوا آزردہ

دل ویراں

یہ سناٹوں کی دہشت ناک آوازیں

دریچے بند کرنا ہی مناسب ہے

مگر آنکھیں موند لینے سے بدنمائیاں معدوم تو نہیں ہو جاتیں۔ گھر پر دن رات ایسی

خاموشی چھائی رہتی کہ اپنی سوچ کی آواز تک سنائی دے۔ اور اس کے بعد ہم لاہور سے اسلام آباد پہنچا دیے گئے۔ نور کا تقرر اسٹیبلشمنٹ سکریٹری کے عہدے پر ہو گیا تھا۔

لاہور میں نور کی پوسٹنگ تین بار ہوئی مگر ایک محرومی ایسی رہی جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ عبدالرّحمٰن چغتائی نے میری فرمائش پر میری پہلی کتاب کا سرورق بنایا تھا۔ لاہور میں قیام اور دلی خواہش کے باوجود ان سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکی۔ ان کا بے مثال تحفہ "عملِ چغتائی" آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جو ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبدالرّحیم نے اسلام آباد جاکر مجھے دیا تھا۔

اس شہرِ خوش خصال سے پہلے پہل ہمارا تعارف ۵۲ء میں ہوا تھا جب نور ملٹری اکاؤنٹس سروس میں تھے۔

اس زمانے میں ہم لوگ سینٹ جانس پارک میں رہتے تھے۔ سامنے سڑک پار میدان تھا جہاں ہارس اینڈ کیٹل شو ہوتا تھا۔ اب وہاں فورٹریس اسٹیڈیم بن گیا ہے۔ ہمیں اس شو کا پورے سیزن کا دعوت نامہ ملتا تھا۔ جس کا مجھے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ روزانہ ایک نوکر اور دودھ کی بوتل کے ساتھ عزمی وہاں بھیج دیے جاتے اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے ان کی شرارتوں سے نجات مل جاتی۔

عزمی کی شرارت پر مجھے چچا عظیم صاحب کا ایک تبصرہ یاد آگیا۔ جنرل ریاض عظیم اس زمانے میں میجر تھے اور ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ ان کا بیٹا انیس جو اَب ماشاءاللہ کرنل ہے اور میرا عزمی دونوں کی عمر میں صرف ایک ہفتے کا فرق ہے۔ ان دونوں بچّوں میں دوستی بھی بہت تھی اور لڑائی بھی بہت ہوتی۔ لڑائی میں زیادتی بھی عزمی کی ہوتی اور غالب بھی وہی رہتے۔ جس پر چچا عظیم صاحب کہتے "بڑی شرم کی بات ہے۔ یہ پشتینی فوجی ایک سویلین سے ہار گیا۔"

وہ ۵۲ء تھا۔ ان دنوں میں بہت خوش تھی اور تھوڑی اداس بھی۔ اسلام آباد کی بات دوسری تھی۔ میرے ساتھ میری اپنی ذات کا جو دُکھ تھا وہاں وہ کہیں ڈھکا چھپا پڑا رہتا۔ مگر لاہور میں مسلسل اپنی موجودگی اور گم شدگی کا احساس دلاتا تھا۔ وہ کچھ تو تھا جس نے مجھے

سانس لینا سکھایا تھا۔ اور یہ شہر شاعروں اور ادیبوں کا شہر تھا۔ جن سے ملاقات کی آرزو مند بھی تھی اور ملنے سے کتراتی بھی رہی۔ اپنی شاعری سے جُدائی اس وقت مجھے دائمی معلوم ہوتی تھی۔

پہلی بار طفیل بھائی اس گھر میں مجھ سے ملنے آئے۔ سنجیدہ' خاموش طبع' خلوص طینت طفیل بھائی بہت بڑی شخصیت تھے۔ انہوں نے جس استقامت اور عزم سے اردو ادب کی خدمت کی اسی جذبے سے وہ خلوص اور وضع داری کے تقاضے بھی نبھاتے تھے۔ انہوں نے مجھے اس وقت بھی فراموش نہیں کیا جب میں خود اپنے آپ کو بُھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان دنوں میرے لیے یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا کہ میں خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔

برسوں بعد جب میری شاعری کی دوبارہ ابتداء ہوئی تو بے حد خوش ہوئے۔ کہنے لگے آپ کے بعد بہت نام آئے لیکن آپ جس کُرسی سے اُٹھ کر چلی گئی تھیں وہ آپ کے لیے ابھی تک خالی رہی۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ شعر و ادب کے ایوان میں کرسی چھوٹی ہو یا بڑی ہمیشہ اپنی اپنی ہی ہوتی ہے کسی دوسرے کو ہدیے یا ورثے میں کبھی نہیں ملتی۔ یہاں کوئی کسی کا جانشیں نہیں ہوتا۔

اسی زمانے میں احسان دانش سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس بوریہ نشیں عظیم انسان سے مِل کر ہمیشہ عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے تھوڑی دیر کے لیے دنیا کے تمام بکھیڑوں سے منھ موڑ لیا ہو۔ ہماری تواضع اسی وقت بازار سے نان اور حلوہ منگوا کر کی جاتی اور کچھ ایسے خلوص کے ساتھ کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اسلام آباد جب بھی ان کا آنا ہوتا ہمارے گھر ضرور آتے تھے۔ جن دنوں ریڈیو کی مہربانی سے جوش ملیح آبادی حکومت کی نگاہ میں معتوب ٹھہرے تھے۔ احسان دانش ان کے لیے بہت فکر مند رہے۔ بے نیاز طبیعت کے مالک تھے مگر جوش کے معاملے میں ان کی پریشانی اور مخلصانہ کوششیں ہم نے دیکھی ہیں۔ شاید اپنے لیے انہوں نے کبھی کوئی

سفارش تلاش نہ کی ہو۔

لاہور میں اپنے پہلے قیام کے زمانے میں ہم دونوں سعادت حسن منٹو کے گھر کبھی کبھی جاتے تھے۔ منٹو جب پہلی بار ۴۹ء میں آپا کے گھر مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں چونکی بھی اور تھوڑا سا گھبرائی بھی تھی۔ ابھی تک ان کی تحریریں ہی دیکھی تھیں۔ مگر جب انہیں دیکھا تو ایک انسان کی حیثیت سے وہ بہت بڑے نظر آئے تھے۔ پھر وہ اسلام آباد میں ہمارے لکڑی کے گھروندے میں بھی ملنے آئے تھے۔ جو گوئن ٹامس روڈ پر ہمارا پہلا گھر تھا۔ لاہور میں جن چند ادیبوں سے اس زمانے میں ملاقات ہوئی ان میں منٹو کا نام شامل ہے۔ وہ بیڈن روڈ پر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔

کئی برس بعد ان کے بھانجے حامد جلال اور بیگم ذکیہ سے مراسم رہے۔ دونوں ہی نہایت نفیس طبع۔ ان دنوں حامد جلال واپڈا میں محکمۂ تعلقاتِ عامّہ کے سربراہ تھے اور نور ممبر فنانس واپڈا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے زہرہ نگاہ سے پہلی ملاقات بھی لاہور میں سینٹ جانس پارک کے مکان میں ہوئی تھی۔ بھولے بسرے بدایوں سے جو میرا تعلّق ہے وہی ان کا بھی ہے۔ تلاش کی جائے تو کنبے برادری کی کوئی ڈوری بھی ہاتھ آسکتی ہے۔ کسی شہر میں زہرہ بن اور ماجد بھائی کے ساتھ زیادہ عرصے رہنے کا موقع نہیں ملا۔

۵۲ء میں فیض سے ایک ملاقات یاد آگئی۔ جسے میں ان کی دل آویز شخصیت کی ایک نمایاں مثال سمجھتی ہوں۔ سال شاید مجھے صحیح یاد نہ ہو۔ ہم نئے نئے لاہور پہنچے تھے۔ انہیں دنوں شہنشاہِ ایران کی آمد کا چرچا سنا اور خیر مقدم کا اہتمام دیکھا۔

لاہور کے شالیمار باغ میں ظہرانے میں ہم دونوں بھی شریک تھے۔ نہایت شاندار تقریب تھی۔ ہم دونوں جا کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا جن میں اپنے چند جاننے والوں کو ڈھونڈ نکالنا ممکن نہیں تھا۔ ہماری میز سنسان ہی رہی۔ ہجوم میں اکیلے ہونے کا ایسا احساس نہ پہلے کبھی ہوا تھا نہ بعد میں اس کا تجربہ ہوا۔

اتنے میں فیض آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس مجمع میں ان کے دوستوں کی کوئی کمی

نہیں تھی۔ جو یقیناً ان کے منتظر بھی ہوں گے۔ ہم اس وقت تک فیض سے امتیاز علی تاج کے گھر ایک دوبار ہی ملے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ خلاف توقع اسی میز کی جانب بڑھے۔ اور دیکھتے دیکھتے اس گوشے کی رونقیں قابلِ رشک ہو گئیں۔ ایران کا بادشاہ کب آیا کب گیا کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ وہاں تو اقلیم سخن کا فرماں روا تھا اور اس کے چاہنے والے۔ اس شام کا رنگ نکھر گیا۔

ہمارے سینٹ جانس پارک کے گھر میں ایک واقعہ ایسا ہوا جسے بھول جانا رب رحیم و کریم کی ناشکری ہو گی۔ صبیحہ اس وقت تین سال کی تھی۔ باجی لاڑکانہ سے میرے گھر مہمان آئی ہوئی تھیں۔ ایک شام میں نے صبیحہ سے کہا جاؤ نوکر سے کھانا میز پر رکھنے کے لیے کہہ دو۔ وہ گئی اور فوراً ہی واپس آکر کہنے لگی اماں وہاں ایک کیلا (کیڑا) ہے۔ اپنی چھوٹی سی انگلی دِکھا کر بتایا کہ اتنا بڑا ہے۔ میں نے کہا بہادر بچے کیڑوں سے نہیں ڈرتے جس پر وہ دوبارہ روانہ ہوئی لیکن مجھ سے بھی رہا نہ گیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلی۔ دیکھا کہ پینٹری میں ایک کالا سانپ پھن اُٹھائے بیٹھا تھا۔ اور پھر نہ جانے کس طرح میں صبیحہ کو اُٹھا کر نور کے پاس پہنچی۔ نہ جانے کب نور اور نوکر اسے مارنے وہاں گئے۔ سانپ تمام وقت اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ تقریباً ایک گز لمبا تھا۔

صبیحہ نے بتایا کہ وہ اس کے پاس کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہی تھی۔ کہنے لگی "اماں وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔"

میرے لیے تو اس مرے ہوئے سانپ کی طرف دیکھنا بھی مشکل تھا۔ میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک بچے کی نگاہ نے سانپ کو کس طرح مسحور کیا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا جیسے کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو۔

میرے مولا نے مجھ پر کتنا بڑا کرم فرمایا۔ بے شک میرے مولا کی رحمتیں اور اس کے احسان بے شمار اور بے پایاں ہیں۔

شہر کو سیلاب لے گیا

وہ جنھوں نے پہلی سانس یقین کی ہواؤں میں لی تھی شک کے موسم میں اپنی پہچان سے جدا ہوئے۔ مجھ سے پہلی اور میری نسل نے اس کا کونسا رخ نہیں دیکھا۔ ہمیں تو سب ذرا ذرا یاد ہے۔

جو موجِ طوفاں قریب آئی
تو ہم نے آنکھوں کی کشتیوں کو
تمام دریا، تمام ساگر عبور کرنا سکھا دیا تھا
تمام خوابوں کو
ڈوبنے سے بچا لیا تھا

پھر کیا ہوا کہ آسودگیٔ ساحل ان خوابوں کو راس نہیں آئی۔ آغوشِ ساحل مزار کی طرح تنگ و تاریک کیوں ہوئی۔ اور یہ فیصلہ بھی کون کرے کہ یہ مزار آنکھوں کے تھے یا خوابوں کے۔

آج آسیب زدہ اور زخم زخم کراچی شہر میں بیتے دنوں کی تسبیح پھیر رہی ہوں۔

تقسیمِ برصغیر ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔ ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ اس ایک خواب کے حقیقت بنتے بنتے ان اہلِ عشق پر جو اقلیتی علاقوں میں تھے کیا کچھ نہ بیت گئی۔ ان قربانیوں کی گواہی تاریخ کے اوراق ہمیشہ دیتے رہیں گے۔ اولاد، آبرو، جان، مال، بعض مکینوں کے پاس تو کچھ نہیں بچا تھا۔ ایسے خاندانوں میں اگر ایک دو افراد بچ بھی گئے تھے تو

انہوں نے ساری عمراُن زخموں کو اپنی اور دوسروں کی آنکھوں سے چھپاتے ہی گزار دی۔ اس پر بھی وہ ہراساں نہیں تھے' پشیماں نہیں تھے۔ جہاں آپہنچے تھے اللہ کی زمین کا وہی ٹکڑا ان کی پہچان تھا۔ وہی مقصود بھی تھا مطلوب بھی۔ اور ان کی تمام قربانیوں کا صلہ بھی۔ اس چمن زار میں کانٹے تھے ہی نہیں اور اگر کہیں ہوں گے بھی تو مزاج برگِ گُل کا رکھتے تھے۔(مجھے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا پڑا) تاریخ کہتی ہے کہ ابھی ان بے مثال جراحتوں کا لہو گیلا تھا۔ ابھی اس خون کے دَھبّے برساتوں نے کہاں دھوئے تھے کہ اہل جاں کی صفوں میں رخنے جگہ پانے لگے۔

بنیاد بھوک تھی۔ بے یقینی تھی اور ہر قسم کی ناانصافی کا احساس تھا۔ بدقسمتی سے وہ مفاد پرست طبقہ ہمارے ملک میں آج بھی موجود ہے لیکن اس وقت مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے اکثریتی حصہ تھا اور یہاں کے مقابلے میں عام سیاسی بیداری بھی وہاں زیادہ تھی۔ ان کا احتجاج سیاسی اور اقتصادی تسلّط کے خلاف تھا مگر قضیہ زبان کے نام پر شروع ہوا۔ وہی زبان جس کا وجود۔ وجودِ پاکستان کے جواز میں شامل تھا۔ اسی زبان کے نام پر دلوں میں میل آنا شروع ہوا۔

یہ ۴۸ء کی بات ہے جب قائد اعظم نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو نہایت واضح الفاظ میں ان کے سامنے دو قومی زبانوں کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ وہ ہستی جس نے اپنے سیاسی کردار میں ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا اور اپنی بات سے پھر جانا سیکھا ہی نہیں تھا وہ شخصیت پاکستان کی عمارت کے بنیادی ستونوں میں سے کسی ایک کی نفی یا شکست کیسے قبول کر لیتی۔ انہوں نے ڈھاکہ میں غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ "قومیں اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہیں۔ پاکستان کے وفاق کی شناخت کے لیے ایک قومی زبان ضروری ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہو گی۔" اگر انہیں زندگی مہلت دیتی تو یقیناً" مشرقی پاکستان میں یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس مطالبے کی بنیادی وجوہ کا ادراک نہ رکھتے اور ان کا تدارک نہ کرتے۔ مگر اب تو یہ سب مفروضے ہیں۔

میں پاکستان کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں۔ نہ سیاسی نہ لسانی۔ پاکستان کی تاریخ جس

نہج پر چلی یا چلائی گئی یہ تمام حقائق تو وہی لکھے گا جو خود ہر قسم کی جذباتی اور ذہنی وابستگی سے آزاد ہو گا۔ اور اس کے لیے وقت کا طویل فاصلہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ مجھے تو محبتوں کے بچھڑ جانے کا دکھ تھا اور ہے۔ صرف اپنے تاثرات ہی بیان کر سکتی ہوں۔

چمن آرائی نسلوں کی محنت' ایثار اور لگن چاہتی ہے۔ جبکہ چنگاری صرف ایک ہی بہت ہوتی ہے۔ یہ مشرقی پاکستان کا احساس محرومی اور اپنی حق تلفی کا یقین تھا جو اظہار پر مجبور ہو رہا تھا۔ اور اس کے لیے بہانے تراش رہا تھا۔ ہمارے بسے بسائے گھر میں زبان یہ بہانہ بن گئی۔ جس کا پہلا مظاہرہ قیام پاکستان کے فوراً" بعد مشرقی پاکستان میں ہوا تھا۔ ورنہ اردو --- اردو تو آج تک موجودہ پاکستان میں بھی سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے۔ ہماری قومی زبان بے شک اردو ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ اردو اس خطۂ زمین پر ہر شخص کی مجبوری بھی ہے۔ اردو سے ناتا توڑ کر ہمارا ہر صوبہ گونگا بھی ہو جائے گا اور بہرا بھی۔ جس ملک میں شرح خواندگی چھبیس (۲۶) فیصد سے بھی کم ہے وہاں انگریزی رابطے کی زبان کا کام نہیں دے سکتی۔ اور یہاں ہر صوبے کی بولی یا زبان دوسرے صوبے کے لیے قطعی ناقابلِ فہم ہے۔ میرا مطلب عوام سے ہے۔ اردو ان تمام زبانوں کے درمیان بھی اجنبیت دور کرنے کا وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سب سے اہم حقیقت یہی ہے کہ اردو کسی ایک فرقے یا گروہ کی زبان نہیں ہے۔ نہ کسی ایک طبقے کو اس کی وکالت کا حق پہنچتا ہے۔

اردو پاکستان کے تمام علاقوں میں کسی کے لیے کبھی اجنبی نہیں تھی۔ پھر اسے کسی ایک فرقے کے قبالے میں کیوں لکھ دیا گیا۔ بنگال میں اُنیسویں صدی سے ہی اردو ادب سے قربت کا رشتہ قائم رہا ہے۔ بنگالی شاعروں ادیبوں اور علما کی قابلِ قدر اردو فارسی تصانیف موجود ہیں۔ اردو کم مایہ اور تنگ داماں بھی کبھی نہیں رہی ہے۔ نئے الفاظ اور نئے لہجے ابتدا ہی سے اس زبان میں رچاؤ پیدا کرتے رہے ہیں۔ برج بھاشا' ہندوی' پنجابی' اودھی' سندھی' ترکی اور انگریزی کے علاوہ بھی دوسری زبانوں کے الفاظ اس نے اپنائے ہیں۔ اور اب پاکستان کی علاقائی زبانوں کے خوشنما رنگ بھی اس میں شامل ہو رہے ہیں۔

بنگالی زبان بھی رسم الخط کی اجنبیت کے باوجود سیکھنے والوں نے سیکھی تھی۔

بہرحال ۵۳ء میں مشرق اور مغربی پاکستان کے درمیان دو قومی زبانوں کا اصولی سمجھوتا ہو گیا۔ مگر مشرقی پاکستان کے احساس محرومی کا ازالہ یہ سمجھوتا بھی نہیں کر سکا۔ بدگمانیاں اور اندیشے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کیا گیا اور رفتہ رفتہ ان لوگوں کا یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ اور پھر آبادی کی اکثریت کی بنا پر دارالحکومت کی منتقلی کا سوال بھی اٹھایا گیا۔ اور پٹ سن کے زرمبادلہ کا مطالبہ بھی ہوا۔ تمام مطالبات کی تفصیل اب مجھے یاد نہیں جنھوں نے بعد میں مجیب کے پیش کیے ہوئے چھ نکات کی شکل اختیار کی۔

ان دنوں بھی جب ہم ساتھ رہتے تھے ایک ان دیکھی ان مانی دیوار ہمارے درمیان حائل تھی۔ یہ تو بعد میں ہی احساس ہوا کہ بنگلہ دیش اپنے قیام سے بہت پہلے ہی ان لوگوں کے دلوں میں اور ہمارے یہاں ذہنوں میں تشکیل پا چکا تھا۔ اقتدار کی ہوس نے جبر اور استحصال کی جو فضا قائم کردی تھی دراصل اسی نے ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔

اکثر بظاہر چھوٹی چھوٹی نظر آنے والی باتیں بھی بڑے بڑے نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ دو بنیادی پہلو ایسے تھے جن کا بڑی آسانی سے تدارک کیا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے جن سرکاری افسران کا وہاں تقرر ہوتا تھا ان میں سے اکثر کا برتاؤ عام طور پر وہاں کے لوگوں کے ساتھ ایک خاص فاصلے اور دوری کا مظہر ہوتا تھا کچھ احساسِ برتری لیے ہوئے۔ ممکن ہے یہ محض ان کا احساس ہی ہو مگر یہ شکایت انھیں ہمیشہ رہی۔ دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہندو نہ صرف معیشت بلکہ تعلیمی اداروں پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ کورس کی کتابیں بھی بھارت سے آرہی تھیں۔ گویا نئی نسل کی ذہنی تربیت ان کو سونپ دی گئی جو نظریۂ پاکستان اور قیام پاکستان دونوں کے طرف دار نہیں تھے۔ اور ابھی اس غم و غصّے کو وقت کی گرد نے دھندلایا بھی نہیں تھا جس کا مظاہرہ تحریک پاکستان اور قیامِ پاکستان کے چند برسوں میں شدت کے ساتھ ہوا تھا۔ حیرت ہے ہمارے سیاست دانوں اور صاحبانِ اقتدار میں سے

کسی نے اس صورت حال کو قطعی قابلِ غور و اعتنا نہیں سمجھا۔ اور تعلیمی اداروں اور تدریس گاہوں میں کسی قسم کی اصلاح کا مطلق خیال نہیں کیا گیا۔ ادھر بنگالی عوام نے قیامِ پاکستان کے ساتھ خوش حالی کی جو آس باندھی تھی وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں تجارت ہونے کی وجہ سے دم توڑ گئی۔ اگرچہ بعد میں گریڈ اٹھارہ اور انیس کے بنگالی افسران کو راست گریڈ بیس بائیس تک ترقی دی گئی مگر وقت گزر چکا تھا۔ اب ان فیصلوں سے بنگالی عوام اور نئی نسل کے آنسو نہیں پونچھے جا سکتے تھے۔ جنہیں شدید احساسِ محرومی اور شاید احساسِ پشیمانی میں بھی مبتلا کیا جا چکا تھا۔

زبان کے نام پر پاکستان میں جو اوّلین فسادات ہوئے ان کی یادگار ڈھاکہ میں "شہید مینار" کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ لوگ پہلی بار بنگال میں زبان کے نام پر ایک دائرے میں مقید ہوئے اور پھر دائرہ در دائرہ محصور ہوتے چلے گئے۔ اور وقت کا چکّر چلتا رہا ہے۔

زبان تو ماں کی لوری کے ساتھ ہی سانسوں میں گھل مل جاتی ہے۔ خون میں رچ بس جاتی ہے۔ اپنی زبان سے محبت بڑی خوبصورت سچائی ہے۔ اور لفظ تو کسی زبان کا ہو ماں کی لوری ہے۔ پیار کی سرگوشی ہے۔ گیت ہے۔ دعا ہے۔

جہاں تک دوسری زبانیں سیکھنے کا تعلق ہے پوری متمدن دنیا اسے شرف ہی مانتی ہے۔ کئی زبانوں پر عبور حاصل ہونا طرۂ امتیاز ہی ہوتا ہے۔ پاکستان میں زبان اصل مسئلہ نہیں تھی اور نہیں ہے۔ ان دنوں بھی جو اصل مسائل تھے ان کی طرف اربابِ اختیار نے دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہمارے وطن میں معاشی اور سیاسی عوامل نے لفظ کو قاتل کا بھیانک بہروپ دے دیا۔ تو ہر کا کانٹا بنا دیا۔ جو رفتہ رفتہ خود رو جنگل کا روپ دھار کر انسان اور انسانیت کے درمیان حائل ہو گیا۔ ایک پوری قوم' ایک قابلِ رشک اور ناقابلِ شکست قوم زبان کا نام لے کر اپنی خوشی سے قبیلوں اور علاقوں میں بٹ گئی اور بٹی ہوئی ہے۔ محبت اور یقین کی ہر بازی ہار گئی ہے اور آج بھی ہار رہی ہے۔ اور لوگ آج بھی یہ جاننا نہیں چاہتے کہ یہ اجتماعی خودکشی کا عمل ہے۔ زبان کبھی اتنی ظالم تو

نہیں تھی کہ قومی وقار اور انسان کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہو جائے۔

مجھے وہ دن یاد آرہا ہے جب میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک پنجابی نظم کسی رسالے میں دیکھی تھی۔ پڑھی تھی۔ اور اسے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ امرتیا پریتم کی نظم ہے۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وِچوں بول
تے ہن کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ کھول

جو قیامت سر سے گزر گئی' دل کو روند گئی اس کی کتنی سچی تصویر اس خاتون شاعر نے سامنے رکھ دی۔ فسادات کی الم ناکیوں کے موضوع پر یہ پہلی نظم تھی جو ہم سب کی ترجمانی کررہی تھی خواہ ہم کوئی بولی بولتے ہوں' کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ درد کی اور زخم کی زبان ایک ہی ہوتی ہے۔ اس نظم نے مجھے پنجابی زبان کے اس حسن کا بھی فریفتہ کردیا جو کسی سرخی وغازہ کا محتاج نہیں ہے۔

دل کو چُھو لینے والے کلامِ نرم و نازک کا سرمایہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں موجود ہے۔ مثلاً" شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کا عارفانہ کلام۔ ان کے علاوہ دوسرے اہم شعراء کے ابیات بھی ترجمے کی وساطت سے عام اردو داں طبقے تک پہنچے ہیں اور پذیرائیاں حاصل کرتے رہے ہیں۔ اہلِ ذوق نے عام قاری تک پہنچانے کے لیے بنگالی شعر و ادب کے ترجمے بھی کیے۔ اور یہ تراجم براہِ راست بنگلہ زبان میں دسترس حاصل کرنے کے بعد کیے گئے۔ زبان جسے آخر آخر قہر بنا دیا گیا پہلے پہل مہر ہی مہر تھی۔ رفاقتوں اور قربتوں کا وسیلہ۔

میری ماموں زاد بہن شمیم ڈھاکہ میں رہتی تھیں۔ وہ اور صدقی دونوں بنگالی بولتے تھے۔ اور ان کے بچوں نے بنگلہ زبان میں تعلیم حاصل کی۔ باجی لاڑکانہ میں رہیں۔ ان کے دونوں لڑکوں نے سندھی پڑھی۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر تھے انہوں نے خود بھی عام لوگوں سے بات چیت کے لیے باقاعدہ سندھی سیکھی۔ اب باجی کراچی میں ہیں۔ بھائی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے سندھی دوست اب بھی باجی سے اسی خلوص سے ملتے

ہیں۔

متحدہ پاکستان کے آخری الیکشن سے چند ماہ قبل میں نور کے ساتھ ڈھاکہ میں تھی۔ اس زمانے میں سرکاری افسر سال میں ایک مرتبہ اپنی بیوی کو سرکاری خرچ پر مشرقی پاکستان ساتھ لے جا سکتے تھے۔ طیب اپنے کام کے سلسلے میں ڈھاکہ میں سکونت پذیر تھے۔ امی بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس لیے ڈھاکہ جانا میرے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔

ہر سال یہ خوشی حاصل ہوتی لیکن اس بار جب میں ڈھاکہ پہنچی تو حالات نے طیب کو اپنا گھربار اور جما ہوا کاروبار چھوڑ کر کراچی آنے پر مجبور کردیا تھا۔ اللہ کی جانب سے اچھا ہی ہوا۔ بہرحال طیب اور سعیدہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے اب وہ کشش تو میرے لیے نہیں رہی تھی لیکن وہاں دوست اب بھی موجود تھے۔ ام عمارہ' صلاح الدین محمد' احسن احمد اشک اور وہ سب جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہے ہیں مگر میں انہیں بھولی بھی نہیں ہوں۔

ہم لوگ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ الیکشن کا اعلان ہوگیا تھا۔ ماحول میں بڑا واضح کھنچاؤ اور غم و غصہ کا تناؤ موجود تھا۔ اکّا دکّا واردات روزانہ کا معمول تھا۔ مجھے یاد ہے پہلی صبح نور نے دفتر جاتے ہوئے مجھ سے کہا "میں موٹر بھیج دوں گا جہاں کہیں ملنے جانا ہو چلی جانا لیکن ڈرائیور کو تاکید کردینا کہ یونیورسٹی روڈ یا کسی کالج کے نزدیک سے نہ گزرے۔ ان ہنگاموں کی فضا میں طلباء سے مڈبھیڑ نہ ہو تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا "نور آپ بھول رہے ہیں۔ یونیورسٹی اور کالج میں تو میرا عزمی اور میری صبیحہ پڑھتی ہے۔ یہ بچے جو یہاں پڑھ رہے ہیں کیا ہمارے بچے نہیں ہیں؟ کیا یہ سب عزد اور صبو جیسے نہیں ہیں؟ کیا مائیں اپنے بچوں سے خوف زدہ ہوتی ہیں۔ یہ درس گاہیں ہیں کیا تعلیم و تہذیب کا جنازہ بھی یہیں سے اٹھے گا۔ ان مقامات کا درجہ تو عبادت گاہوں سے کم نہیں ہوتا۔" اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ اس ملک میں اور خصوصاً" کراچی میں اقدار اور انسانیت کے جنازے اتنے تسلسل اور تواتر سے نکلیں گے کہ لوگ حیران ہونا بھی چھوڑدیں گے۔ وہ ۷۰-۱۹۷۱ء تھا۔

جب کبھی میں یوں حقائق سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتی ہوں تو نور ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں "شکر کرو تمہاری شادی میرے ساتھ ہوئی ہے کوئی دوسرا ہوتا تو تمہیں پاگل خانے میں داخل کر کے چین سے رہتا۔" مگر اس دن نور کچھ نہیں بولے۔ چپ رہے۔ سمجھ رہے تھے کہ کبھی کبھی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ماننے کو دل نہیں چاہتا۔ میں اتنی افسردہ دل ہو گئی تھی کہ اس دن کہیں باہر نہیں گئی۔ اور اس کے بعد کبھی ڈھاکہ نہیں جا سکی۔

یہ بنگال تھا۔ ٹیگور، نذر الاسلام، کوی جسیم الدین اور صوفیہ کمال کی سرزمین۔ احسن احمد اشک بنگالی ہیں اور شعر اردو میں کہہ رہے تھے۔ ان کی نظم یاد نہیں۔ اس کا مفہوم یاد ہے ۔

"تپتی دھوپ میں ٹین کی چادر پر
تم آدھا رستہ طے کر چکے ہو
اب پیچھے مڑ کر دیکھ رہے ہو
سوچ لو
آگے یا پیچھے جانے کے لیے
فاصلہ برابر ہے"

۷۱ - ۷۰ ء کی نفرت آلود فضا میں بھی وہ بنگالی موجود تھے جو اسلام کے نام پر حاصل کیے ہوئے اس ملک کو اب بھی عطیہ خداوندی مانتے تھے جیسے افلاک سے دعاؤں کا جواب آیا ہو۔ وہ اب بھی نظریہ پاکستان پر یقین رکھتے تھے اور وقت کی چارہ گری کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس وقت معاشی حالت اور سیاسی نعروں کے ہاتھوں بپھرے ہوئے ایک بے پناہ مشتعل ہجوم کے آگے بے بس تھے۔

پاکستان کے اس حصے میں دکھی اور بے بس وہ پاکستانی بھی تھے جنہیں بہاری کہا جاتا رہا ہے۔ جنہوں نے اس وطن کے قیام کی خاطر آگ اور خون کے سمندر عبور کیے تھے۔ اور

ابھی گود کے بچے جوان ہوئے تھے کہ ایک بار پھر دہکتے ہوئے جہنم کا سامنا کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ بے سہارا لوگ جو ابھی ابھی ایک تمنا ایک آدرش کا سہارا بنے تھے۔ یہ پاکستانی جن پر اپنے وطن کی زمین تنگ ہوئی۔ تاریخ آنے والی نسلوں کو بتائے گی کہ سقوط مشرقی پاکستان کے بیس سال بعد تک بھی یہ پاکستانی بے سہارا بھی رہے' بے گھر بھی اور بہاری بھی (آگے کا علم اللہ کو ہے) ایک نظم میں نے انہیں پاکستانیوں کے نام کی تھی جس کا عنوان ہے "کیوں؟۔" اس کے کچھ مصرعے ہیں۔

تم تو اس عہد کے انسان ہو' جسے
وادیٔ مرگ میں جینے کا ہنر آتا تھا
مدتوں پہلے بھی جب رخت سفر باندھا تھا
ہاتھ جب دستِ دعا تھے اپنے
پاؤں زنجیر کے حلقوں سے کٹے جاتے تھے
لفظ تقصیر تھے
آواز پہ تعزیریں تھیں
تم نے معصوم جسارت کی تھی
اک تمنا کی عبادت کی تھی
پا برہنہ تھے تمہارے
یہی بوسیدہ قبا تھی تن پر
اور یہی سرخ لہو کے دھبے
جنہیں تحریرِ گل ولالہ کہا تھا تم نے
ہر نظارہ پئے نظارگیٔ جاں تم کو
ہر گلی کوچۂ محبوب نظر آئی تھی
رات کو زلف سے تعبیر کیا تھا تم نے

تم بھلا کیوں رسن و دار تک آپہنچے ہو؟
تم نہ منصور، نہ عیسیٰ ٹھہرے!"

ان چند خوں فشاں برسوں میں میں نے جو نظمیں کہیں ان سب میں کسی نہ کسی رخ سے مشرقی پاکستان کے اندوہ ناک حالات کا عکس موجود ہے۔ "ابھی تو شب خوں نہیں ہوا ہے۔" "شب چراغ آج کہاں سے لاؤں۔" "تو جانتا ہے۔" "آج کی رات کتنی تنہا ہے۔" وغیرہ نظمیں۔

میں ڈھاکہ جاتی رہتی تھی۔ یہ وہی ڈھاکہ تھا جہاں ملنسار دوست تھے۔ جہاں سیدھے سادے محنت کش عوام رہتے تھے۔ لیکن اب بنگالی دوستوں کے طرز تپاک اور عام لوگوں کے اندازِ فکر میں کئی سال سے بہت واضح فرق نظر آرہا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو وفاقی حکومت سے تعلق رکھتے تھے اور مغربی پاکستان میں برسوں ساتھ رہے تھے۔ اب ان تمام دوستوں اور ساتھیوں کے برتاؤ میں جو نمایاں تبدیلیاں آرہی تھیں انہیں محسوس کرنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔ بظاہر ملاقات بھی رہتی اور درمیان میں نوکِ خنجر کی طرح چبھتی ہوئی ایک غیریت بھی کہیں سے آگئی تھی۔ ملک کے اس حصے میں جو صورت حالات تھی اس کا انجام بھی نظر آرہا تھا۔ اگرچہ اتنا دردانگیز اور خوں ریز کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا جیسا کہ بالآخر ہوا۔

ان اجنبی اجنبی سے پرانے آشنا دوستوں کے نام اس زمانے میں جو نظم لکھی تھی اس کے چند مصرعے یاد آرہے ہیں ۔

ابھی تو ردِ صباحِ افسوں نہیں ہوا ہے
ابھی ہے آئینۂ مصحفِ رخ
ہر ایک پیمان جاگتا ہے
جنوں کی بے صبر چاندنی پر
خرد کے سائے نہیں پڑے ہیں

اچھوتے خوابوں کی اوڑھنی پر
لہو کے چھینٹے نہیں پڑے ہیں
متاعِ غم ہے ابھی سلامت
کریم و غفار ہے محبت
بڑی مقدّس ہے یہ امانت
اس ایک دن تو دلوں کی راہیں دلوں تلک استوار ہوں گی
ہمارے مہماں اس ایک شب تو نجوم اور ماہتاب ہوں گے

مشرقی پاکستان میں غربت' مغربی پاکستان سے یقیناً" زیادہ تھی جو گلیوں' کوچوں' بازاروں ہی میں نہیں چہروں پر بھی لکھی ہوئی تھی۔ تعلیم اور خواندگی وہاں بھی عام نہیں تھی لیکن مغربی پاکستان کے مقابلے میں اس وقت وہاں کے عوام سیاسی سوجھ بوجھ زیادہ رکھتے تھے۔ پھر آئے دن ان کے گھربار' ان کا آب و دانہ موسمی آفات کی زد میں رہتا تھا۔ اس لیے اپنی زبوں حالی کا احساس موجود تھا۔ ایسے میں جب سیاست دانوں نے انہیں ایک بہتر زندگی' ایک پیٹ بھرے مستقبل کی نوید سنائی تو اس کے حصول کے لیے انہوں نے تمام حدود پار کرلیں۔ جذباتیت اور غم و غصے کی آندھی میں دوستی' رفاقت' مروّت تمام خوبصورت رشتے اپنی حقیقت کھو بیٹھے۔

تقسیمِ ہند کے وقت جب فسادات ہوئے تھے تو ہندو اور سکھ دوستوں نے اپنی جان پر کھیل کر بھی مسلمانوں کی جان اور آبرو بچائی تھی۔ بنگالی مسلمانوں سے تو ہمارے زیادہ ہی گہرے رشتے تھے۔ وہاں بھی خلوص اور محبت کی مثالیں سامنے آئیں لیکن جب انسانیت پابجولاں ہو تو کیا کچھ ممکن نہیں ہوتا اور اس خانہ جنگی کے آخری دنوں میں ان لوگوں نے بھی کھویا تو بہت کچھ تھا۔ دکھ تو انہوں نے بھی بہت جھیلے تھے۔

اور پھر ۷۱ء کی جنگ نے آخری فیصلہ کردیا۔ ہمیں ورثے میں محبتیں ملی تھیں۔ ہمارے بچوں کو وراثت میں نفرت اور اشتعال کے سوا کیا ملا؟ یہ ایک زندہ و بیدار نسل کا

المیہ تھا اور بدقسمتی سے آج تک ہے۔

وہ آج ہی کی طرح بے حد اداس، دھندلے اور سنسان دن تھے۔ ہر شخص سہا ہوا، ہر دل دکھا ہوا، کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ انہیں دنوں راولپنڈی میں ایک بین المدارس مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں پنجاب کے دوسرے شہروں کے طلبہ بھی شریک تھے۔ میں عام طور سے مشاعروں اور جلسوں میں شرکت نہیں کرتی۔ لیکن اس مشاعرے کی صدارت قبول کر لی۔ مشاعرے کے منصفین میں پروفیسر فتح محمد ملک، توصیف تبسم اور ڈاکٹر ظہیر فتح پوری کے نام یاد ہیں۔ وہاں بہ حیثیت صدر جو نظم میں نے سنائی اس کا عنوان ہے "کوئی پیاں نہیں" یہ نظم نوجوان نسل کے سامنے ایک پوری نسل کی کوتاہیوں کے اعتراف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے چند مصرعے ہیں ـ

آج دامن کشاں کوئی پیاں نہیں
زخمِ جاں سے بھی گھر میں چراغاں نہیں
میرے بچوں کو کیسی امانت ملی
خوں میں لتھڑا ہوا یہ سیہ پیرہن
میری نسلوں کو میری وراثت ملی
میری مٹی کی خوشبو کہاں کھو گئی
میری آنکھوں کے دیپک بجھے کس طرح
میرے آنسو لٹے ہیں فغاں کھو گئی
آج تابِ مداراتِ مژگاں نہیں

وجہ کچھ بھی ہو مگر جب انسان محبت کرنا بھول جاتا ہے تو اس سے سرفرازی کا حق بھی چھن جاتا ہے۔

وہ ۱۹۵۱ء تھا اور اکتوبر کی سولہ تاریخ۔ جب قائد اعظم کے ساتھی تحریکِ پاکستان کے

قابلِ فخر کارکن اور رہ نما اور ملک کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو شہید کیا گیا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کی کہانی کا سرنامہ شاید اسی خونِ ناحق سے تحریر ہو گیا تھا۔ سنا گیا تھا کہ اس دن وہ جلسۂ عام میں کوئی خاص اعلان کرنے والے تھے پھر خبر آئی کہ انہیں گولی مار دی گئی۔

ہم ان دنوں راولپنڈی میں نور کے پھوپھا کرنل عون محمد جعفری کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے گھر میں سب ہی موجود تھے مگر ذہن و دل میں چُبھتا ہوا سکوت اور خوف بھی ہر شخص پر طاری تھا۔ ایسے میں شمیم بھائی سی ایم ایچ سے واپس گھر آئے اور پھوپھو سے اگر بتی اور عطر کی شیشی مانگی۔ اس کے علاوہ نہ انہوں نے کچھ کہا نہ کسی نے کچھ پوچھا۔ صورتِ حال واضح تھی۔ شمیم بھائی اس زمانے میں کیپٹن کے عہدے پر تھے اور سی ایم ایچ میں ڈاکٹر تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شمیم بھائی اور کرنل (اس وقت کیپٹن) اعظمی نے کراچی روانہ کرتے ہوئے شہید وزیر اعظم کے تابوت کو کاندھا بھی دیا تھا۔ اس سے آگے ان ڈاکٹروں کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

کرائے کے قاتل کو تو افشائے راز کے خوف سے اسی وقت مار دیا گیا تھا مگر جو گولی اس کے پستول سے نکلی تھی اس کا سفاکانہ سفر جاری رہا۔ اقدار مجروح ہوتی رہیں، آدرش دَم توڑتے رہے انسانیت قتل ہوتی رہی۔ اور پاکستان میں سیاست کُرسیوں کی تقسیم تک محدود ہو کر رہ گئی۔

اس وقت تو قیامِ پاکستان کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا۔

منزل منزل

"آپ کو امریکہ کیسا لگا؟"

۸۸ء میں جب ایک بار پھر واشنگٹن گئی تو ایک خاتون نے جو میری ہی طرح اپنے بچوں اور ان کے بچوں کو دیکھنے آئی ہوئی تھیں مجھ سے پوچھا۔

"بیس سال پہلے جب پہلی بار آئی تھی تو بے حد پسند آیا تھا۔ دوبارہ آنے کی خواہش بھی بہت تھی۔ اور یہ بازدید بظاہر ممکن بھی نہیں تھی۔ اب اس سرزمین سے گلے شکوے بھی ہیں اور ہر دو سال بعد آجاتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

ہاں امریکہ مجھے بُرا بھی لگتا ہے۔ مگر یہ تو اب کی بات ہے۔ جب میرے دو بچے روزگار کی خاطر اتنی دور آباد ہونے پر مجبور ہوئے۔ اب جو امریکہ کا نام میرے سامنے ایک اونچی بہت اونچی دیوار لے آتا ہے تو یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے۔ کہا تھا۔

راستے کیوں طویل ہیں اتنے
زندگی مختصر ملی ہے ہمیں

بے شک میرے اوپر میرے مولا کے بڑے احسانات ہیں۔ میں جو میکے کے گھر سے مٹھی بھر آسمان ساتھ لے کر چلی تھی اس نے زمین و آسماں کی وسعتوں اور رنگوں کے کئی دلکش و دل رُبا خزینوں تک میری آرزو مند نگاہوں کو رسائی عطا کی۔

میں نے اب تک جتنی امریکی ریاستیں دیکھی ہیں ان میں نیویارک' واشنگٹن' میری لینڈ' ورجینیا' کولمبیا' میسا چیوسٹس' کینسس' کیلی فورنیا' نیو جرسی' وایومنگ' منی سوٹا' کنیکٹیکٹ' اوہایو' پنسلوینیا' فلوریڈا' ورمانٹ اور ہوائی شامل ہیں۔

اب تو امریکہ بہت بار گئی ہوں اور وہاں بچوں کی موجودگی کی وجہ سے سفر اور قیام کے عرصے میں کبھی کبھی غیر معمولی نظارے بھی میری آنکھوں میں تحریر ہوئے ہیں۔ وہ فطرت کے حُسن کی سحر طرازیاں ہوں یا انسانی ذہن کی فتح مندیاں' کہیں منظر اچھوتا نظر آیا کہیں پس منظر دلچسپ تھا۔

عزیزی اور شعاع گزرے زمانوں کے مشاہیر سے کچھ اس طرح تعارف کرواتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے وقت سانس لینا بھول جاتا ہے۔ میرے بھانجے اسلم نے ایپکاٹ سینٹر' ڈزنی ورلڈ اور ناسا کے خلائی اسٹیشن تک پہنچایا۔ صبیحہ اور زبیر خود بھی سفر کے شائق ہیں اور ہوائی جہاز کے سفر کو صرف کسی ایک مرکز تک پہنچنے کا بہانہ بناتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے آگے سیاحت ان کے ساتھ ہم نے موٹر کے ذریعے ہی کی۔ ہوائی جہاز کا سفر لوگ کام یا قیام کے لیے کرتے ہیں۔ موٹر کے سفر میں آدمی شہروں اور مضافات کو صرف دیکھتا ہی نہیں چُھوتا بھی ہے اور محسوس بھی کرتا ہے۔ صبیحہ اور زبیر کے ساتھ میں نے ایسے غیر معمولی مناظر اور مقامات بھی دیکھے جہاں عموماً" عام سیاح نہیں پہنچتے۔ یہ سب یادیں بھی تفصیلی تذکرہ چاہتی ہیں۔

خاتون کے سوال پر مجھے اپنا امریکہ کا پہلا سفر یاد آگیا جو ذوق و شوق کے باوجود افسردہ دلی کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ کیونکہ ہم اپنے تینوں بچوں کو پاکستان میں چھوڑنے پر مجبور تھے۔

عالمی بینک کی جانب سے اکنامک ڈویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ (ای۔ ڈی۔ آئی) کا یہ کورس چھ مہینے کا ہوتا ہے۔ جس کے لیے دس پندرہ ترقی پذیر ممالک سے دو دو نمائندے بُلائے جاتے تھے۔ ۶۸ء میں نور کے ساتھ پاکستان کے دوسرے نامزد مندوب ثناء الحق تھے۔ جن کا تعلق اس وقت کے مشرقی پاکستان سے تھا۔ عالمی بینک سے الاؤنس وغیرہ کے علاوہ بیویوں کا سفر خرچ بھی ملتا تھا۔ شروع شروع میں ہر مندوب کو اپنے دو بچے بھی ساتھ لے جانے کی اجازت تھی۔ جن اصحاب کے خدا کے فضل سے دو سے زیادہ بچے تھے ان کے لیے یہ انتخاب آسان نہیں ہوتا تھا۔ جب ہماری باری آئی تو بوجوہ یہ رعایت واپس لی جا

چکی تھی۔

ہم لوگ اگست کے آخر میں اسلام آباد سے روانہ ہوئے اور راستے میں مختلف ممالک دیکھتے، چھوتے ہوئے چار ہفتے بعد واشنگٹن پہنچے۔ عالمی بینک کی جانب سے جو کرایہ ملا تھا اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرکے ہم نے اسلام آباد سے واشنگٹن کے راست سفر کو عالمی سفر میں تبدیل کروالیا تھا۔

بچوں کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔ لیکن نئی زمین نیا آسمان دیکھنے کی کشش بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ہاں وہ نگاہِ خوش نصیب طائرانہ ہی سہی۔ ایسا موقع بھی بار بار کہاں ملتا ہے۔

بچوں کی طرف سے یہ اطمینان تو تھا کہ انہیں آپا کے پاس چھوڑا تھا۔ اور پھر اپنی اور بچوں کی تسلّی کے لیے یہ پروگرام بھی پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ نور کا کورس ختم ہونے کے بعد لندن میں بچے ہمارے پاس آجائیں گے اور پھر ان کے ساتھ یورپ کا سفر اور عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہوئے وطن واپسی۔ اس امید اور یقین کے سہارے بچوں کا وقت بھی آسان گزر گیا اور اپنے دل کی خلش بھی کچھ کم ہو گئی۔ نور نے تین ماہ کی چھٹی پہلے ہی حاصل کر لی۔ ایک مہینہ کورس سے پہلے مشرقِ بعید کی دید اور واپسی کے سفر میں دو مہینے بچوں کے ساتھ سیرو سیاحت کے لیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا یہ پروگرام ہماری خواہش کے مطابق پورا ہوا۔

ڈھاکہ سے ہمارا بیرون ملک پہلا پڑاؤ بینکاک تھا۔ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کا سفر اور وقت میں ایک گھنٹے کا فرق تھا۔ وہی بھیگی بھیگی مشرقی پاکستانی ہوائیں۔ وہی بدلیاں، وہی گھٹائیں، وہی موسم کی تمازت، وہی برکھا کی جھڑی اور وہی سبزہ و گُل کی فراوانی۔ مگر اتنی ہم مزاجی اور یکسانیت کے باوجود بینکاک پر ڈھاکہ کا قیاس ممکن نہیں تھا۔

بینکاک قیمتی سازو سامان سے بھری ہوئی دکانوں اور جگمگاتی جاگتی راتوں کا شہر ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں یہ شہر امریکی فوج کا ہیڈ کوارٹر رہا تھا۔ یہاں کے نائٹ

کلب اب بھی شہرت رکھتے ہیں۔ تھائی لینڈ میں دولتِ دنیا کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ڈھاکہ اور بینکاک میں سب سے بڑا فرق غربت اور دولت ہی کا نظر آیا۔ وہاں رہ گزاروں اور بازاروں میں ہر جگہ لباس اور چہرے دونوں سے لوگوں کی آسودہ حالی عیاں تھی۔ آبادی کی اکثریت بدھ مذہب سے تعلّق رکھتی ہے۔ صفائی پسند' سادہ اور محنتی لوگ ہیں۔ اس شہر میں جو خوبی سب سے پہلے اپنی جانب متوجّہ کرتی ہے وہ اس کی صاف شفاف کشادہ سڑکیں ہیں۔ اور پھر بلند و بالا عمارتیں۔ بینکاک شاہی محلوں اور عالی شان مندروں کے لیے مشہور ہے۔

ہمارا قیام نور کے ایک عزیز دوست اختر الدین اور ان کی بیگم ستارہ کے گھر میں تھا۔ اختر الدین پاکستانی سفارت خانے میں متعین تھے۔ ہم پانچ دن بینکاک میں رہے۔ دونوں نے ہمارے آرام و راحت کا ہر ممکن اہتمام کیا۔ اور تمام قابلِ دید مقامات تک ہماری رہ نمائی بھی کی اور اپنے ساتھ لے کر بھی گئے۔

بینکاک پہنچنے کے دوسرے دن ہم نے صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک مختلف تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے ایک ٹورسٹ بس کا انتخاب کیا۔ ٹکٹ کی قیمت میں ایک تھائی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا بھی شامل تھا۔ اس بس میں زیادہ تر امریکی اور کچھ یورپین ہمارے ہم سفر تھے۔ دو تین جگہ ہمیں بس سے اتر کر عمارتیں دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی مقامات پر صرف رواں تبصرہ سنتے رہے۔

جگ مگ کرتے سنہرے پُر شکوہ مندروں میں مختلف زاویوں سے ایک سفرِ حیات کی کہانی کہتے ہوئے بدھ کے بے شمار مجسّمے آراستہ تھے۔ گہرے سبز رنگ کے جیڈ' سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے اور کہیں سیاہ دھات میں ڈھلے ہوئے چھوٹے' بڑے اور بہت بڑے مجسّمے۔ ایک مندر میں سونے کا مجسّمہ بھی دیکھا۔ کہیں گیان دھیان میں گم۔ کہیں نروان کی آسودگی کا پیکر۔ کہیں تیاگ کی چھاؤں' کہیں لگن کی چھب۔ مگر یہ تمام کیفیات تو ہم نے اس وقت دیکھیں جب دوسرے دن سے اختر الدین اور ستارہ ہمیں اپنی موٹر میں خاص خاص مندروں تک دوبارہ لے کر گئے۔ بادشاہوں کے محل بھی انہیں

کے ساتھ زیادہ تفصیل سے دیکھے جو زیادہ تر سرخ پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ اختر الدین نے ہماری خاطر دفتر سے دو دن کی چھٹی لے لی تھی۔

تھائی عمارتوں پر ہندو تہذیب کا بہت اثر ہے۔ زیادہ تر چھتیں ہندوؤں کے مندر کے کلس سے ملتی جلتی نظر آرہی تھیں۔ بینکاک شہر میں نہروں کی بہتات ہے۔ ان میں سے کچھ نہروں میں کشتیوں پر بازار لگتا ہے جہاں زیادہ تر خواتین ہی دکان دار ہوتی ہیں۔ ہم اپنے میزبانوں کے ساتھ اس "بازارِ رواں" میں بھی گئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں پھل، مچھلی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں سستے داموں ملتی ہیں۔ یہ بازار کچھ کچھ کراچی کے بوہری بازار اور سبزی منڈی کا ملا جلا نمونہ نظر آیا۔

سیاحوں کے لیے بینکاک کے عام بازار بے حد پرکشش ہیں۔ تھائی لینڈ کی قدیم و جدید دستکاری کے نمونے پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی خریدنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود تھا۔ لکڑی کی نفیس مصنوعات، سنہری دھات کے چمچے کانٹے، جن پر بدھ کی شکل بنی ہوئی تھی۔ تھائی سلک اور قیمتی پتھر وغیرہ۔ جیڈ جو عام طور پر سبز رنگ کا دیکھا تھا وہاں ہر رنگ میں موجود تھا۔ گہرے اور ہلکے رنگ کی مناسبت سے قیمت میں فرق تھا۔ سونا پاکستان سے سستا تھا۔ میں نے ایک مخصوص تھائی انگوٹھی صبیحہ کے لیے خریدی۔ جسے پرنس رنگ کہتے ہیں۔

بینکاک کی راتیں وہاں کے دنوں سے زیادہ روشن تھیں۔ ان جگمگاتی شاہراہوں کو دیکھ کر اپنے دیس کے گلی کوچے یاد آگئے۔ اس رنگ و روشنی کے شہر کے نام میں نے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان ہے "صنم کدوں کی سرزمین"۔

ہمارا اگلا قیام ہانگ کانگ میں تھا۔ صرف ڈیڑھ دن کے لیے۔ کیونکہ وہاں دیکھنے کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ تاریخی اہمیت کا شہر ہے۔ اور ہر قسم کی برقی مصنوعات، گھڑیوں اور کپڑوں کی خریداری کے لیے مشہور ہے۔

ٹوکیو میں ہم لوگ ایک ہفتہ رہے۔ اگر پیسوں میں گنجائش ہوتی تو ابھی اور ٹھہرتے۔ مجھے یاد ہے روزانہ رات کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں اگلے دن کا پروگرام بنانے سے

پہلے ہم دونوں اپنے زرِ مبادلہ کی حیثیت کا اندازہ ضرور لگاتے تھے۔ کیونکہ ابھی سفر بھی بہت باقی تھا۔

ٹوکیو میں ہمارا قیام ڈائی چی ہوٹل میں تھا۔ پہلے دن جب ہم نے کچھ ڈالر مقامی کرنسی میں تبدیل کروائے تو دل بہت خوش ہوا۔ جاپانی سکّے ین کے نوٹ ہزاروں کی تعداد میں وصول ہوئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد گھومتے پھرتے ایک چھوٹے سے ریستوراں میں ایک پیالی چائے پی تو پتہ چلا کہ مسافروں کے ہاتھ میں یَن جتنی آسانی سے آجاتے ہیں اس سے زیادہ تیز رفتاری سے ان کی واپسی بھی ہوتی ہے۔ ٹوکیو بہت مہنگا شہر تھا۔ پہلا فیصلہ ہم نے یہی کیا کہ یہاں بے شک بہت کچھ سامان ملتا ہے اور خریدنے کو دل بھی چاہے گا لیکن ہمیں صرف جاپان کے عجائبات اور اہم مقامات کی دید سے غرض رکھنا ہے۔ ٹورسٹ بسوں کا کرایہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ البتہ ٹوکیو سے روانگی سے ایک دن پہلے پیسوں میں گنجائش نظر آئی تو پاکستانی سفارت خانے میں جن لوگوں سے شناسائی تھی ان کے ساتھ جاکر گھر کے لیے پیپر میشی کی ایک آرائشی پلیٹ' ایک ننھا مُنا گلدان اور کچھ چیزیں بچوں کے لیے خریدیں۔

ٹوکیو میں ہر سڑک اور ہر دکان کا نام صرف جاپانی زبان میں لکھا ہوا تھا اور آبادی کا کثیر حصہ انگریزی زبان سے نابلد۔ البتہ چوراہوں پر انگریزی جاننے والے پولیس والے بھی موجود ہوتے تھے جن کی پہچان ان کی ٹوپی کے رنگ سے ہوتی تھی۔ یہ معلومات ہمیں اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر سے حاصل ہوئیں۔ ہم باہر جاتے تو ہوٹل ڈائی چی کے نام کا کارڈ بھی ساتھ رکھنا ہوتا تاکہ ٹیکسی ڈرائیور کو کارڈ دکھا کر واپس پہنچ سکیں۔

ٹوکیو میں پہلی رات ہم نے ٹورسٹ بس کا جو سفر منتخب کیا اس کا نام ہی "ٹوکیو بائی نائٹ" (نظارہ ہائے شب) تھا۔ تھوڑا سا ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں ہم لوگ کسی بہت ہی غلط قسم کی جگہ نہ جا پہنچیں۔ یہ بس سیاحوں کو تین جگہ لے گئی۔ پہلی جگہ ہم نے دو جاپانی رقص دیکھے۔ ایک قدیم اور ایک جدید۔ اس کے بعد ہمارا قافلہ نائٹ کلب پہنچا جہاں مختلف قسم کے شو دکھائے گئے۔ اس کے بعد تیسری عمارت گیشا ہاؤس تھی۔ جاپانی زبان

میں "گیشا" کے معنی "فن کار" ہیں۔ ان خواتین کا شمار ارباب نشاط میں ہوتا ہے۔ گیشا ہاؤس کے احترام کا یہ عالم تھا کہ یہاں ہر شخص دروازے پر جوتا اتار کر کمرے میں داخل ہو سکتا تھا۔

سامنے ایک قطار میں تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی اور بہت نیچی چوکیاں برابر' برابر بچھی ہوئی تھیں جن پر شربت کی بوتلیں اور کچھ فواکہات رکھے تھے۔ اس طویل میز کے ساتھ ہی فرش پر مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کشن تھے۔ ہم دونوں نے بھی جاپانی طرزِ نشست اختیار کی اور سامنے رکھا ہوا کوکولا پیتے رہے۔ فرمائش پر مہمانوں کو جاپانی شراب بھی پیش کی جا رہی تھی۔

گیشا ہاؤس میں سب لڑکیاں جاپانی لباس میں تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہمیں چائے بنانے کی جاپانی رسم مکمل اداکاری اور تفصیل کے ساتھ دکھائی۔ اس رسم کو جاپانی میں کسی مذہبی فریضے جیسا تقدس حاصل ہے۔ پھر فصل کٹنے کے تیوہار کا لوک ناچ پیش کیا۔ پھر ہم نے گیشا رقص دیکھا جس میں جاپانی شادی کی رسوم دکھائی گئیں۔

ایک پورا دن ہم نے ٹوکیو کے سات عجائب (سیون ونڈرز آف ٹوکیو) دیکھنے میں بسر کیا۔ ہماری بس تقریباً دس بجے صبح روانہ ہوئی اور شام پڑے ہم لوگ ہوٹل واپس آئے۔

سب سے پہلے یہ بس ایک پہاڑی کے پاس رکی۔ ہمیں بتایا گیا کہ زمین سے اس پہاڑی کی چوٹی تک سیڑھیاں سیدھی اوپر جاتی ہوئی نظر آ رہی ہیں وہ گنتی میں چھہتر (۷۶) ہیں۔ ایک سورما نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے انہیں طے کیا تھا۔

سیاح ان سیڑھیوں کو قدم قدم سنبھل سنبھل کر عبور کرتے ہوئے اوپر ایک ہال میں پہنچے۔ وہاں اس شہ سوار کی شبیہیں سجی ہوئی تھیں۔ اسی کمرے میں قسمت کا حال بتانے والی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ کہا گیا کہ ان مشینوں سے برآمد ہونے والے کارڈ پر جو لکھا ہو وہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ سبھی نے مشین میں دس ین کا سکہ ڈال کر اپنی قسمت کا حال معلوم کیا۔

ہماری اگلی منزل بدھ کا ایک مندر تھا۔ مندر کے صحن میں داخل ہوئے تو کچھ دور سامنے اونچائی پر بدھ کی ایک بڑی مورتی نظر آئی۔ یہ ایک بڑا سا چبوترا تھا جس پر بدھ کے کچھ اور مجسمے بھی تھے۔ اس چبوترے کے دائیں بائیں دونوں طرف سیڑھیاں تھیں جو مندر کے صحن تک پہنچاتی تھیں۔ جہاں سیاحوں کے لیے بینچیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر بدھ مذہب کے پانچ سو بھکشوؤں کے مجسمے استادہ تھے۔

ہم لوگ بینچ پر بیٹھ گئے۔ اور پھر وہیں ایک راہبہ نے بدھ مذہب کی رسوم ادا کر کے ہمیں دکھائیں۔ عبادت ختم ہوئی تو مجھے دھیان آیا کہ یہاں کسی سے کسی خاص رکھ رکھاؤ کی توقع نہیں کی گئی۔ ہم جو ارباب نشاط کے بالا خانے پر ننگے پاؤں لے جائے گئے تھے بدھ کے مندروں اور دوسری عبادت گاہوں میں بے تکلفی سے جوتے پہن کر گھوم پھر سکتے تھے۔ اس مندر میں تصویر کھینچنے کی اجازت سو جاپانی سکّے دے کر ملتی تھی۔ مندر کی آمدنی کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ یہاں کوئی داخلہ ٹکٹ نہیں ہوتا۔

ٹوکیو کا تیسرا عجوبہ ایک تین سو سال پرانا ریستوراں تھا۔ شاید سرائے کہنا چاہیے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر یہ مکان تھا جس کو قدیم جاپانی طرز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ کمرے کے کونے اور در و دیوار دلکش پھول پتّیوں سے سجے ہوئے تھے۔ چھت کے ساتھ کاغذ کی لالٹینیں آویزاں۔ زمین پر ترتیب کے ساتھ کُشن رکھے تھے۔ اور ان کے سامنے نیچی نیچی میزوں کی قطار تھی۔ میزبان لڑکیاں بھی روایتی جاپانی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ یہاں ہم نے زمین پر بیٹھ کر جاپانی طریقے سے جاپانی کھانا کھایا۔ چینی کے رنگین پیالوں میں اُبلے ہوئے چاول تھے اور ان کے ساتھ مختلف سبزیاں اور جھینگے وغیرہ۔ کھانا کھانے کے لیے ہمیں لکڑی کی خوش رنگ تیلیاں پیش کی گئیں۔ چاپ اسٹک سے چاول کھانے میں ایک ہی مشکل تھی کہ کھانا منھ تک پہنچنے سے پہلے پیالے میں واپس آجاتا تھا۔ کچھ مہمانوں کی بے بسی دیکھ کر انھیں کھانا کھانے کے لیے کانٹے بھی دیے گئے۔ میں نے بہرحال فیصلہ کر لیا تھا کہ جاپان کی تین سو سال پرانی فضا کا احترام کرنا ہے۔ کھانا تو ہم روز ہی کھاتے ہیں۔ چاول کچھ پیالے میں رہے کچھ پیٹ میں پہنچ ہی گئے۔ ہمارے میزبان بڑی دلچسپی سے اس

سعیٔ مسلسل کو دیکھ رہے تھے۔ چلتے وقت انہوں نے مجھے چاپ اسٹک کا ایک خوش نما سیٹ تحفہ دیا۔ اس ریستوراں میں میزبان لڑکیوں نے کئی قسم کے رقص بھی پیش کیے۔

اس سفر کی چوتھی منزل گھریلو دست کاری کا ایک میوزیم تھا۔ یہاں اگلے وقتوں کے کرگھے بھی تھے۔ اور کرگھوں پر بنا ہوا کپڑا بھی۔ دادی اماں (یا شاید نانی اماں) کا پینٹ کیا ہوا ایک چائے دان خاص طور پر دکھایا گیا۔ جس پر نہایت نفیس نقش و نگار تھے۔ اس خاتون کا ستر سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ گیارہ سال کی عمر سے پینٹنگ شروع کی تھی اور پچاس لاکھ سے زیادہ برتن پینٹ کیے۔ خاتون کا ذکر گرینڈ ماکمہ کر کیا جاتا ہے۔ اس میوزیم میں جدید پینٹنگ کے نمونے بھی موجود تھے۔

میوزیم کے بعد ہمیں ایک ایسا مندر دکھایا گیا جو دھات کی لالٹینوں کے لیے مشہور ہے۔ ہر قسم کی دھات اور ہر سائز اور وضع کی بے شمار لالٹینیں رکھی ہوئی تھیں۔ جو بڑے زمیندار اور جاگیردار اس مندر کو ہدیہ دیا کرتے تھے۔ ہمارے سفر کا چھٹا عجوبہ بھی ایک مندر تھا۔ یہاں راہبوں کی راکھ دفن تھی اور ان کی مورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس مندر میں تقریباً" چوراسی ہزار راہبوں کی مورتیاں تھیں۔ کچھ اتنی پرانی کہ پتھر تک گل چکا تھا۔

آخر میں ہمیں شنتو مذہب کا مندر دکھایا گیا۔ جہاں اپنے بزرگوں کی روحوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ ایک راہب نے اس مذہبی رسم کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جس کا ترجمہ ہم بڑی بے دلی سے سنتے رہے۔ کیونکہ اب بہت زیادہ تھک چکے تھے۔

نور نے ٹوکیو پہنچنے سے پہلے اپنے ایک جاپانی شناسا کو اپنا پروگرام لکھ دیا تھا۔ ان صاحب کا تعلق کچھ عرصہ واپڈا سے رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد انہوں نے ہوٹل ڈائی چی فون کر کے نور سے بات کی اور ہماری سیر و تفریح کے لیے ایک پورے دن کا پروگرام بنایا۔ وہ ہمیں ڈی لکس ٹرین میں اپنے ساتھ ایک خوبصورت پہاڑی علاقے "نی کو" لے گئے۔ "نیکو" قدرتی حسن کے علاوہ جاپانیوں کے لیے مذہبی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ صبح آٹھ بجے ہماری تیز رفتار ٹرین روانہ ہوئی اور دو ڈھائی گھنٹے میں "نیکو" اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر پہاڑی پر بنے ہوئے مندر تک پہنچے۔ ہمارے میزبان نے بتایا کہ سال میں

ایک دن اس مندر میں خاص عبادت ہوتی ہے۔ اور یہ وہی خاص دن تھا۔

پہاڑی پر میلے کا سماں تھا۔ لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ جگہ جگہ کھانے پینے کی چیزوں اور سووینیر کی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ دور مندر کی خوش نما عمارت نظر آرہی تھی۔ جس کی جانب پورے مجمع کا رُخ تھا۔ ہم بھی اپنے میزبان کے ساتھ ان خوش دل اور خوش باش لوگوں کی صف میں شامل ہوگئے۔

عمارت میں داخل ہوئے تو رسیّوں کے ذریعے قطار بندی نظر آئی۔ ان قطاروں میں رسیّوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ دو آدمی ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ اب مجمع کی رفتار بھی آہستہ ہوگئی تھی۔ حدِ نگاہ تک اور آس پاس قطاروں میں رینگتے ہوئے لوگ نظر آرہے تھے۔ اور انہیں میں ہم بھی شامل تھے۔ ہر کمرے کا دروازہ ہمیں ایک اور کمرے میں داخل کردیتا۔ بہت دیر ہوچکی تھی لیکن اب اپنے اختیار میں نہ آگے بڑھنا تھا نہ پیچھے ہٹنا۔ باہر نکل جانا تو شاید ممکن ہی نہیں رہا تھا

مجھے ہجوم سے ہمیشہ وحشت رہی۔ تین سال کی عمر تھی۔ بہت سے لوگ گھر میں جمع ہوئے اور میں اس بھیڑ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ دوستوں کی محفلیں بے شک نعمت اور رحمت ہوتی ہیں۔ لیکن جب بھی نور کے ساتھ رسم دنیا نبھانے کے لیے بڑے اجتماعات میں شریک ہوئی تو سوچتی ہی رہی کہ وہ اداس تنہا لڑکی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔ اس مندر کی عمارت کے اندر جو ہجوم تھا وہ اب مجھے ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ کمروں میں مکمل سکوت تھا۔ میں نے نور سے سرگوشی کی کہ باہر نکلنے کی کوئی تدبیر کریں۔ جاپانی میزبان پیچھے ہمارے ساتھ تھا۔ ہماری نیت بھانپ کر اس نے بھی سرگوشی کہ یہ عبادت گاہ ہے یہاں داخل ہونے کے بعد بزرگوں کی روحوں سے عقیدت کا اظہار کیے بغیر واپس جانا ان کی توہین ہوگی۔

اس انکشاف کے بعد میں ہجوم کو تو بھول ہی گئی۔ اب ہم دونوں اور ہی اندیشوں اور فکروں میں گرفتار ہوچکے تھے۔ سامنے ایک ہیبت ناک سوال یہ تھا کہ ان جاپانی بزرگوں کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔ کیا وہاں عبادت گاہ میں کوئی بت رکھا ہوگا؟؟

میں نے تو ابھی تک ایک بار عمرہ بھی نہیں کیا تھا۔ ابھی تو ہم دونوں حج کی سعادت حاصل ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہ ہم کہاں پہنچ گئے۔ مجھے یقین آنے لگا کہ شاید ہماری تقدیر میں اپنے اس مہذب اور شگفتہ مزاج میزبان کے ہاتھوں قتل ہونا لکھا ہے۔ سو منظور ہے۔

سوچتے گھبراتے ہم کئی اور کمرے پار کر چکے تھے۔ اور بیرونی دروازے کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ اب اس عالمِ سکوت میں وقفے وقفے سے تالی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نور نے گردن اونچی کرکے دیکھا اور سرگوشی کی کہ وہاں کوئی بُت نہیں ہے۔ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر لوگ تالی بجاتے ہیں اور باہر نکل جاتے ہیں۔

اور پھر جاپان کے لوگوں نے آٹھواں عجوبہ دیکھا تو نہیں البتہ اس مندر کے اندر سنا۔ اس گمبھیر خاموشی کے ماحول میں نور نے پوری اونچی آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کردیا تھا۔ میں نے زور زور سے لاحول پڑھنا شروع کی۔ اور پھر ہم نے بھی پوری طمانیت قلب کے ساتھ تالی بجائی اور دروازے سے باہر نکل آئے۔

کمروں کے گورکھ دھندے سے باہر کُھلے میدان میں آکر لوگ ایک بار پھر مصروف نظر آئے۔ اب وہ پیپر میشی کے ننھے منے سرخ پیالوں میں خوش نصیبی کے لیے ایک خاص شراب پی رہے تھے۔ ہمارے سراپا اخلاق جاپانی میزبان نے خوش قسمتی کے اس دورِ جام میں ہمیں بھی شریک کرنے کی اشاروں کنایوں سے بہت کوشش کی۔ آخر ہماری تقدیر کی جانب سے مشکوک بھی ہوا اور مایوس بھی۔ اسی نے بتایا کہ اس خاص شراب کا نام ساکی ہے۔ اور اس مقام پر یہ خوش نصیبی کا دن سال میں ایک بار ہی آتا ہے۔

قریب ہی نوادرات کی دکان پر اس قسم کے پیالے فروخت ہو رہے تھے۔ دو سرخ کوزے میں نے بھی خرید لیے۔ لیکن ابھی تک ان میں پانی پینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا اسی پہاڑی کے دامن میں جھیل کے کنارے رنگین چھتریوں کے سائے میں کھایا۔ اور بہت دیر وہیں کرسیوں پر بیٹھے حسین منظر دیکھتے رہے۔ ہوٹل واپسی رات کو ہوئی۔

ہوٹل ڈائی چی ٹوکیو کے رونق والے علاقے میں تھا۔ گنزا' ٹوکیو کے نزدیک۔ جہاں تین ہزار ریستوراں' شراب خانے اور دکانیں ہیں۔ اور جو ٹوکیو کا سب سے بارونق علاقہ ہے۔ ہم نے کئی شاپنگ سینٹر بھی دیکھے۔ مٹسی کوشی اور مٹسویا وغیرہ۔ مونو ریل میں بھی سفر کیا جو شہر کے اوپر ایک موٹے تار جیسی پٹڑی پر نہایت تیز رفتاری سے چلتی' گھومتی' بھاگتی دوڑتی پورا شہر کسی البم کی طرح ہمیں دکھا رہی تھی۔ تصویریں ہی تصویریں۔

ٹوکیو نگاہوں کو تھام لینے والی روشنیوں کے علاوہ پھولوں کا شہر بھی ہے۔ دکانوں کے آگے برآمدوں میں پھول' شاپنگ پلازہ کی راہ داریوں میں پھول' کہیں گملوں' کہیں گلدانوں میں۔ حد یہ ہے کہ ہم نے ٹیکسیوں میں بھی ایک چھوٹے سے گلدان میں پھول لگے ہوئے دیکھے۔ ٹیکسی میں بالشت بھر کا ایک ٹی وی بھی سامنے لگا ہوتا۔

اس بہاراں بہاراں نگر کے نام میں نے ایک نظم "رسمِ تعارف" کے عنوان سے لکھی تھی۔ آخری کے دو مصرعے ہیں۔

تیری گلیوں میں اے وادیٔ مہرباں
زندگی سے ہمارا تعارف ہوا

یہ ہیروشیما کی قیامت گزر جانے کے بعد والا جاپان تھا جس کو زیادہ مدت بھی نہیں گزری تھی۔ جاپانی قوم کو قدرت نے گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ بے مثال صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس قوم کا ذوقِ جمال بھی منفرد ہے۔ مصوری کے نمونے ہوں یا آرائشِ گُل کے انداز' اپنی الگ ہی پہچان رکھتے ہیں۔ بونزائی تو مدتوں جاپانیوں کے کمالِ فن کا ناقابلِ تقلید کارنامہ رہا ہے۔ یہ تناور درخت جو چھوٹے چھوٹے پودوں کے قدو قامت میں اپنی طبعی عمر گزارتے ہیں۔ کسی بدھ بھکشو کی طرح سراپا قناعت اور توکل۔ اب تو دوسرے ممالک میں بھی بونزائی (یا بونسائی) کے کامیاب نمونے موجود ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان حسینوں پر ترس بھی آیا۔ یہ درخت جن کا سایہ سائبان بننے سے محروم رہا۔ جن کی چھاؤں تلے کسی تھکے ہارے مسافر نے دو گھڑی راحت حاصل

نہیں کی۔ جن کی شاخوں نے آشیانے کی امانت نہیں سنبھالی۔ جنھوں نے شام ڈھلے بسیرا لینے والے طائروں کی چہکار نہیں سنی۔ سوچتی رہی کیا ان فن پاروں نے نگاہِ تحسین و آفریں کی بہت بڑی قیمت ادا نہیں کی۔ مگر یہ دست انساں کاشہ کار یقیناً" ہیں۔

ٹوکیو سے ہماری اگلی منزل ہوائی کا جزیرہ تھا۔ ہوائی کا سفر شام کو شروع ہوا اور بہت دیر اور بہت دور تک شفق کے شوخ رنگ ہمارے ساتھ چلے۔ مجھے اختر ریاض الدین کا سفر نامہ "دھنک پر قدم" یاد آگیا۔ اس وقت لالہ رُو شفق ہماری ہم سفر تھی۔ کئی گھنٹے بعد ہی رات اپنے قدم جما سکی۔ اور آسمان اور سمندر کی حدود ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

جاپان ایئرلائنز کے اس طیارے میں مسافر بہت کم تھے۔ اس لیے سب نے نشستوں کی درمیانی رکاوٹیں ہٹادی تھیں اور آرام کر رہے تھے۔ یا سو رہے تھے میرا تو ہر سفر ابھی تک پہلا ہی سفر ہوتا تھا اس لیے سونے کا ارادہ ہی نہیں کرتی تھی جن گلی کوچوں یا قصرو بام سے ہو کر آتی' اگلی منزل تک ان سے جدائی کیوں گوارا کی جاتی۔

ہانولولو پہنچنے سے کچھ پہلے ہماری جاپانی ہوائی میزبان نے ہمارے سرہانے ایک ایک بڑا لفافہ رکھا تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لفافہ دیکھا۔ وہ دراصل تہنیت نامہ تھا۔ ہم نے اس وقت ڈیٹ لائن (تاریخ اور دن کے تعین کے لیے جو حد مقرر کی گئی ہے) عبور کرلی تھی۔ اور یہ ایک نہایت مبارک موقع سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے جس دن کی شام کو سفر شروع کیا تھا اب وہی دن ہماری زندگی میں دوبارہ طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ سات دیویوں نے ہمیں سات برکتوں کی نوید دی تھی۔ ہر دیوی کے نام کے ساتھ اس کی دی ہوئی بشارت یا آشیرباد لکھی ہوئی تھی۔ سفر کچھ اور بھی دلچسپ ہو گیا۔

ہانولولو پہنچے تو پلاسٹک کے پھولوں کے لمبے لمبے ہار پہنا کر ہمارا استقبال کیا گیا۔ اب ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی زمین پر تھے۔

ہانولولو سے دوسرے ہی دن ہم دونوں سان فرانسسکو پہنچے اور وہ امریکہ کا پہلا شہر تھا جسے ہم نے دیکھنے کی طرح دیکھا۔ وہاں انور صاحب (پورا نام یاد نہیں) کونسل جنرل تھے۔

ان کے گھر چار پانچ دن ہم نے قیام کیا۔

اپنے کمرے میں پہنچے تو ایک بڑے گلدان میں گلاب کے سرخ پھولوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پاس ہی ایک کارڈ رکھا تھا۔ یہ تحفہ نور کے ایک امریکن دوست نے بھیجا تھا۔ ساتھ ہی یہ پیغام بھی تھا کہ اگلی صبح وہ ہمیں سان فرانسکو کے قابلِ دید مقامات دکھانے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ یہ صاحب لاہور میں واپڈا سے منسلک رہے تھے۔ نور ان دنوں ممبر فنانس واپڈا تھے۔ پاکستان سے روانہ ہونے سے پہلے نور نے انہیں اپنے پروگرام اور وہاں کے پتے سے آگاہ کر دیا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنی گاڑی میں ہمیں لینے آئے تو پہلے تو یہ معذرت کی کہ ان کی بیوی ساتھ نہیں تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے بوسٹن گئی ہوئی تھیں۔ کیلی فورنیا میں برکلے اور سینٹا باربرا جیسی جامعات کے موجود ہوتے ہوئے ان کے اس فیصلے پر ہم نے حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ یہاں منشیات کا استعمال کسی وبا کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ ہر قسم کے نشے میں بے سُدھ لڑکے لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ میساچیوسٹس اس وبا سے محفوظ ہے۔ بوسٹن میں تعلیمی معیار کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بہتر ہے۔ لڑکے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے اتنی دور بھیجنے کا فیصلہ بھی ان کی بیوی نے کیا تھا اور وہی اس کی جدائی اور دوری کے خیال سے بہت زیادہ اداس اور پریشان بھی تھی۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کہنے لگا۔

"ماں کا دل بھی عجیب ہوتا ہے۔"

ہمارے تصور میں مغربی تہذیب و تمدّن کا کچھ اور ہی نقشہ رہا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ اس وقت مجھے وہ امریکن عورت خالص مشرقی گھریلو عورت اور ماں نظر آئی جو مغرب کی تیز رفتار اور خود گرفتار زندگی میں بھی اپنی اولاد کی فلاح کی خاطر اپنے دُکھ بلکہ اپنے وجود کو بھول جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ایک وقت تھا جب میری ماں نے اپنے بچّوں کے لیے قدیم رسوم و رواج کے خلاف جہاد کیا تھا اور بہت کچھ سہا تھا۔

ہم سان فرانسکو میں نور کے امریکن دوست کے ساتھ اس کی موٹر میں نئی دنیا کو پہلی

بار آنکھ بھر کر دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ نور اس سے قبل بھی امریکہ جا چکے تھے۔ میرے لیے وہ اوّلین موقع تھا۔

اس ساعت مجھے اپنا ایک اور پہلا سفر یاد آگیا۔ جب حویلی سے باہر کی فضا کو میری آنکھوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ٹونک والا پھاٹک سے باہر کی ہواؤں میں سانس لینا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں تھا۔ کیا کیا انتظام اور کیسا کیسا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس دن روانہ ہونا تھا اس رات نیند تو بالکل ہی نہیں آئی۔ یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں بزرگ ہمیں ساتھ لے جانے کا ارادہ ہی ترک نہ کردیں۔

یہ سفر باجی کی شادی کے موقع پر ہوا تھا۔ اور بدایوں کے ریلوے پلیٹ فارم سے بریلی کے ریلوے پلیٹ فارم تک محدود تھا۔ ان دونوں شہروں کے درمیان فاصلہ تقریباً" تیس میل ہے۔ اس سفر کی تقریب یوں نکل آئی کہ باجی اور بھائی صاحب (ڈاکٹر مقبول الحق) کو بنارس جاتے ہوئے گاڑی تبدیل کرنے کے لیے بریلی میں پانچ چھ گھنٹے قیام کرنا تھا۔ انہیں رخصت کرنے ہم سب بریلی تک گئے تھے اور اگلی ٹرین سے واپس آگئے۔

سامنے کی سیٹ پر نور اور ان کے دوست محوِ گفتگو تھے۔ اچانک گولڈن گیٹ برج کا نام سن کر میں اپنے دھیان کی دنیا سے واپس آگئی۔ گاڑی کشادہ شاہراہ پر رَواں تھی۔ سامنے بہت فاصلے پر کہر کی چادر اوڑھے ہوئے کسی پُل کے دُھندلے دُھندلے آثار نظر آرہے تھے۔

گولڈن گیٹ برج پہلی ہی نظر میں بے حجابانہ سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔ فاصلہ کم ہوا تو دنیا کا یہ حسین ترین اور بے نظیر پُل ہوا میں آویزاں ایک عظیم الشان ہلال کی صورت نظر آیا۔ گولڈن گیٹ برج ۱۹۳۷ء میں مکمل ہوا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا آویزاں پُل ہے۔ جن دو ستونوں کے درمیان فولاد کے صرف دو تاروں کے سہارے خلیج پر اسے تعمیر کیا گیا ان کی اونچائی سات سو چھیالیس فٹ اور ایک ٹاور سے دوسرے ٹاور تک فاصلہ چار ہزار دو سو فٹ ہے۔ ہمارا امریکن ساتھی اس پُل کی تاریخ اور تفصیل سے ہمیں آگاہ کرتا رہا۔ اس کا درمیانی حصّہ سطحِ سمندر سے دو سو پینسٹھ (۲۶۵) فٹ بلندی پر ہے۔

گولڈن گیٹ برج بے شک دستِ انساں کی صناعی کا نادر شاہکار ہے۔

نور کے دوست نے دوسری خاص جگہ جو ہمیں دکھائی وہ ریڈوڈ کے جنگلات تھے۔ ان درختوں کی لکڑی سرخ تو نہیں ہوتی صرف تنوں کا رنگ کچھ سرخی مائل ہوتا ہے۔ لیکن انہیں ریڈوڈ ہی کہا جاتا ہے۔ ریڈوڈ کے درخت نم آب و ہوا میں نشو ونما پاتے ہیں۔ یہ جنگل سان فرانسسکو خلیج کے اطراف ہیں۔ اور تین ہزار فٹ کی بلندی تک پائے جاتے ہیں۔ پہلے یہ درخت وسیع علاقے کو گھیرے ہوئے تھے۔ بعد میں بہت سے اشجار کاٹ کر انہیں ایک خاص رقبے تک محدود کر دیا گیا۔

ریڈوڈ دنیا کے بلند ترین درخت ہیں اور تین سو فٹ تک اونچے ہو سکتے ہیں۔ ان کے تنے کی چوڑائی پندرہ سے بیس فٹ تک ہوتی ہے اور دو ہزار سال کی عمر تک پہنچتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے ان کے تنے موٹے ہوتے جاتے ہیں اور نیچے کی شاخیں گر جاتی ہیں۔

ہماری موٹر درختوں کے سائے سائے بنی ہوئی سڑک پر اپنی ہی روشنی کے سہارے گھومتی مڑتی گزر رہی تھی۔ راستہ بنانے کے لیے کچھ درخت کاٹے بھی گئے ہوں گے آس پاس گھنا جنگل تھا اور اندھیرا۔ زمین پر سُوکھے پتے اور شاخیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ سورج کی کرنوں کو زمین تک آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بھیگی ہوئی ہوا دبے پاؤں پاس سے گزر جاتی۔

ایک جگہ پہنچ کر امریکن رہنما نے موٹر روک لی۔ ہم باہر آگئے۔ کہنے لگا اس جگہ سڑک ایک درخت کے تنے کے درمیان سے گزر رہی ہے۔ اوپر سر اٹھا کر دیکھا تو وہ واقعی ایک درخت تھا جس کی ٹہنیوں پر سبز پتے بھی تھے۔ میں نے سوچا فراخی تو دلوں کی میراث ہے۔ اس کرخت لکڑی کو اتنا ظرف کہاں سے ملا۔

یہ اس جنگل کا معمّر ترین درخت تھا۔ اس درخت کا تنا دو حصّوں میں بَٹا ہوا تھا جس پر سڑک بنائی گئی تھی۔ اوپر شاخوں کے تانے بانے نے پھر انہیں ایک کر دیا تھا۔

ہم اس سبز اندھیری فضا میں تھوڑی دیر پیدل چلتے رہے۔ واپس آئے تو پھر اس

عجیب فراخ طینت درخت پر نظر پڑی۔ پوچھنے کو جی چاہا کہ تم ہزار دو ہزار سال سے اس دنیا کے موسموں کو جھیل رہے ہو۔ تمہارے لیے تو یہ اتنی پرانی بات نہیں ۔ مجھے بتاؤ کہ جب سفید فام آقاؤں نے اس نوجوان حبشی لڑکے کے پیر کی انگلیاں اس جرم میں کاٹی تھیں کہ وہ آزادی کا خواہاں ہوا تھا۔ فرار کی کوشش کی تھی۔ وہ جسے آٹھ نو سال کی عمر میں افریقہ کے ایک گاؤں سے اس کے آقاؤں کے کارندے اٹھا لائے تھے۔ صرف اس لیے کہ انھیں اپنی زمینوں کو شاداب کرنے اور کپاس کی فصلیں اگانے کے لیے غلاموں کی کئی نسلیں درکار تھیں۔ اور وہاں اس کی ماں بانس کی اُبلی ہوئی کونپلیں اور ناریل کا پانی لکڑی کے پیالوں میں رکھے اس کی راہ تکتی رہی تھی۔ مجھے بتاؤ کہ وہ جو آزادی کے خواب سے بھی محروم ہوا کیا تم نے اس کی اندوہناک چیخ سنی تھی۔ وہ پکار تو اس پورے برّاعظم میں گونجی ہوگی۔ اور پھر ہواؤں نے اس امانت کو ہمیشہ کے لیے سنبھال لیا ہوگا۔ اس آواز اور اس جیسی دوسری چُبھتی ہوئی آوازوں کو کبھی تو نامہ بر ہوا کی کوئی اداس لہر تم تک بھی لائی ہوگی۔ تم جو اتنے مہربان ہو کہ مشین سے چلنے والی گاڑی کے راستے میں بھی رکاوٹ نہیں بنتے۔

پچھلے دنوں اور گئے وقتوں کی بہت سی باتیں اس طویل قامت اور جہاں دیدہ درخت سے پوچھنے کو جی چاہ رہا تھا۔

سان فرانسسکو سے ہم لوگ لاس اینجلز گئے۔ وہیں ڈزنی لینڈ اور ہالی وڈ بھی ہیں۔ ہمیں وہاں ایک دن رہنا تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان انتخاب کا معاملہ تھا۔ ہم نے ڈزنی لینڈ کا انتخاب کیا اور پشیمان ہوئے۔ بچّے بہت یاد آئے۔

ڈزنی ورلڈ کی تعمیر یا تخلیق بہت بعد میں فلوریڈا میں ہوئی۔ وہ میں نے ۸۶ء میں دیکھا۔ آرلینڈو میں اسلم رہتے تھے۔ باجی بھی گئی ہوئی تھیں۔ وہ جگہ اسلم کے گھر سے بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت تک ہمارے سب بچّے یہ تفریح گاہیں دیکھ چکے تھے اس لیے ہم دونوں بہنوں نے ہر منظر دل لگا کر دیکھا۔ ایپکاٹ سینٹر میں سائنس کے ناقابلِ یقین معجزے نظر آرہے تھے۔

۶۸ء کے بعد ۸۸ء میں ہم صبیحہ زبیر اور بچوں کے ساتھ دوبارہ لاس اینجلز گئے۔ اس بار ہالی وڈ بھی دیکھا اور بحرالکاہل کے ساحل پر طویل ترین شاہراہ ہائی وے ون پر بھی سفر کیا۔ بچوں کے ساتھ ہم نے بہت سے غیر معمولی سفر بھی کیے ہیں ان کا ذکر بعد میں سہی۔

۶۸ء میں تو لاس اینجلز کو طائرانہ نگاہ سے ہی دیکھا۔ اگلی صبح ہماری روانگی تھی۔ وہ صبح مجھے خوب یاد ہے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر پیغام دیا کہ ہمیں صبح سات بجے کمرے میں چائے بھیج دی جائے۔ پتہ چلا کہ آٹھ بجے ناشتہ پیش کیا جائے گا اور چائے بھی اسی وقت مل سکتی ہے۔

چائے خانے ہم نے راستے میں جگہ جگہ دیکھے تھے۔ چنانچہ صبح صبح ہلکی خنکی میں ہم دونوں چائے کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اور آخر ایک چائے خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ریستوراں کا شیشے کا دروازہ بند تھا۔ اندر ناشتے کا سامان سلیقے سے چُنا جاچکا تھا۔ چائے اور کافی کے بڑے بڑے سماوار سامنے نظر آ رہے تھے جن میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے مالکن یا خادمہ کھڑی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ آواز جا نہیں سکتی تھی۔ اور ہمیں ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔ اشاروں سے اپنا مدّعا بیان کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دروازے کے شیشے پر لکھی ہوئی عبارت کی طرف اشارہ کیا۔ ریستوراں کے کُھلنے کا وقت ساڑھے چھ بجے تھا اور اس وقت سوا چھ بجے تھے۔ اور ہمیں ہوٹل پہنچ کر ایئرپورٹ روانہ ہونا تھا۔

اس زمانے میں میرے دونوں بھانجے ڈاکٹر نعیم الحق اور اسلم حق امریکہ میں مقیم تھے۔ اتفاق تھا کہ باجی اور بھائی صاحب بھی وہیں تھے۔ ہم پہلے نعیم کے پاس سن سنائی گئے اور پھر اسلم کے گھر وچیٹا کینسس میں ٹھہرے۔ دونوں شہروں کے پارک، مصنوعی جھیلیں اور بازار دیکھے اور واشنگٹن روانہ ہو گئے۔

پردیس

ستمبر کی آخری تاریخوں میں ہم واشنگٹن پہنچے جہاں نور کو عالمی بینک کے ای ڈی آئی کورس میں شریک ہونا تھا۔ اس کورس کی مدت چھ مہینے تھی۔ پاکستان کے دوسرے مندوب ثناء الحق تھے جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات نہایت واضح نظر آرہے تھے اور بڑھتے جا رہے تھے۔

عالمی بینک میں ایک ہی وقت میں کئی قسم کے کورس جاری رہتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی کنکورڈیا کی عمارت میں مختلف ممالک کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ جمع تھے۔ اس عمارت میں رہائش کا معقول انتظام تھا۔ سب کو علیحدہ علیحدہ رہائش گاہ دی گئی تھی جو دو کمروں اور ایک باورچی خانے پر مشتمل تھی۔ مناسب اور ضروری فرنیچر بھی موجود تھا۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک کشادہ نشست گاہ اور اس کے پیچھے ہماری خواب گاہ تھی۔ دونوں کمروں میں میزوں پر خوبصورت لیمپ رکھے ہوئے تھے۔ امریکہ میں دیوار یا چھت کے ساتھ بلب صرف باورچی خانے اور غسل خانے میں ہوتا ہے۔ کمروں میں روشنی کے لیے لیمپ استعمال ہوتے ہیں۔ نشست گاہ کا ایک کونا ہمارا کھانے کا کمرہ بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے میں برتن دھونے کی مشین کے علاوہ ضرورت کے تمام برتن موجود تھے۔ ہم نے اس گھر میں دوستوں کی دعوت بھی کی اور کبھی پلیٹوں وغیرہ کی کمی نہیں پڑی۔ امریکہ میں یہ ہماری پہلی قیام گاہ تھی۔ خوشنما اور آرام دہ۔

روزانہ سیاہ فام نسل کی ملازمہ ہمارے اپارٹمنٹ کی صفائی کرتی اور تولیے تبدیل

کرتی۔ ہفتے میں دو مرتبہ چادریں بھی بدلی جاتیں۔ غسل خانے اور باورچی خانے میں صابن کی نئی ٹکیہ بھی رکھ دی جاتی۔ ہمیں صرف کھانے پینے کا سامان خود خریدنا ہوتا تھا۔ جس میں پہلے پہل مشکل یہ آن پڑی کہ بہت سی دیسی چیزوں اور مسالوں کے نام ہمیں انگریزی زبان میں یاد نہیں آتے تھے یا معلوم ہی نہیں تھے۔ مثلاً "بیسن" اس بیسن نے بہت خوار کیا کسی شیلف پر بیسن کا پیکٹ نظر نہیں آیا تو قیمت وصول کرنے والی عورت کو چنے کی دال دکھائی اور پسی ہوئی دال طلب کی۔ وہ بڑی معصوم حیرت سے ہمیں دیکھتی اور نفی میں سر ہلاتی رہی۔ اور لوگوں سے بھی پوچھا اور اکثر پوچھا لیکن ناکام رہے۔ ایک دن مسز شعیب کے سامنے ذکر آگیا۔ مشکل حل ہو گئی۔ ایک اسپیشل دُکان پر جاکر امریکن تلفظ کے ساتھ ہم نے انگریزی زبان میں بیسن طلب کیا تو وہ عورت اردو میں بولی۔

"بیسن چاہیے؟"

پتہ چلا اس کا تعلق ہندوستان سے تھا اور اس اسٹور میں ملازم تھی۔

شروع شروع میں امریکہ میں کھانا پکانا بڑا دلچسپ مشغلہ معلوم ہوا۔ یوں بھی صبح سے دوپہر تک اکیلی ہوتی تھی۔ کھانا پکانے میں مشغول رہتی تو بچے بھی اتنے یاد نہیں آتے تھے۔ کھانا پکانے کھڑی ہوتی تو چاروں چولھوں پر ہانڈیاں چڑھا دیتی۔ کسی چولھے کو خالی چھوڑ دینا ناانصافی معلوم ہوتی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کھانا ضرورت سے زیادہ بچ جاتا۔ اور کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جسے دے دیا جائے۔ اس وقت گھر میں نوکر کی موجودگی کا اصلی فائدہ ہم پر کھلا۔

جب سالن کسی صورت ختم ہوتا نظر نہیں آتا تو مجبوراً منھ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ برتن دھونے کی چلچی میں بہا دیتی۔ رزق کو پھینکنا آسان کام نہیں ہوتا۔

روٹی کا متبادل ڈبل روٹی کو بنا لیا گیا تھا۔ یا پھر چاول ابال لیے جاتے۔ نور اس انتظام سے قطعی مطمئن تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد مجھے روٹی کی یاد نے ستانا شروع کیا۔ سبزی، دال، گوشت وغیرہ پکانا تو شادی کے بعد نوکر کی عدم موجودگی سے موجودگی تک کے وقفوں نے بڑے التزام کے ساتھ پہلے ہی سکھا دیا تھا۔ لیکن پاکستان میں روٹی دکان سے مل جاتی

ہے اس لیے کبھی پکانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اب امریکہ میں بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔ اب تو وہاں شہر شہر پاکستانیوں اور خصوصاً ہندوستانیوں کی دکانوں نے ہمارے ذوق اور ذائقے کے مطابق تمام چیزیں مہیا کرنا شروع کر دی ہیں۔ ان دکانوں پر میں نے "جنگ" اور "نوائے وقت" اخبار بھی دیکھے اور اردو کے مختلف ڈائجسٹ بھی۔ ہاں ہماری علمی اور ادبی کتب اب بھی کسی دکان پر موجود نہیں ہوتیں۔

ان دنوں واشنگٹن میں صرف دو ہسپانوی دکانیں تھیں جہاں کبھی کبھی نان مل جاتی تھی۔ جس دن ہرا دھنیا مل جاتا اس دن تو کسی کی دعوت کرنے کو دل چاہتا تھا۔

ایک دن میں نے روٹی پکانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ آٹا گوندھا تو اس میں گٹلیاں پڑ گئیں۔ مایوس ہو کر ایک طرف رکھ دیا۔ دوسرے دن دیکھا تو وہ اچھی طرح گندھے ہوئے آٹے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ آئندہ اسی ترکیب پر عمل کرتی رہی۔ شروع میں یوں بھی ہوا کہ میں نے روٹی پکائی اور پاپڑ کی قسم کی کوئی چیز تیار ہو گئی جسے شوربے میں ڈال کر چمچے کی مدد سے کھایا جا سکتا تھا۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ ایک دن بڑا خوبصورت پھلکا تیار ہوا۔ خوش ہو کر اسے پکڑا تو انگوٹھا دونوں پرتوں کے درمیان چلا گیا۔

کئی دن چھالے کا علاج ہوتا رہا

کنکورڈیا میں ہم دونوں تیسری منزل پر تھے۔ ہر ہفتے ایک شام پہلی منزل کے ہال میں تمام مندوبین کی دعوت ہوتی تھی۔ جس میں سب شریک ہوتے۔ مقصد یہ تھا کہ مختلف ممالک اور مختلف تہذیب و تمدن سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کو پہچانیں۔ اس ایک گھر میں کچھ مہینے ساتھ رہنے والوں کے درمیان کچھ قربت کا احساس بھی پیدا ہو۔ ایسے موقعوں پر ظاہر ہے ذریعۂ گفتگو انگریزی زبان ہی ہوتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں دو ہسپانوی مل جاتے باتوں کا سلسلہ بھی ہسپانوی زبان سے جا ملتا۔ اسی طرح فرانسیسی بولنے والے انگریزی سے فرانسیسی پر آجاتے جو بے ساختہ اور قدرتی عمل تھا۔ لیکن ہم پاکستانیوں کے درمیان یگانگت کا یہ مظاہرہ کوشش کے باوجود ممکن نہیں ہو سکا۔

یہ ایوب خاں کے دور حکومت اور جشن عشرۂ ترقی دونوں کا آخری زمانہ تھا۔ بنگلہ

دلیش ذہنوں میں پرورش پارہا تھا۔ ان دنوں بنگالی اصحاب اردو بولنا تو درکنار سمجھنا تک نہیں چاہتے تھے۔ ہم پاکستانی جب ان محفلوں میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے یا کھڑے ہوتے تو آپس میں گفتگو انگریزی زبان میں ہوتی۔ اس کے برعکس ہندوستان سے جو دو مندوب آئے تھے ایک مدراس اور ایک بہار سے ان لوگوں سے بے تکلف اردو میں باتیں ہوتی تھیں۔ ان کی ہندی اور ہماری اردو میں گفتگو کی حد تک کوئی فرق نہیں تھا۔

اس پورے کورس کے لیے ہماری جو میزبان تھی اس نے اس بات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک دن مجھ سے کہا۔

"آپ پاکستان کے دونوں حصوں میں رہنے والے ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہیں۔ جبکہ ہندوستانیوں کی اور آپ کی زبان ایک ہے"

اصل وجہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی تھی۔

بات رکھنے کے لیے میں نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک محاورہ ہے۔"جیسا دیس ویسا بھیس" شاید اسی لیے آپ کے ملک میں آپ کی زبان ہماری ترجمانی کررہی ہے ورنہ کوئی مجبوری نہیں ہے بے شک علاقوں کی اپنی اپنی زبانیں بھی ہوتی ہیں لیکن اردو ہماری رابطے کی زبان بھی ہے۔ پاکستان کا ہر فرد اس زبان کو بولتا اور سمجھتا ہے۔

واشنگٹن خوبصورت شہر بھی ہے اور تاریخی بھی۔ ہمیں تمام تاریخی مقامات دکھائے گئے۔ لنکن میموریل' جیفرسن میموریل' کیپٹال ہل وغیرہ۔ کیپٹال میں کانگریس اور سینیٹ کے اجلاس ہوتے ہیں۔ اس کے بڑے ہال کی گول چھت اندر سے مصوری کے نادر نمونوں سے آراستہ ہے۔ سپریم کورٹ کی عمارت بھی دیکھی۔ واشنگٹن میموریل یوں بھی اپنی بلند عمودی شکل کی وجہ سے دور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ اس کے اندر سیڑھیاں بھی ہیں اور لفٹ بھی۔ لوگ اوپر جاکر پورے شہر کا نظارہ کرتے ہیں۔

اسمتھ سونین نمائش گاہ بھی پہلی بار ہم نے امریکہ میں اپنے اوّلین قیام کے زمانے میں دیکھی تھی۔ یہ میوزیم کئی عمارتوں میں ہے۔ ہر عمارت کے اندر کئی شعبے ہیں۔ یہاں ہم نے وہ پہلا ہوائی جہاز دیکھا جو دو بھائیوں رائٹ برادرز (Wright Brothers)

کے تخلیق کار ذہن اور انتھک محنت کا کارنامہ تھا۔ وہ ہوائی جہاز بھی دیکھا جس میں آدم کے ایک جیالے بیٹے کرنل لینڈبرگ (Col. Landberg) نے تنہا بحراوقیانوس عبور کیا۔

میوزیم کے ایک حصے میں سائنس کی ابتدا سے لے کر آج کے ترقی یافتہ دور تک کے تمام مراحل کی فلم پردہ سیمیں پر لگا تار جاری رہتی ہے۔ انسانی علم و دانش کے ارتقا' شوق کی رسائی اور اس کے عزم و یقین کی سلسلہ بہ سلسلہ داستان۔

ایک حصے میں جواہرات کی نمائش کا اہتمام ہے۔ اور ایک جانب وہ تمام ملبوسات نظر آتے ہیں جو ابتدا سے اب تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہر صدر کی بیوی نے امریکہ کی خاتون اوّل کی حیثیت سے پہلی تقریب میں پہنا تھا۔

میوزیم کے مختلف گوشوں میں مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ وہاں پاکستان کا ایک گاؤں بھی بسا ہوا ہے اور ہندوستان کی دیہی زندگی کے مناظر بھی موجود ہیں۔

واشنگٹن سے تقریباً" تیس چالیس میل دور ورجینیا اسٹیٹ میں امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی رہائش گاہ ہے۔ جہاں اس کے استعمال کا تمام سامان اسی انداز سے محفوظ رکھا گیا ہے جیسا اس کی زندگی کے زمانے میں تھا۔ مطالعے کے کمرے میں وہی میز اور وہی کرسی رکھی ہوئی ہے۔ میز پر کتابیں بھی ہیں اور اس کی عینک بھی۔ روشنی کے لیے فانوسوں میں موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس دو ڈھائی سو برس پرانے امریکن گھر کا باورچی خانہ بھی دیکھا۔ برتن وہی تھے جو ہمارے آج کے عام باورچی خانوں میں ہوتے ہیں۔ وہی انگیٹھی وہی آتشدان۔ جیسے ابھی گھروالی لکڑی اور کوئلے کی آنچ پر کھانا پکانے آرہی ہو۔ ایک طرف کچھ حنوط شدہ آبی اور صحرائی پرندے لٹکے ہوئے تھے۔

ہم لوگوں کو امریکہ کے جواں سال مقتول صدر کینڈی کی آخری آرام گاہ دکھانے بھی لے جایا گیا۔ جہاں اس کے مدفن پر شعلۂ جاوداں فروزاں کیا گیا ہے۔

اب سے آٹھ دس برس قبل واشنگٹن میں کینڈی سینٹر بھی بن گیا ہے۔ جو اپنی

آرائش اور زیبائش کے لحاظ سے واقعی قابل دید ہے۔ پہلی منزل کے مستطیل ہال میں تانبے کے قد آدم سے اونچے ستون پر اسی دھات سے بنا ہوا کینیڈی کا چہرہ' سامنے ایک پوری دیوار کے طول و عرض میں آئینے لگے ہوئے۔ چھت پر شفاف بلوریں جھاڑ فانوس آویزاں۔ ہر طرف روشنیاں برستی ہوئی۔ بالائی منزلوں میں کئی تھیٹر اور سینما ہال۔ سیاحوں کے لیے عجائبات کی دکانیں۔

۶۸ء میں ہماری میزبان ہمیں ولیمزبرگ بھی لے گئی۔ نئی دنیا کی دریافت کے بعد آباد کاروں کے اولین گھروں کے نمونے امریکہ کی مختلف ریاستوں میں نمائش کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایسا ہی ایک روایتی شہر واشنگٹن کے نزدیک ولیمزبرگ ہے۔ جب پہلی بار سمندر پار سے آنے والے اس خطۂ زمین پر آباد ہوئے تھے تو ان کا لباس ان کی بود و باش کیا تھی یہ سب ان نمائشی گھروں میں دکھایا جاتا ہے۔ یہاں جو خواتین اور مرد سیاحوں کی رہ نمائی کرتے ہیں ان کے لباس بھی قدیم طرز کے ہوتے ہیں۔ جیسے کئی صدیوں کی دھند کو پار کرکے ہم اچانک ماضی بعید کے گلی کوچوں میں نکل آئے ہوں۔ سادہ سادہ زندگی' چھوٹی چھوٹی ضروریات زندگی' رات میں نیم روشن گلیاں' دن میں کرگھا' چولھا اور بیل۔
ان دنوں ہم نے بہت سے خوبصورت اور دلچسپ منظر دیکھے۔ بحیثیت مجموعی امریکی قوم کی خوش حالی اور کامرانی کی داستان دیکھی بھی اور سنی بھی۔ لیکن انہوں نے ہمیں یہ کبھی نہیں بتایا نہ ایسا کوئی میوزیم دکھایا جس سے اندازہ ہوتا کہ نئے بسنے والوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں ریڈ انڈین لوگوں کو ان کی زمینوں سے کس طرح بے دخل کیا تھا اور پھر ان پر کیا بیتی۔ کیا وہ مظلوم نہیں تھے۔ کیا وہ قابل ذکر بھی نہیں تھے۔

ریڈ انڈین کا نام بھی انہیں نئے آباد کاروں نے دیا تھا۔ اب بھی جو بچے کھچے پرانے امریکن باشندے رہ گئے ہیں وہ عام طور پر کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے۔

کئی سال بعد جب ہم دونوں صبیحہ اور زبیر کے ساتھ سنگ زرد کی وادی میں گئے تھے تو وہاں ایک جگہ دیکھی جہاں ریڈ انڈین باشندوں کی دست کاری کے نمونے رکھے گئے تھے۔ ممکن ہے کئی اور دور دراز علاقوں یا شاید شہروں میں بھی سیاحوں کے ذوق تماشا کی

تسکین کے لیے اس قسم کے نمونے سجائے گئے ہوں۔

انہیں دنوں ان کا روایتی یوم تشکر بھی آیا۔ اس موقع پر تمام مندوبین کو مختلف امریکی گھروں سے عشائیہ میں شرکت کے دعوت نامے وصول ہوئے۔ یہ تہوار نومبر کے تیسرے ہفتے' پیر کے دن اس نئی دنیا کی دریافت کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ ہم دونوں بھی ایک امریکی خاندان کے مہمان تھے۔ اس دعوت کی خاص ڈش ٹرکی ہوتی ہے جو بڑے اہتمام سے پکائی جاتی ہے۔

ٹرکی دراصل نہایت بد شکل اور بدذائقہ صحرائی مرغی ہوتی ہے جب پہلی مرتبہ امریکہ کی موجودہ سفید فام نسل کے اجداد نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا تو کھانے کے لیے جو اولین شے دستیاب ہوئی تھی وہ یہی صحرائی مرغی تھی۔ اس لیے یوم تشکر پر اس کا پکانا ان کے لیے ایک مبارک روایت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اس دعوت میں خوب موٹی تازی ٹرکی پکائی جاتی ہے۔ یہ دستور ہے کہ اس کھانے سے بچی ہوئی ٹرکی سنبھال کر منجمد کر لی جاتی ہے اور کرسمس کے دن اہلِ خاندان کی دعوت کے موقع پر یوم تشکر کی بچی ہوئی ٹرکی کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی ہے۔

بجلی کی چھری سے بڑی نفاست سے اس کے قتلے ہمارے سامنے کاٹے گئے۔ کھانے میں ایک اور خاتون مہمان اور بچے بھی شریک تھے۔ موسم خوشگوار تھا اور میزبان خوش اخلاق۔ دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ ہمارے میزبان میاں بیوی نے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہم ان سے پہلی بار ملے ہیں اور یہی ہماری آخری ملاقات بھی ہے۔ یہ ایک خوبصورت تجربہ تھا۔

ہمارے اسی قیام کے زمانے میں امریکن خلاباز پہلی بار چاند کی سطح پر پہنچے تھے۔ رات بھر جاگ کر ٹی وی دیکھتی رہی۔ تجسس تھا کہ اس اجنبی دیار میں ہماری زمین پر بسنے والوں کا خیر مقدم کس طرح ہو گا۔ کوئی تو ہو گا جو کشادہ دلی سے ان کی طرف بڑھے گا۔ کوئی سایۂ کوئی پرچھائیں یا کسی خوشبو کا احساس ۔ باتیں کرتی ہوئی چٹانیں اور اس بے برگ و بار وشت میں خراماں خراماں درخت۔ یہ نہیں تو پھر کوئی حریفانہ انداز ہی سہی۔ کچھ تو ہو۔

بچوں سے کون کہے گا کہ اب وہاں بڑھیا نے چرخہ کاتنا چھوڑ دیا ہے۔

برسوں بعد اسمتھ سونین کی نمائش گاہ میں وہ چاند گاڑی بھی دیکھی جو پہلی بار چاند کی سطح پر اتری اور وہاں کی چٹانوں اور مٹی کے نمونے لائی تھی۔ یہ نمونے شیشے کے شوکیس میں سجے ہوئے ہیں اور چاند کی سطح کا ایک نمونہ باہر بھی رکھا گیا ہے جسے چھونے کی عام اجازت ہے۔ میں نے اس ماہتاب پارے کو چھو کر دیکھا جو سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا پتھر کا ٹکڑا ہے۔ غالب نے سچ کہا تھا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

اس وقت میری نواسی صباح میری گود میں تھی جس کی عمر ایک ماہ تھی۔ میں نے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام کر اسے بھی چاند کے لمس سے آشنا کرنے کی کوشش کی تھی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں الیکشن کی رونق بھی دیکھی۔ ٹی وی پر جو بیانات دیے جاتے تھے وہ ہم جیسوں کے لیے نہایت حیرت انگیز تھے۔ امیدوار حضرات اور ان کے طرف دار اپنے موجود اور ہر طرح صاحب اقتدار صدر کے خلاف جو کہنا چاہتے بے جھجک اور بغیر کسی خوف و ہراس کہہ رہے تھے۔ نہ کوئی دھمکی تھی نہ عقوبت کا اندیشہ تھا۔ ہم ایسی آزادی تقریر سے کہاں آشنا تھے۔ وہ ۶۸ء تھا۔ اب تو ہم وہاں تک آپہنچے ہیں جہاں کسی قول و فعل پر حیرت بھی نہیں ہوتی۔

صدر کا الیکشن نومبر کے مہینے میں ہوتا ہے۔ صدارت کا عہدہ جنوری میں تفویض کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے کیپٹال کی عمارت کے باہر ایک اسٹیج بنا کر باوقار تقریب منعقد ہوتی ہے۔ تماشائیوں کے لیے بھی نشستوں کا انتظام ہوتا ہے۔ کیپٹال سے صدر کا جلوس وائٹ ہاؤس کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ اس جلوس کے راستے مقرر شدہ ہیں۔ اور وہاں بھی لوگوں کا منظم ہجوم ہوتا ہے۔ جو اپنا یہ تاریخی دن بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ مناتے ہیں۔ کسی لب پر حرف شکایت نہیں ہوتا۔ کسی چہرے پر ملال کی گرد نہیں ہوتی۔

میں ہمیشہ ہجوم میں تنہا ہو جاتی ہوں اور تنہائی سے گھبراتی بھی ہوں اس لیے ہم نے یہ تاریخی تماشا ٹی وی پر دیکھا۔ جب جانسن وائٹ ہاؤس سے رخصت ہو رہے تھے اور نئے

صدر نکسن اسی بے وفا قصرِ ابیض میں داخل ہو رہے تھے جس میں ان سے پہلے صاحبان نصیب داخل ہوئے اور چھوڑ کر جانے پر مجبور بھی ہوئے۔ اس مکان کے تین مکین تو قتل بھی ہوئے۔

دسمبر میں یگانگت کی عمارت کنکورڈیا میں تمام مندوبین نے اپنی میزبان کی زیرِ ہدایت کرسمس کا روایتی شجر سجایا۔ کرسمس کے زمانے میں وہاں کے شاپنگ پلازہ اور بازار نگاہوں کو تھام لیتے ہیں۔ سجاوٹ میں اتنی ندرتیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ چہار سو انبساط کے ہزار رنگ۔ اور میں پردیس کے اجالوں میں کھڑی ہوئی سوچ رہی تھی۔

تری سحر کے پاس میرے دن کی روشنی نہیں

(نظم تضاد رنگ)

پچیس دسمبر کو ہم دونوں کا ذوق تماشا ہمیں ان کی عبادت گاہ تک بھی لے گیا۔ ہم نے ایک دو گرجا اندر سے جا کر دیکھے۔ سامنے ڈائس کے ایک جانب موم بتیاں روشن تھیں۔ ہال میں بینچوں پر لوگ جاکر خاموش بیٹھ جاتے۔ کہیں پادری آکر وعظ دیتا کہیں لڑکیاں کرسمس کے مخصوص نغمے گاتیں۔ کبھی حاضرین میں سے کچھ لوگ اُٹھ کر اپنی مرادوں یا شاید یادوں کی شمعیں روشن کرتے۔ ہم نے وہاں کوئی شمع تو نہیں جلائی لیکن بینچ پر تھوڑی دیر ہم بھی خاموش بیٹھے رہے۔

انہیں دنوں میں نے واشنگٹن میں ایک غیر معمولی اور اپنی نوعیت کے پہلے اور آخری مشاعرے میں شرکت کی۔ اب تو امریکہ اور کینیڈا کے شہروں میں نہایت شاندار مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مقامی شاعر بھی بہت اچھے شعر کہہ رہے ہیں اور وہاں مختلف ادبی حلقے بھی وجود میں آچکے ہیں۔ دور دیس میں جاکر بسنے والوں نے حرفِ سخن کو اپنی پہچان بنایا اور آئینے کو دھندلا نہیں ہونے دیا۔ وہاں شاعر خواتین کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور ان کے الفاظ اور لہجے دونوں میں دلپذیر انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً" حمیرا رحمان، صبیحہ صبا، نیر جہاں، نسیم سید وغیرہ۔

امریکہ اور کینیڈا میں رہنے والے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے نام غیر معروف

بھی نہیں ہیں اور اہم بھی ہیں۔ اردو دنیا ان سے واقف ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ سیم و زر کی بولی سمجھنے والے شہروں میں یہ ادیب اور شاعر اپنی خاک نشیں اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

۶۸ء میں ٹورانٹو سے حفظ الکبیر قریشی اور عبدالقوی ضیا ایک رسالہ "صہبا" نکالتے تھے۔ مضامین نظم و نثر منتخب کر لیے جاتے اور ان کے عکس جوڑ کر یہ رسالہ تیار ہوتا۔ اس کے ایک دو شمارے اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ان دونوں کے پتے مجھے صہبا بھائی نے دیے تھے۔ صہبا بھائی نے اپنی ان تھک محنت اور لگن سے "افکار" کو جس مقام تک پہنچایا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ رسالہ "صہبا" تو بند ہو گیا لیکن شاید یہ اسی ہم نامی کی برکت ہے کہ اب امریکہ اور کینیڈا سے کئی رسالے باقاعدگی سے جاری ہیں۔ مثلاً "اردو انٹرنیشنل' اور اردو کینیڈا جو اشفاق حسین اور شاہین غازی پوری کے زیر ادارت شائع ہوتے ہیں۔

اب تو شعراء کے مجموعہ کلام بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے جو امریکہ سے شائع ہونے والا حمد و نعت کا پہلا مجموعہ ہے۔

مشاعروں میں کم ہی شریک ہوتی ہوں۔ لیکن جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہی ہوں وہ زمانہ اور تھا۔ وہ مشاعرہ بھی اور تھا۔ شاید امریکہ میں پہلا مشاعرہ بھی وہی تھا۔

ہوا یہ کہ میں واشنگٹن پہنچی تو وہاں رہنے والے اردو داں طبقے کو بھولے بسرے مشاعرے یاد آ گئے اور اچانک ہی فیصلہ کر لیا گیا کہ ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جائے۔ اسی زمانے میں میرا دوسرا شعری مجموعہ "شہر درد" طویل مدت کی خاموشی کے بعد شائع ہوا تھا اور اسے آدم جی ایوارڈ ملا تھا۔ شہر میں کوئی دوسرا مقامی یا مہمان شاعر موجود نہیں تھا لیکن وسیم مینائی نے جو ان دنوں وائس آف امریکہ سے منسلک تھے اعلان کیا کہ مشاعرہ ہو گا اور ضرور ہو گا۔ اور ہم جس شاعر کی شرکت چاہیں گے وہ اس میں شریک بھی ہو گا۔ تاریخ طے کر دی گئی۔

ایک بڑے ہال میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ سامعین میں پاکستانی تھے' ہندوستانی تھے اور کچھ لوگ اپنے امریکن دوستوں کو بھی لے آئے تھے۔ جن کی وجہ سے شعراء کا تفصیلی تعارف اردو انگریزی دونوں زبانوں میں کروایا گیا۔ اشعار کا ترجمہ بھی ہوتا رہا۔

شعراء میں میر تھے غالب تھے مصحفی اور آتش تھے۔ ان کے علاوہ فیض' ندیم قاسمی' جمیل الدین عالی' سردار جعفری' مجروح سلطان پوری' کیفی اعظمی وغیرہ۔ منتظمین نے جس کو چاہا مدعو کر لیا تھا۔

ڈائس پر تمام شعراء اپنے اپنے مقام پر موجود تھے اور ایک میں تھی۔ کوشش یہ کی گئی تھی کہ جس حد تک ممکن ہو سکے ہر شاعر کے مخصوص انداز میں اس کا کلام سنایا جائے۔ لباس کا دھیان بھی رکھا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب لیکن بہت خوبصورت مشاعرہ تھا۔ اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے دیس کی یاد کو پردیس میں بسنے والوں کا خراجِ محبت۔

کچھ عرصے بعد ہمارے رشتہ دار زہرا اور منصور عالم بھی واشنگٹن پہنچ گئے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی اور یہ منصور عالم کی فارن سروس میں پہلی پوسٹنگ تھی۔ کنکورڈیا کے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔ فارغ اوقات میں روزانہ ہی ان سے ملاقات رہتی۔ انہوں نے موٹر خرید لی تھی جس کی آسانیاں ہمیں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ ان خوش آثار دنوں میں ایک واقعہ ایسا بھی ہوا جو اس وقت کسی سانحے سے کم نہیں تھا۔

ہوا یہ کہ اپنے کورس کے سلسلے میں نور کو پندرہ دن کے لیے کولمبیا لے جایا گیا۔ جنوبی امریکہ میں یہ پروگرام صرف مندوبین کے لیے تھا۔ خواتین کے لیے اپارٹمنٹ تو موجود ہی تھے کسی کو کوئی دِقت نہیں ہوئی۔ لیکن زہرا بڑے اصرار سے مجھے اتنے دنوں کے لیے اپنے گھر لے گئیں۔

جس دن نور کی واپسی تھی میں نے اسی شام منصور اور زہرا کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام طے کیا۔ اور فلم کا انتخاب بھی خود کیا۔ اس انتخاب کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ فلم امریکہ میں کئی سال نمائش کے لیے ممنوع رہی تھی۔ امتناعی حکم انہیں دِنوں منسوخ ہوا

تھا۔ مجھے علم تھا کہ مغربی معاشرے میں افراد کو قول و فعل کی آزادی حاصل ہے۔ کسی جملے سے مملکت پر آنچ نہیں آجاتی اور وہاں ہر شخص اپنے چال چلن کا ذمے دار بھی خود ہوتا ہے۔ محتسب کا دستور ہی نہیں، میں جرائم کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ یہ فلم جو اس ملک میں پہلے ممنوع رہ چکی تھی۔ خود دیکھنے اور زہرا منصور کو اپنے ساتھ لے جاکر دکھانے میں مجھے کوئی اندیشہ محسوس نہیں ہوا۔ سوچا کہ اس ممانعت کا سبب صرف عالمی سیاست کا کوئی پہلو ہی ہو سکتا ہے۔

میں نے بڑے خلوص سے ان دونوں کو دعوت دی ٹکٹ بھی نور کے آنے سے پہلے خرید لیے گئے کیونکہ اس فلم کے لیے رش بہت زیادہ تھا۔

نور آگئے تو ہم چاروں فلم دیکھنے گئے۔ سامنے کی سیٹ پر بیگم عثمان علی اپنی غیر شادی شدہ بیٹی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ عثمان علی بعد میں پاکستان کے گورنر اسٹیٹ بینک کے عہدے پر فائز ہوئے اور جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ان سے استعفیٰ لیا گیا۔

فلم شروع ہوئی۔ یہ تو یاد نہیں کہ کیا دیکھا۔ اتنا یاد ہے کہ پہلے پلّو سے سر ڈھانپا پھر ساری کے پورے آنچل میں چھپنا چاہا پھر مختصر سے سینما ہال کی دیواروں پر نظر جمانے کی کوشش کی۔ پتہ نہیں کتنی دیر ہم وہاں بیٹھے۔ کتنی دیر کے بعد نور سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ہم تینوں جیسے کسی ڈوری سے بندھے ہوئے ہوں۔ مڑے اور چپ چاپ دروازے سے باہر نکل آئے۔

راستہ بھی قطعی خاموشی سے کٹا۔ گھر پہنچے اور اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد زہرا کی آواز آئی۔ "کھانا تیار ہے۔"

نظریں چُراتے ہوئے جاکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہم چاروں اپنی اپنی پلیٹ پر سر جھکائے کھانا کھانے کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ اچانک زہرا نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ماحول کا کھنچاؤ کم ہوا مگر پھر بھی ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

زہرا ابھی تک جب بھی ملتی ہیں بڑی معصومیت سے پوچھتی ہیں۔

"بھابھی آئندہ آپ ہمیں فلم کب دکھائیں گی؟"

مگر ایک شاخِ نہالِ غم

دستور یہ تھا کہ ہر اتوار کی شام ای ڈی آئی پروگرام کے تمام مندوب کنکورڈیا کے بڑے ہال میں ملاقات اور مشروب و فواکہات کے لیے مدعو کیے جاتے۔ سنیچر کو عموماً ہماری میزبان سب کو واشنگٹن اور گرد و نواح کے قابلِ دید مقامات کی سیر کے لیے لے جاتی۔ خواتین ہر پروگرام میں شریک ہوتی تھیں لیکن اس کے علاوہ بدھ کا دن صرف ہم سب مہمان خواتین کے لیے مخصوص ہوتا۔ کبھی کبھی کھانا پکانے کا پروگرام بھی ہوتا۔ لیکن عموماً وہ ہمیں صبح دس بجے ایک بس میں لے کر روانہ ہوتی۔ منزل کا تعین کبھی ہم میں سے کسی کی فرمائش کے مطابق ہوتا کبھی وہ خود ہی کوئی خوبصورت علاقہ یا کوئی غیر معمولی مقام دکھانے لے جاتی۔

اس دن مس گواسکر نے خود فیصلہ کیا تھا۔ وہ ہمیں عمر رسیدہ لوگوں کا مسکن (اولڈ پیپلز ہوم) دکھانے لے گئی۔ ۶۸ء میں یہ نظارہ ہمارے لیے واقعی غیر معمولی تھا۔ حیرت انگیز بھی اور عبرت ناک بھی۔ کہ آخر یہ بوڑھے لوگ کسی کے ماں باپ بھی تھے۔ زندگی کے میلے میں پورے تام جھام کے ساتھ ہی شریک ہوئے ہوں گے۔ اب انہیں ایک گروہ میں شامل اور اپنے اپنے دل کے مقدر کی تنہائیوں میں کھویا ہوا دیکھ کر تمام قریبی انسانی رشتے ذہن میں چبھنے لگے۔ ہمارے گھر تو کبھی ہمارے بزرگوں کے لیے اتنے چھوٹے نہیں پڑے تھے۔

اس زمانے میں اور اس وقت کہاں یہ دھیان میں آسکتا تھا کہ صرف بیس پچیس سال کے بعد ہی پاکستان میں بھی ایسے گھر وجود میں آجائیں گے۔ اور اپنوں کی بے حسی انہیں آباد بھی رکھے گی۔ خال خال ہی سہی۔ (ابھی ہم باقاعدہ ترقی یافتہ کہلانے کے قابل بھی

کہاں ہو سکے ہیں!)

یہ جن دنوں کا قصّہ ہے اس وقت ہم نئی دنیا اور نئی دنیا کے تقاضوں سے پہلے پہل متعارف ہو رہے تھے۔ یا شاید وہاں میں ہی تھی جسے ماں باپ، دادی دادا اور نانی نانا کے رشتوں اور جذبوں کی بے حرمتی بڑی بے رحم عریانی کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ اور کہیں سے وہ ننھے ننھے بچے بھی تصوّر میں آ گئے تھے جو راتوں کو لحاف میں گھس کر نئی نئی کہانیاں سننے کی فرمائش کر رہے تھے۔

بہرحال وہ ۶۸ تھا اور ہم ایک مکان دیکھنے گئے تھے جسے گھر کا نام دیا گیا تھا۔

نواح شہر میں یہ ایک خاموش اور پر سکون علاقہ تھا۔ عمارت امریکن لحاظ سے کشادہ تھی۔ سامنے سرسبز و شاداب سبزہ زار تھا۔ ہرے بھرے درخت تھے۔

مس گواسکر نے شاید ہمارے داخلے کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سیاحوں کے لیے انسانوں کے اس "عجائب گھر" کا معائنہ معمول کے مطابق ایک عام سی اور روز روز کی بات ہو جس کے لیے کسی پیشگی اطلاع یا اجازت نامے کی ضرورت ہی نہ ہو۔

اندر داخل ہوئے تو اس مکان کا ماحول نہایت صاف ستھرا اور روشن تھا۔ مکین بھی دھلے دُھلائے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ خواتین نے میک اپ کیا ہوا تھا۔ یہ مکان ہوسٹل کے طرز پر تعمیر کیا گیا تھا۔ متعدد چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کا مناسب سامان موجود تھا۔ ایک بڑا ہال تھا جس میں ٹی وی تھا اور ٹیلی فون بھی۔ وہ جو یہاں پہنچا دیے گئے انہیں بہلانے کے لیے مشاغل کا انتظام بھی تھا۔ پنگ پانگ، کیرم بورڈ، اسکریبل (حروف سے الفاظ ترتیب دینے کا کھیل) وغیرہ۔ یہاں وقت اور حقیقت دونوں کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اب یہ ماضی کے انسان تھے اور انہیں ان نقلی کھلونوں اور کھیلوں کے سہارے آتی جاتی سانس کا بوجھ ڈھونا تھا۔ اور دھیرے دھیرے سامنے آنے والے انجام کا انتظار بھی ان کا مقدر بن چکا تھا۔

پیچھے انہوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا۔ یقین کے وہ گھروندے جو بیتے دنوں کے لمبے لمبے

نے بنائے تھے۔ وہ ارادے جن تک دسترس تھی۔ وہ مرادیں جو ابھی تک پلک جھپک رہی تھیں اور وہ دعائیں جو قبول ہوئی تھیں اور ساتھ ہی اپنی آن بھی اور اپنا مان بھی۔ شاید وہ سب یادیں بھی کسی دن ان کا ساتھ چھوڑ جائیں۔ اب تمام راستے سمٹ چکے تھے اور نقوش پامٹ رہے تھے۔ وہ کون تھے جو انہیں ایک اذیت ناک اور بے خواب انتظار کے حوالے کر کے اپنی اپنی زندگی کی طرف واپس جا چکے تھے۔ وہ غیر تو نہیں تھے۔ وہ تو عمر بھر کے خوابوں کی تعبیروں کی طرح تھے۔

یہ سن رسیدہ لوگ ذہنی طور پر ناکارہ نہیں تھے اور کسی قسم کی جسمانی معذوری سے بھی بڑی حد تک محفوظ تھے۔ یقیناً" ان سب کو بخوبی علم تھا کہ اب اس گھر سے ان کی رہائی کا پروانہ صرف موت کے ہاتھ میں تھا۔

رہائش اور ضرورت ہو تو علاج کے بھی اخراجات ان سب بوڑھوں کے متعلقین برداشت کرتے تھے۔ اور یہاں کسی کے ساتھ کسی قسم کی لاپرواہی یا امتیاز کا برتاؤ نہیں تھا۔ ان لوگوں کی صحت اور غذا کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ بے شک اس سلسلے میں کسی کوتاہی کا احساس نہیں ہوا۔

مس گواسکر ہمیں اپنے معاشرے کے حسنِ انتظام اور اخلاقی اقدار کی جھلکیاں دکھانے لے گئی تھیں۔ عمر رسیدہ لوگوں کی خبر گیری کا فریضہ اپنے نہ سہی غیر تو انجام دے رہے تھے۔ تجارتی بنیاد پر ہی سہی۔

یہاں جو خواتین اور مرد تھے آپس میں ان کے درمیان ہمیں کوئی کشمکش نظر نہیں آئی مگر ان سب کی آنکھوں میں کتنے دشت و صحرا لکھے ہوئے تھے۔

منتظمین میں سے ایک خاتون ہمیں مختلف کمروں میں لے گئی۔ لوگ مشغول نظر آئے۔ کوئی ٹی وی دیکھ رہا تھا کسی کے سامنے کیرم بورڈ تھا یا کوئی اور کھیل۔ آپس میں ایک مصنوعی ہم آہنگی بھی تھی۔ ایک جگہ چند خواتین محو گفتگو تھیں اور جوڑوں کے درد کے بارے میں اپنے اپنے تجربات اور دواؤں کی تفصیل بیان کر رہی تھیں۔ اور وہیں وہ لوگ بھی نظر آئے جن کا اس مسکن اور اس ماحول سے سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا۔

ہم رُکتے ٹھہرتے ہوئے اس آباد اور اداس گھر کے آباد اور سنسان کمرے دیکھتے رہے۔ ہماری موجودگی پر اس مکان کے کسی مکین نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے ہمارا وجود کسی آر پار نظر آنے والی شے کی طرح ہو۔ یا وہ اپنے ہی حال احوال کی چار دیواری میں ہر قسم کی نگاہوں کی زد سے محفوظ ہو چکے تھے۔

ایک کمرے میں ایک شخص بظاہر مطالعے میں مصروف تھا۔ مگر گھڑی گھڑی کتاب سے نظریں ہٹا کر کبھی چھت اور کبھی کسی دیوار کو پڑھنے لگتا۔ کتاب شاید عادتاً ہی سامنے کھلی ہوئی تھی۔ ہماری موجودگی کا اسے قطعی علم یا احساس نہیں ہوا۔ ایک اور کمرے میں ایک شخص کھڑکی کی طرف کرسی کا رُخ کیے ہوئے بیٹھا تھا اور شیشے کے پار عمارت کے بیرونی پھاٹک کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جس کے دونوں پٹ بند تھے۔ کسی کسی کو بالکل گم صم الگ تھلگ بیٹھا دیکھا۔ ان کی خالی خالی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اب ان کے پاس کسی انتظار کا جگنو بھی نہیں رہ گیا تھا۔

سامنے کمرے میں ایک عورت ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیرے لگا رہی تھی۔ اور زیر لب کچھ ناقابلِ فہم الفاظ بھی ادا کر رہی تھی۔ ہماری رہنما نے آگاہ کیا کہ یہ بے تکان باتیں کرتی ہے۔ اس مکان میں رہنے والے اس بوڑھی عورت کی داستان غم سنتے سنتے اکتا چکے تھے اور اب اس سے کتراتے تھے اس وقت بھی وہ تنہائی گزیدہ عورت تنہا تھی۔ اور پھر ہمارے گروہ میں سے چند خواتین اس کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ چونکی اور لپک کر پہلی ہی خاتون کا ہاتھ اس نے اپنے استخوانی ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔

اس نے کہا "کیا یہ اس پر ظلم نہیں ہے کہ پچھلے پچیس سال سے اسے اس گھر میں مقید رکھا گیا ہے۔ اس کے بچوں تک کو یہاں اس سے ملاقات کی اجازت نہیں ہے۔ وہ ایک خوبصورت اور بے حد محبت کرنے والی بیٹی اور ایک قابل 'لائق' فرماں بردار بیٹے کی ماں ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنی اولاد کے بچپن کی شرارتوں اور عادتوں کی داستان اور اپنے گھر اور رہن سہن کے بارے میں تمام تفصیلات بیان کیں۔ وہ خوشیاں جو اسے

حاصل تھیں۔ وہ رنگ جو اس کے شب و روز میں گھلے ہوئے تھے۔

اپنی کامیاب اور آسودہ حال زندگی کی کہانی سناتے سناتے وہ افسردہ ہو گئی۔ کہ کس طرح اس کا شوہر چار سال کی لڑکی اور دو سال کے لڑکے کو اس کے پاس چھوڑ کر ایک دن اچانک اس کی زندگی سے غائب ہو گیا تھا۔

اپنے بچوں کی خاطر اس نے کتنی مصیبتیں جھیلیں۔ دکانوں، گوداموں میں ملازمت کی۔ ہوٹلوں میں صفائی کا کام کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیے مگر اپنے بچوں تک کوئی آنچ نہیں آنے دی۔

وہ مسلسل گفتگو کر رہی تھی۔ اچانک پھر اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ کہنے لگی اس کے بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اب وہ شادی شدہ اور ننھے منے بچوں کے ماں باپ تھے۔ اچھا کما رہے تھے اور آسودہ حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ اپنی داستان حیات سناتی رہی۔ اس کی باتوں میں تسلسل تھا۔

اس عورت کو ادارے میں داخل ہوئے تقریباً" پانچ سال ہوئے تھے۔ اس نے اس مدت کو پچیس سال کہہ کر یقیناً دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا۔ اپنے بچوں سے دور اور مجبور رہ کر جذباتی طور پر تو اس نے پچیس برس ہی گزارے ہوں گے۔ اس پوری کہانی میں کتنا سچ تھا اور کتنا مبالغہ۔ بہرحال یہ تو حقیقت تھی کہ اس نے اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم کا پورا خیال رکھا تھا۔ وہ ماں تھی اور اب اس کے دونوں بچوں کے گھروں میں اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ مگر اس کی آس اور یقین نے ابھی تک دم نہیں توڑا تھا۔

ادارے کی منتظم خاتون نے ہمیں بتایا کہ اس بوڑھی عورت کے بچے اسے یہاں داخل کرنے کے بعد سے آج تک پلٹ کر نہیں آئے۔ نہ کوئی خط لکھا نہ اپنے نئے پتے سے اس ادارے کو آگاہ کیا۔ البتہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے اس عورت کے اخراجات کی تمام رقم بلکہ طے شدہ رقم سے کچھ زیادہ ہی انہیں پیشگی وصول ہو جاتی تھی۔ کیا سفید بالوں اور ڈوبتے چہروں کی چاندنی اتنی ہی ارزاں ہوتی ہے؟

اس گھر میں ہم نے وہ بھی دیکھا جو ہماری امریکن میزبان نے ہمیں دکھانا چاہا تھا۔ اور

وہ بھی جسے دیکھنے سے وہ خود معذور تھی۔

واپس گاڑی میں بیٹھی تو انسان کی ترقی کے معمے کو حل کرتے کرتے ذہن اپنے دیس کے ایک چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے آنگن تک جا پہنچا۔ جس کی کشادگی اور وسعت صرف طہارت قلب سے ہی وجود میں آسکتی تھی۔

برسوں پہلے کا سنا ہوا ایک قصہ یاد آگیا۔ اس زمانے تک ہمارے وطن میں سیاسی زبان رائج نہیں ہوئی تھی اس لیے راوی سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ جن محترمہ کا وہ ذکر کررہی تھیں وہ مہاجر تھیں یا پنجابی۔ روایتی مشرقی ماحول میں یہ واقعہ غیر معمولی تھا۔ اس لیے شہر کے ان لوگوں تک بھی اس کا چرچا پہنچ گیا جن کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

آنکھوں دیکھی نہیں' کانوں سنی بات ہے۔ اندرون شہر ایک سفید پوش گھرانا آباد تھا۔ مختصر سا کنبہ۔ میاں بیوی اور دو لڑکے۔ میاں کسی دفتر میں کلرک تھے۔ تگی بندھی تنخواہ اور اس کے علاوہ کچھ زمین قریب کے گاؤں میں تھی جس سے ہاتھ میں پیسہ تو نہیں آتا البتہ فصل کے فصل بٹائی پر اناج گھر آجاتا تھا۔ آرام سے گزر بسر ہو جاتی۔ دونوں لڑکے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بیوی نیک دل ہمدرد عورت تھیں۔ مقدور بھر سب کے کام آتیں۔ شادی' خوشی' دکھ درد میں اپنوں کی طرح شریک ہوتیں۔ کسی کا بچہ بیمار ہو تو جڑی بوٹیوں سے علاج بھی کرلیتیں۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہوتیں تو پاس پڑوس کی لڑکیوں کو اکٹھا کرکے کلام پاک کا درس دیتیں۔ کسی پر کوئی مشکل وقت آجاتا تو دعا کے لیے بھی عورتیں ان کے پاس آتیں۔ سیدانی بی کہی جاتیں۔ محلے بھر میں ساکھ تھی۔ عزت تھی۔

لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا اور گھر کے حالات ابتر ہو گئے تو ہر صبح جب دونوں لڑکے تلاش معاش اور اسکول کے لیے گھر سے نکلتے تو بڑے بیٹے کے ہاتھ میں تالا کنجی دیتیں کہ جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا کر جائے۔ شام کو لڑکوں کی واپسی کے بعد ہی تالا کھلتا۔ یہ اپنی ناداریوں کی پردہ داری تھی۔ بڑے لڑکے کے کام پر

لگنے تک کئی ماہ کا عرصہ انہوں نے اسی طرح کاٹا۔ لڑکا ملازم ہوا' حالات درست ہونے لگے تو وہ بھی اپنے پرانے معمولات پر آگئیں۔ اس کی شادی انہوں نے ایک بیوہ کی لڑکی سے کردی جو لوگوں کے کپڑے سی کراپنی دو لڑکیوں کو پال رہی تھی۔

دو چار سال چین سے گزر گئے تو ایک بار پھر آفت ناگہانی نے ان کا گھر دیکھ لیا۔ بڑا بیٹا جو اب دو بچوں کا باپ تھا دفتر جانے کے لیے صبح گھر سے نکلا اور شام سے پہلے اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش گھر آگئی۔

دیکھنے والی نے جب سیدانی کو دیکھا تو بیٹے کے غم نے ان کے بال بالکل سفید کردیے تھے۔ ماںتا کی تڑپ اور نوجوان بہو کی بیوگی کے غم سے نڈھال وہ خود اپنا سایہ بن کر رہ گئی تھیں۔ مگر اس بوڑھی عورت کا یہ امتحان بھی آخری نہیں تھا۔

خوبصورت جوان بہو عدت کے دن پورے ہوتے ہی ایک صبح گھر سے غائب ہو گئی۔ بچے موجود تھے۔ بڑی بی کو چپ لگ گئی۔ سر جھک گیا۔ خبر تو پورے محلّے میں پھیلی لیکن ایک پرہیزگار اور رحم دل شخصیت کی آبرو کی بات تھی۔ ان کے پاس جو کوئی پڑوسن بھی آئی اُس نے اس بارے میں چُپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنے بڑے سانحے کو جان بُوجھ کر اور سوچ سمجھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی۔

بہو کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ بہو کی بے آسرا بہن کا نکاح اپنے چھوٹے لڑکے سے پڑھوا کر اسے بھی اپنے گھر لے آئی تھیں۔ بچے پہلے ہی خالہ سے مانوس تھے۔ اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے۔ ان کی طرف سے کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ بیس پچیس دن گزر گئے۔ ایک دن فجر کے وقت سیدانی کو دروازے پر کچھ آہٹ سی سنائی دی دستک کی آواز تو نہیں تھی لیکن انہوں نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر جھانکا تو وہ چادر میں لپٹی سر جھکائے کھڑی تھی' آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر اور دروازہ کھلا چھوڑ کر خود پیچھے ہٹ گئیں۔ وہ اب بھی دروازے کے باہر چپ چاپ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ سیدانی بھی خاموش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں تو اب کوئی آنسو بھی باقی نہیں رہا تھا۔ گلی میں آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ آخر رہا نہ گیا۔ بولیں۔

"اب کیا سوچ رہی ہے۔ اندر آجا۔"

اس کی واپسی کی خبر جب محلے میں پہنچی تو لوگوں کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ رسم و رواج کے پابند اور روایت پسند ماحول میں ایک نیک نام اور جہاں دیدہ عورت سے کسی کو اس فیصلے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سیدانی بی کی بیٹی بھی نہیں تھی۔ کوکھ کی آنچ کو شاید ان کی مجبوری سمجھ لیا جاتا۔ اب تو وہ ایک بھٹکی ہوئی بے راہرو عورت تھی جس کا گناہ درگزر کے قابل ہرگز نہیں تھا۔ اس شریف گھرانے بلکہ پورے محلّے میں اس کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ اب وہاں اس کے لیے کوئی ٹھکانا کوئی گنجایش نہیں تھی۔

اعتراض' اختلاف اور پھر شدید رنج و الم کی تکرار بھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے لوگوں کی زبان سے کیا کچھ نہیں سنا۔ اور چپ چاپ سنتی رہیں۔

جب شکایات اور سوالات کا سلسلہ اختتام کو پہنچا تو سیدانی بی نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا۔ اور اس وقت ان کا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔ کہنے لگیں "مجھے احساس بھی ہے اور علم بھی کہ اس لڑکی نے سماج اور مذہب دونوں کے حکم کے خلاف بہت بڑی غلطی کی ہے۔ گناہ کیا ہے۔ معافی تو صرف میرے مولا کے اختیار میں ہے۔ لیکن اب جب پشیمان ہو کر واپس آگئی ہے تو اس کے سر پہ ہاتھ رکھنے والا اس بھری دنیا میں اور کون ہے۔ جو میں بھی دھتکار دوں تو یہ کہاں جائے گی؟ اسے اپنائے گا کون؟ کس گھر کا دروازہ اس کے لیے کھلے گا؟ جوان ہے' خوبصورت ہے۔ کسی کوٹھے کسی چوبارے پر ہی بٹھادی جائے گی۔"

یہ وہ خاتون تھی جس نے غربت اور افلاس کے زمانے میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنے گھر کے اندر مقفل رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اور اب ایک پشیماں' بے آسرا اور اُجڑی ہوئی جوان عورت کو پناہ دینے کے لیے محلے والوں کے سامنے اپنی ذاتی ساکھ اور عزت کو ثانوی حیثیت دے رہی تھی۔ جان پہچان والوں میں برسوں کی کمائی ہوئی اپنی آبرو کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اور اس پر کوئی پشیمانی بھی نہیں تھی۔

اس شام دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ کی ایک کشادہ صاف ستھری سڑک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے گھر میں رہنے

والی عام سی عورت کی وسعت قلب کا کبھی کا سنا ہوا اور بھولا ہوا یہ قصہ پوری تفصیل سے یاد آگیا۔

ابھی ابھی میں عمر رسیدہ لوگوں کی رہائش گاہ (اولڈ پیپلز ہوم) دیکھ کر آئی تھی۔ ان مکانوں میں یقیناً" ایسے تنہائی پسند' سن رسیدہ اشخاص بھی رہائش پذیر ہوں گے جن کا یہ اپنا انتخاب ہو گا۔ مگر مجموعی طور پر مجھے شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ یہ بوڑھے ماں باپ اپنی اولاد کے لیے اتنا بھاری بوجھ کیسے بن گئے جسے برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اپنوں سے جدائی کے بعد ان بجھتی ہوئی آنکھوں کو اب کیا نظر آتا ہو گا۔ واپسی کا راستہ تو بند ہو چکا۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال یہ کس انتظار میں کاٹیں گے۔

نقش قدم یہاں وہاں

۶۸ء میں نور کے ساتھ پہلی بار امریکہ جانے سے قبل بھی میں ایک مرتبہ بیرونِ ملک گئی تھی۔ اور اکیلی۔ یہ سفر نور کی طرف سے میرے لیے ایک خاص سوغات کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت عامر کی عمر صرف ڈیڑھ سال تھی لیکن اطمینان تھا کہ نور خود بچوں کے پاس تھے اور لاہور سے بچوں کی دادی بھی اس عرصے کے لیے ہمارے گھر آگئی تھیں۔ نور کا ملک سے باہر جانا سرکاری امور کے سلسلے میں اکثر ہوتا رہتا تھا۔ جب سعید بھائی کا تقرر لندن میں اکنامک منسٹر کی حیثیت سے ہوا تو اس سہولت کو دیکھتے ہوئے نور نے میرے سیرو تماشا کے شوق کی پذیرائی کا فیصلہ کر لیا۔

نور کے بھائی شمع الحسن جعفری جو اپنی تعلیم کے سلسلے میں سعید بھائی کے ساتھ رہتے تھے مجھے لندن ساتھ لے جانے کے لیے خاص طور پر ایمسٹرڈم بلائے گئے تھے۔ کیونکہ وہاں جہاز تبدیل کرنا تھا۔ اور میں اپنے شوق فراواں کے باوجود تنہا سفر کرنے کی وجہ سے گھبرائی ہوئی تھی۔

نور کے ایک نہایت مخلص دوست ضمیر احمد سید بھی اپنی بیگم رشیدہ اور ان کی بہن کے ساتھ یورپ کی سیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ نور نے انہیں بھی میرے ایمسٹرڈم پہنچنے کی تاریخ اور وقت سے آگاہ کر دیا تاکہ اگر کسی وجہ سے شمو وہاں نہ پہنچ سکیں تو وہ میری مدد کریں۔ ہوا یہ کہ ضمیر بھائی بھی ایمسٹرڈم پہنچ گئے اور شمو بھی۔ ضمیر بھائی نے لندن روانگی سے پہلے' دو دن ہیمبرگ اور دو دن پیرس میں قیام کی ترغیب دی اور میں اور شمو فوراً" ہی آمادہ ہو گئے۔ اس زمانے میں منشیات کی وبا اتنی عام نہیں ہوئی تھی اس لیے چند دن کے قیام کا ویزا ایئرپورٹ پر بھی آسانی سے مل جاتا تھا۔

رشیدہ بہن اور ضمیر بھائی کے ساتھ یہ بڑا یادگار سفر تھا۔ ہیمبرگ میں میں نے پہلی بار بیلے ڈانس دیکھا۔ شہر بہت خوبصورت ہے اور خصوصاً" مردوں کے لیے جنت نظیر۔ وہاں راتیں دن سے زیادہ روشن اور بارونق تھیں۔ ایک شام ہم لوگ ایک کشادہ چمکتی دمکتی سڑک پر جا رہے تھے۔ تو ضمیر بھائی کو شرارت سوجھی۔ انہوں نے بڑی معصومیت سے شمو سے فرمائش کی کہ ساتھ کی گلی میں جا کر کسی ریستوراں کا پتہ معلوم کریں۔ شمو گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد گھبرائے' شرمائے اور تقریباً" دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے وہاں کیا دیکھا۔ پیرس کی شاہراہ شانزے لیزے اس لحاظ سے خاصی قابلِ اعتبار نظر آئی۔ کم از کم آس پاس ایسی کوئی گلی نہیں تھی جہاں جاتے قدم رکیں۔

ان لوگوں کے ساتھ پیرس میں ہم نے ایک بہت اچھا اسٹیج شو بھی دیکھا جہاں جاتے میں خاصی جھجک رہی تھی۔ لوو کی مشہور زمانہ نمائش گاہ اور اس نمائش گاہ میں مونالیزا بھی میں نے پہلی بار انہیں کے ساتھ دیکھی۔ رشیدہ بہن اور ضمیر سیّد سے ہماری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی جہاں ان کا مستقل قیام ہے۔ سلجھی ہوئی طبیعت کے باذوق لوگ ہیں۔ محبت کے جو رشتے ان سے اس وقت تھے وہ اب بھی ہیں۔

لندن میں آپا کے پاس میں بیس دن رہی۔ اس عرصے میں اس شہر کو اوپری اوپری سا دیکھ سکی گیلی سڑکیں کائی لگی عمارتیں' ایک دو چمک دمک والے شاپنگ سینٹر' شہر سے رسمی سا تعارف اور بس۔ اتنا یاد ہے کہ میں وہیں تھی جب امریکہ کے صدر کینیڈی کے قتل کی اطلاع ملی۔ رات بھر ہم لوگ ٹی وی دیکھتے رہے۔ صبح پاکستان کے لیے میری روانگی تھی۔

۶۹ء میں امریکہ سے وطن واپس آتے ہوئے ہم نے یورپ کے سفر کا پروگرام اس طرح ترتیب دیا تھا کہ لندن پہنچنے کے دوسرے ہی دن پاکستان سے صبیحہ' عزمی اور عامر ہمارے پاس پہنچ گئے۔ بچوں کے ساتھ ہمارا لندن اور یورپ کا سفر اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا احسان تھا اور ہے۔ ان دنوں کا تمام حُسن آج بھی ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

امریکہ کے بعد لندن میں رہنے کا تجربہ خاصا دلچسپ تھا۔ ہمارا قیام ایک دوست کے گھر میں تھا۔ رات کو اچھے بھلے گرم کمرے میں سوئے اور آدھی رات کو زمستان میں

جاگے۔ سردی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ جُوں توں رات کاٹی۔ صبح باتوں باتوں میں میزبان سے معلوم کیا تو حقیقت واضح ہوئی۔ اس وقت تک لندن میں سینٹرل ہیٹنگ کی سہولت عام نہیں تھی۔ یا شاید اس کا دستور ہی نہیں تھا۔ گھروں کو گرم رکھنے کے لیے گیس کے چُولھے استعمال ہوتے تھے جنہیں چالو رکھنے کے لیے مشین میں شلنگ کے سکّے ڈالے جاتے تھے۔ اس کے بعد ہر شام عزمی تہہ خانے میں جاکر اس مشین کی طلب پوری کردیتے۔

انگلینڈ اور امریکہ میں بہت سی چیزوں' بہت سی باتوں میں فرق کے علاوہ ہمیں انگریز اور امریکن قوم کے مزاج اور رویّے کا اختلاف یا تضاد بھی نمایاں نظر آیا۔ جس کے لیے کسی خاص مطالعے کی ضرورت نہیں تھی۔ انگریز اپنی تاریخ اور معاشرے پر نازاں کسی اجنبی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ امریکن اپنی خوش حالی اور حصولِ کامرانی پر شاداں' راہ چلتے ہر شخص سے مخاطب ہو کر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہاں کسی تعارف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہاں پہلے متعارف ہونا ضروری تھا جس کی ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔

بچّوں کے ساتھ ہم نے لندن میں بہت اچھا وقت گزارا۔ عامر اس وقت تقریباً" چھ سال کے تھے۔ ان کے ہاتھوں ہم اکثر کسی نہ کسی آزمائش سے دوچار رہتے۔ ہمیں کہیں پہنچنے کی جلدی ہے اور وہ رُواں زینے (ایکسیلیٹر) پر بار بار اوپر جاکر نیچے آنے پر بضد ہیں۔ اور پھر ہر روز ہی ٹریفالگر اسکوائر کبوتروں کو دانہ کھلانے کے لیے جانا ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر ان کی گرفت میں کبھی عزمی اور کبھی نور آجاتے۔ بہرطور ہمارے ہر پروگرام میں تاخیر یقینی تھی۔ ہم لوگ آرٹ گیلریز دیکھنے جاتے تو بہت خفا ہوتے کہ جیتے جاگتے کبوتروں کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر جانا کیا ضروری ہے۔ تصویریں ہی دیکھنا ہیں تو یہ جو کتابوں میں بہت سی تصویریں موجود ہوتی ہیں انہیں ہی کیوں نہ دیکھ لیا جائے۔ عجائب گھر میں اسٹیچو دیکھتے تو اعتراض ہوتا کہ انہیں کپڑے کیوں نہیں پہنائے گئے ہیں۔ کہنا پڑا کہ اس زمانے میں کپڑا ہوتا ہی نہیں تھا۔ اس صورت حال سے روم میں زیادہ واسطہ پڑا۔

غرض عامر خود ہمارے رویوں سے بہت غیر مطمئن لیکن ہمارے لیے نہایت دلچسپ ہم سفر ثابت ہو رہے تھے۔

عامر کی وجہ سے ہم لوگ کوئی شو یا اسٹیج ڈرامہ دیکھنے باری باری جاتے تھے۔ ایک شام نور اور صبیحہ' دوسری شام میں اور عزمی۔ مگر یہ ساری خوبصورت پابندیاں اور یہ سب ننھی منی فرمائشیں کتنی دل آویز ہوتی ہیں۔ کتنی راحت افزا۔

اس سفر میں میں نے لندن کے تمام مشہور مقامات نور اور اپنے بچوں کے ساتھ دیکھے۔

ہر صبح کسی ایک مقام کا تعین کر لیا جاتا تھا۔ ٹیٹ گیلری' کیو گارڈن وغیرہ۔ ہیمپٹن کورٹ بھی گئے جہاں خوشنما بھول بھلیاں تھیں۔ جو جھاڑیوں کی دیواروں سے بنائی گئی ہیں۔ یہ شاداب ہری بھری جھاڑیاں کئی سو سال پرانی ہیں۔

ویسٹ منسٹر ایبے کی طرف سے بھی گزرے۔ حد تو یہ ہے کہ بچوں کی فرمائش پر ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ بھی پہنچے۔ بچوں کا خیال تھا کہ بکنگھم پیلس جیسا شاندار نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ آن بان والا تو یہ مکان بھی ہو گا۔ آخر ہمیشہ وزیراعظم برطانیہ کی رہائش گاہ رہا ہے۔ مکان میں اندر جو کچھ بھی سازوسامان ہو' باہر سڑک سے تو ایک عام سے گھر کا دروازہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس مکان کو واقعی اپنے مکین ہی سے شرف حاصل رہا ہے۔ برطانیہ جانے والے سیاحوں کی روایت کے مطابق بچوں نے اس چھوٹے سے دروازے کے آگے چاق و چوبند کھڑے ہوئے گارڈ کے ساتھ تصویریں بھی کھنچوائیں۔

میڈم تساؤ کی غیر معمولی نمائش گاہ میں بچوں کو موم کے پتلوں سے باتیں کرتے اور جیتے جاگتے لوگوں پر موم کے مجسموں کا گمان کرنے کا تماشا بھی دیکھا۔ اس کام میں عامر اپنی پوری مہارت استعمال کر رہے تھے۔ چلتے چلتے جو بھی ٹھٹک کر کہیں کھڑا ہو جاتا فوراً" اس کا ہاتھ چھو کر اپنی تسلّی کر لیتے۔ ٹاور آف لندن میں شاہی نوادرات' تاج اور زیورات وغیرہ نمائش کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کا ہجوم تھا۔ وہاں سے ہم عقوبت گاہ دیکھنے چلے تو نور عامر کو اس ڈراؤنے ماحول سے دُور رکھنے کے لیے آئس کریم کھلانے لے گئے۔

برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کو محض چند گھنٹوں میں تو نہیں دیکھا جا سکتا تھا مگر ایک ہی بار وہاں جا سکے۔ انگریز اپنے دور حکومت میں برصغیر سے ہمارے علمی خزینے بھی لے گئے تھے۔ دوسری نادر کتب کے ساتھ وہاں قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی ہے جو اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

یہ میرے لندن کے اس سفر کی روداد ہے جو صرف گھومنے پھرنے کی خاطر کیا گیا تھا۔ لندن شہر جو مجھے کبھی پسند نہیں آیا ان دنوں خوبصورت ہو گیا تھا۔

اس سفر میں یورپ کے مختلف ممالک دیکھنے اور وہاں کچھ وقت بسر کرنے کا بھی موقع ملا تھا۔ اپنی ان یادوں کو بھی اُجالنا چاہتی ہوں۔ مگر تاریخ اور جغرافیہ دونوں سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی دلچسپی اور اپنے تاثرات کی حد تک۔ اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔

لندن سے ہماری اگلی منزل ایمسٹرڈم تھا۔ ایمسٹرڈم سطحِ سمندر سے نیچائی پر آباد ہے۔ دراصل سمندر کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ شہر میں نہریں بہت ہیں اور ایک آبی گزرگاہ شہر کے درمیان سے گزرتی ہے۔ جس میں خاص طور پر سجے ہوئے رنگین بجرے سیّاحوں کی سیرو تفریح کے لیے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ شہر کا بھرپور نظارہ ہم نے بھی ان بجروں میں بیٹھ کر کیا۔ اس آبی گزرگاہ پر جگہ جگہ لوگوں کی آمدورفت کے لیے پُل بھی بنے ہوئے ہیں۔

ہالینڈ اپنے پھولوں خصوصاً "ٹیولپس (مجھے اردو میں نام معلوم نہیں) کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ایک پھیرا ان خیابانوں کا بھی ضروری ٹھہرا۔ رنگا رنگ' سرکشیدہ' نازاں پھولوں کے شاداب اور آراستہ تختے ہر قدم پر دامان نگاہ کو تھامتے ہوئے۔ رنگ و حسن کی ایسی فراوانی نگاہوں کو کم ہی میسر آتی ہے۔ یہ پھول دوسرے ملکوں میں تحفتاً" بھی بھیجے جاتے ہیں۔ یہ کم یاب تحفہ اسلام آباد میں ہمیں بھی ملتا رہا ہے۔

وہاں دُکانوں پر جو خاص چیز نظر آئی وہ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے بڑے ہر سائز کے ڈچ اسٹائل کے جُوتے تھے۔ جو نہایت نازک نقش و نگار اور دلکش رنگوں سے سنوارے گئے تھے۔ سیاح یہ آرائشی جُوتے بڑے اشتیاق سے خرید رہے تھے۔ ان کھلونوں جیسے

جوتوں کے اپنے اپنے قدو قامت کے لحاظ سے مختلف مناصب تھے۔ وہی گلدان' وہی ایش ٹرے اور وہی سنگھار میز پر انگوٹھیوں اور آویزوں کی عارضی جائے سکونت۔ میں نے ان میں سے ایک بھی نہیں خریدا خواہش ہی نہیں ہوئی۔

ہمارے پاس وقت کم تھا ورنہ ایمسٹرڈم میں آرٹ گیلریاں بھی دعوت یک نگاہ دے رہی تھیں۔ دو دن قیام کے بعد ہم یہاں سے پیرس کے لیے روانہ ہو گئے۔

پیرس فن کاروں اور خوش خیالوں کا شہر ہے۔ اگر میں مرد ہوتی تو شاید خوش جمالوں کا لفظ بھی لکھ دیتی۔

ہمارا ہوٹل کا کمرہ چھوٹا سا تھا۔ مگر پیرس کی مشہور شاہراہ شانزے لیزے کے عقب میں تھا۔ اس لیے ہم بہت خوش تھے۔ شہر کی اس کشادہ سجی بنی مرکزی گزر گاہ تک بار بار پہنچنا آسان ہو گیا تھا۔

شانزے لیزے کے ساتھ دکانوں کے آگے لگے ہوئے رنگین شامیانوں یا چھتریوں کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ کر یا کبھی پیسوں کا دھیان آجاتا تو وہاں کھڑے ہو کر ایک ہاتھ میں کافی کا پیالہ پکڑے دوسرے ہاتھ سے سینڈوچ یا پین کیک کھانا بھی بڑا خوبصورت تجربہ تھا۔

اسی شاہراہ پر آگے جاکر آرک دی ٹرائمف (فتح کی محراب) ہے۔ جو پہلی جنگ عظیم کی یادگار ہے۔ یہیں بے نام سپاہی کی قبر ہے۔ یہاں جو چوک ہے اس جگہ بارہ سڑکیں آکر ملتی ہیں مغربی ممالک میں اپنے وطن کے جانبازوں اور ان کے قابل فخر کارناموں کو یاد رکھنے کا یہ ایک خوبصورت طریقہ ہے بے نام سپاہی کی قبر تمام سرفروشوں کی مشترکہ یادگار ہوتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ اپنی نئی نسل کو اپنے وطن کی تاریخ سے بھی مسلسل آگاہ رکھتے ہیں۔ اس جگہ روشنی اور زندگی کی علامت ایک شعلہ ہمیشہ فروزاں رہتا ہے۔ کہیں کہیں میں نے چھوٹے بچوں کو اس قبر پر پھول رکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

پیرس میں تاریخی مقامات بہت ہیں۔ قدیم چرچ بھی ہیں جو گوتھک طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ ان میں ناٹرڈیم کا گرجا اپنی خصوصی وجہ شہرت بھی رکھتا ہے۔ یہاں نپولین کی تاج پوشی ہوئی تھی۔ جس کے لیے اس نے پوپ کو خاص طور پر روم سے بلوایا تھا۔ قدیم دستور کے مطابق پوپ کبھی کسی کی خاطر روم سے باہر نہیں جاتے۔ مگر وہ پوپ نپولین کو

اس کی خواہش کے مطابق اپنے ہاتھ سے تاج پہنانے کے لیے اپنے تمام کروفر کے ساتھ پیرس پہنچ گیا۔ اور پھر ہوا یہ کہ عین وقت پر نپولین نے تاج اس کے ہاتھ سے لے کر خود ہی پہن لیا۔ ہم نے یہ گرجا بھی دیکھا اور لوو میں اس منظر کی پینٹنگ بھی۔ جس میں تمام حاضرین محفل کی حیرانی اور پریشانی قابل دید ہے۔

ورسائی کا محل بھی ہم نے خاص طور پر جاکر دیکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد صلح نامے پر دستخط اسی جگہ ریل کے ایک ڈبے میں بیٹھ کر ہوئے تھے جو محل کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ ریل کا وہ ڈبہ اب بھی وہاں موجود ہے۔ یہ صلح نامہ ورسائی کے نام سے موسوم ہے۔ "ٹریٹی آف ورسائی۔"

نپولین کا مقبرہ بھی جاکر دیکھا۔ یہ وہ عمارت ہے جسے اس نے معذور لوگوں کے علاج معالجے اور رہائش کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ معذور اور اپاہج لوگوں کے لیے اس قسم کا ایک اور اسپتال نپولین نے بنوایا تھا۔ مقبرے کی عمارت شاندار ہے۔ نپولین کی قبر پر اس کا مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ نیچے تہہ خانہ ہے جس میں اس کی تلواریں اور لباس وغیرہ محفوظ کیا گیا ہے۔

اس مقبرے کے قریب ہی ایک اور میوزیم ہے۔ جہاں اٹھارویں یا انیسویں صدی میں ایک فرانسیسی بت تراش روڈیں نے قیام اور کام کیا تھا۔ اس کا کام اب بھی وہاں موجود ہے۔

پیرس پہنچ کر معروف نمائش گاہ لوو دیکھنا تو لازم ٹھہرا۔ یہ ایک قدیم محل ہے۔ مختلف نوادرات کے علاوہ اس کا ایک حصہ مصوری کے کارناموں کے لیے مخصوص ہے۔ جن میں کچھ تاریخی مناظر بھی مصور کیے گئے ہیں۔ یہیں ایک دیوار پر مونالیزا کی پورٹریٹ ہے۔ جسے مصور کے کمال فن اور مونالیزا کی شرمائی، لجائی کچھ پردہ سا رکھتی ہوئی مسکراہٹ نے عالمی شہرت عطا کردی ہے۔ اس تبسم کو دیکھ کر غالب کا مصرعہ یاد آگیا۔ وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔۔۔ اس مسکراہٹ پر پوری دنیا فریفتہ ہے۔ پتہ نہیں اس نوخیز لڑکی کو زندگی نے کبھی کھل کر ہنسنے کا موقع دیا تھا یا نہیں۔

رات کو ہم فالی برژے میں نائٹ شو دیکھنے گئے۔ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ شو خاصا معصوم سا ہوتا ہے اس لیے صبیحہ کو ساتھ لیا۔ عزمی کو عامر کی وجہ سے مجبوراً" رکنا پڑا۔

شو اور ڈنر ختم ہوا تو بیرے نے نہایت شائستگی سے تین ماچس کی ڈبیاں پیش کیں۔ جن پر ہماری تصویریں تھیں

پیرس کے نواح میں ایک گاؤں ہے جہاں ڈچ آرٹسٹ وینگاگ رہتا تھا۔ آخری عمر میں اس پر پاگل پن کا دورہ پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک دورے میں وینگاگ نے اپنا ایک کان کاٹ لیا تھا۔ اور پھر اس نے اپنی ایک تصویر پینٹ کی جس میں ایک ہی کان ہے۔

پیرس میں فن کاروں کا ایک مخصوص کوچہ بھی ہے۔ اس چوک میں نقاش اور مصور آنے جانے والوں سے بے نیاز اپنے فن کی تشکیل اور تکمیل میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی سیاح فرمائش کرے تو اس کا اسکیچ بھی تھوڑی سی دیر میں وہیں بنا دیتے ہیں۔ ہمارے صادقین نے بھی کچھ عرصہ یہاں بسر کیا ہے۔

ہم نے اس شہر کو دیکھنے کے لیے آبی راستے کا بھی انتخاب کیا۔ دریائے سین پیرس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جس پر جگہ جگہ پل بنے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے جہاز بھی دریا میں چلتے رہتے ہیں۔ ہم نے جہاز میں بیٹھ کر ساحلوں کی جانب سے بھی پیرس کے مناظر دیکھے اور جہاز ہی پر لنچ کھایا۔

وہ لمحات کتنے انمول ہوتے ہیں جب ہم زندگی کے تمام بکھیڑوں سے دور صرف اپنے پاس ہوتے ہیں۔ اجنبی دیار میں اجنبی لوگوں کے درمیان ہر نئے نظارے کو بچوں کی سی حیرتوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بے اندازہ خوشی اخذ کرتے ہوئے۔

پیرس میں سیاحوں کو دور سے بلاوا دیتا ہوا ایفل ٹاور بھی کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک وہ دنیا کا بلند ترین مینار تھا۔ اب امریکہ اور جاپان میں اس سے اونچے مینار بھی موجود ہیں۔

ایفل ٹاور کی تیسری اور آخری منزل کے ایک ریستوراں میں بیٹھ کر کھڑکی سے پورے شہر کا نظارہ کیا۔ جو کسی خوش نما تصویر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہیں ایک چھوٹا سا

ڈاک خانہ بھی تھا۔ پوسٹ کارڈ خرید کر وہیں لکھے اور ڈاک کے سپرد کر دیے۔

سڑکوں پر گھومتے پھرتے ایک دن فرینچ شفان کی ساڑیوں کی دوکان نظر آ گئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ جگہ بہت مختصر سی تھی مگر یہ فرینچ شفان کی مشہور اور پیرس میں غالباً واحد دکان تھی۔ اس کا مالک ایک بوڑھا فرانسیسی تھا جو ہم سے نہایت صاف اردو میں باتیں کر رہا تھا۔ پتہ چلا کہ اس نے اپنی جوانی کے بیس سال بمبئی میں گزارے تھے۔

بے تکلف بلکہ بے محابا گفتگو کے سلسلے میں ہمارے عزمی کا انداز قطعی منفرد تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ جب ہم اپنی ہر مسافت سے تھکے ہارے ہوٹل واپس آتے تو راستے ہی سے عزمی کو رات کے کھانے کے لیے کچھ خریدنے بھیج دیتے۔ جو وہ قریب ہی کسی دکان سے خرید کر تیز قدموں چلتے ہم سے آملتے۔

ایک دن میں بھی ان کے ساتھ دکان میں چلی گئی۔ ہمارا بیٹا دکان کی مالکن سے مخاطب تھا۔

"خاتون محترم! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو براہ کرم یہ مرغ بریاں اور وہ نان پاؤ اور ادھر رکھی ہوئی شیرینی کی سربمہر چھوٹی شیشی (جام یا جیلی) مرحمت فرمایے۔"

میں نے ٹوکنے کی کوشش کی۔

"عزو! کیا بھول گئے کہ تم کس ملک میں ہو؟۔ یہ بیچاری تو شاید انگریزی بھی پوری طرح نہیں جانتی اور تم اس سے اتنی ثقیل اردو میں بات کر رہے ہو۔"

کہنے لگے "امی انگریزی یہ نہیں سمجھتی۔ فرانسیسی زبان میں نہیں جانتا۔ کام تو اشاروں سے ہی چلانا تھا۔ تو کیوں نہ اپنی زبان ہی میں بات کی جائے۔"

اس عمر میں عزمی اپنے ذخیرۂ الفاظ کی نمائش کے بھی بہت شوقین تھے۔

پیرس سے روم جاتے ہوئے ہم دو دن جنیوا میں ٹھہرے۔ شاداب مرغزاروں، گل و گلزار وادیوں کا شہر جنیوا۔ پس منظر میں پہاڑوں کی جھلملاتی ہوئی برف پوش چوٹیاں۔ سامنے لیک جنیوا جو سوئزرلینڈ کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ جس کے پانی کا رنگ سورج کی کرنیں آتے جاتے بدلتی رہتی تھیں۔ جھیل کی گود میں صاحبِ وقار فوارہ جسے انسانی

ہاتھوں کا بنایا ہوا سب سے بڑا فوارہ کہا جاتا ہے۔

نگاہوں کے سامنے جو حسین قدرتی مناظر تھے ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ وقت کی ہر پابندی کو فراموش کر دیا جائے۔ مگر ایسا کہاں ممکن ہوتا ہے۔ مسافر کو قیام و قرار کی آزادی کہاں۔ ہمیں ان دلپذیر اور دلربا مناظر کو دادِ حُسن دیتے ہوئے رخصت ہونا تھا۔

روم میں ٹھہرنے کے لیے ہم لوگ پہلے سے کوئی انتظام نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے ایئرپورٹ سے باہر آکر ٹیکسی ڈرائیور کی رائے پر انحصار کرنا پڑا۔ اس نے فوراً ہی ہمارے لیے قیام گاہ تجویز کرلی۔ جس کا کرایہ ہماری توقع سے بہت کم تھا۔ روم خاصا مہنگا شہر ہے۔ اس لیے ہم مزید کوئی سوال کیے بغیر روانہ ہو گئے۔

شام کا وقت تھا۔ ٹیکسی ایک سنسان سی سڑک پر ایک عمر رسیدہ دروازے کے آگے رک گئی۔ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ایک پتلا سا زینہ تھا۔ سامان کا بوجھ اٹھائے زینہ پار کیا۔ کمرے میں پہنچے تو وہاں زمین' میز کرسی وغیرہ ہر چیز پر گرد اور عمر کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ بلکہ ایک پرانے رہائشی مکان میں دو کمرے کرائے کے لیے مخصوص تھے۔ ایسے مکانوں کو پین زیاں (Pansion) کہا جاتا ہے اور ان کے لیے حکومت سے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل ہوتا ہے۔

اس اقامت گاہ کو دیکھ کر ہم سب ہی پریشان ہو گئے۔ میں اتنی تھک چکی تھی کہ اس مکان کی زار و زبوں حالت کے باوجود وہاں ایک رات بسر کرنے کے لیے تیار تھی۔ لیکن صبیحہ کو اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ ابھی تک مالکِ مکان عورت ہاتھ میں رجسٹر لیے ہوئے کھڑی تھی۔ یکایک صبیحہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کہنے لگی "اماں ہم روم کے بجائے لاہور میں پرانی انارکلی کے کس مدتوں سے خالی ویران گھر میں پہنچ گئے ہیں۔"

ہماری بیٹی اس مکان میں ایک رات گزارنے پر بھی راضی نہیں تھی۔ پھر وہی سیڑھیاں اور وہی سامان۔ سڑک پر پہنچے تو وہی ٹیکسی ایک طرف کھڑی تھی۔ اور ڈرائیور اطمینان سے کسی گانے کا کیسٹ سننے میں محو تھا۔ یقیناً" وہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس قسم کے تجربے اسے اکثر ہوئے ہوں گے۔

اس بار وہ ہمیں سیدھا پوپ کے شہر ویٹیکن سٹی لے گیا۔ یہ جگہ پوپ کے زیر فرمان ہے۔ یہاں اٹلی کے قوانین کا نفاذ نہیں ہوتا۔

گاڑی ایک خاصی شاندار عمارت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کسی زمانے میں یہ کسی کاؤنٹ کا محل تھا۔ جسے اب ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔ کرایہ زیادہ تھا مگر ہم نے سوچا کیا برا ہے۔ کسی محل میں اس بہانے ہی قیام سہی۔ صبح کو اس کا معائنہ کیا۔ کمرے اچھے تھے۔ فرنیچر صاف ستھرا اور قیمتی تھا۔ کہیں کہیں جھاڑ فانوس بھی ابھی تک موجود تھے۔ باہر چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ جس میں چند پھول کھلے ہوئے تھے۔

پوپ کا محل اور گرجا بھی جاکر دیکھا۔ گرجا کی چھت کو مائکل انجلو کی مصوّری نے حسن و جمال کا مرقع بنا دیا ہے۔ دیر تک رنگوں سے کہانیاں سنتے رہے۔ اگر اتوار کا دن ہوتا تو ہم نے پوپ کے درشن بھی کر لیے ہوتے۔

روم بہت قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو قدیم ہی نظر بھی آتا ہے۔ شہر کے اندر جتنی رہائشی عمارتیں ہیں وہ بھی ابھی تک پرانے طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ بام و در ودیوار کی جو صورت پہلے رہی ہو گی وہی اب تک قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرمت کے وقت بھی اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

مکانوں کے اندر بے شک تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جدید دَور کے تمام تقاضے پورے کیے گئے ہیں۔ ان گھروں میں تمام جدید سہولتیں بھی مہیا ہیں مگر اس شہر میں آنے والے تمام سیاح قدیم روم ہی کے گلی کُوچوں میں گھوم پھر رہے تھے۔

روم خوبصورت مجسّموں اور فواروں کا شہر ہے۔ جو ہر طرف ہی نظر آتے ہیں۔ ایک خوبصورت نظارہ شہر کے وسط ہی میں تھا۔ یہاں مجسّمے اور فوارے کچھ بلندی پر تھے اور سیڑھیوں پر پھول اس طرح لگائے گئے تھے کہ یہ جگہ پھولوں کی ایک چھوٹی سی پہاڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے بارے میں یہ خوش اعتقادی عام ہے کہ جو شخص اس کے حوض میں ایک سکّہ ڈالتا ہے وہ دوبارہ روم ضرور آتا ہے۔ سکّہ تو میں نے بھی ڈالا تھا مگر دوبارہ اب تک نہیں جا سکی ہوں۔ صبیحہ البتہ کئی بار وہاں زبیر اور اپنے بچّوں کے ساتھ جا چکی ہیں۔

روم کے نواحی علاقے میں بھی مصنوعی آبشاروں اور فواروں کی ایک چھاؤنی ہے۔ اس جگہ کا نام ٹریوولی گارڈن ہے۔ مجھے خوشیوں بھرے وہ لمحات یاد ہیں جو وہاں پہنچ کر آنکھوں میں تحریر ہوئے۔

وہ مدوّر فوارہ جس کا گھیرا تقریباً" تیس فٹ تھا۔ اوپر سے گرتی ہوئی پانی کی شفاف جھالر سورج کی روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی۔ اور پھر اس آبی چلمن کی اوٹ اس دائرے کی دیوار سے لگ کر ہم کھڑے ہوئے تھے اور کبھی نور کبھی عزمی تصویر کھینچ رہے تھے۔ آس پاس اور فوارے بھی تھے جو اپنے اپنے انداز سے نگاہوں کی مدارات کررہے تھے۔

اس علاقے میں وہ ریستوراں بھی تھا جس کی ندرت نے ہمیں مسحور کرلیا تھا۔ چاردیواری سے گھرا ہوا آنگن سا۔ جہاں میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کی اونچائی سے مصنوعی آبشاروں کا گاتا گنگناتا ہوا پانی لطیف اور خنک پھوار کی سوغات بانٹتا ہوا۔ اس انگنائی کے اوپر سبز پتوں اور گلابی پھولوں کی شاداب بیلوں کا سائبان تھا۔ جس کی کسی جھری سے آسمان کا کوئی ٹکڑا نیچے جھانک کر دیکھ لیتا۔ کبھی سورج کی کوئی کرن کسی میز پر آکر کھیلنے لگتی۔ ایسا منظر کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔

ہر ملک میں کچھ مناظر وہاں کے لوگوں کے حسنِ ذوق کی علامت ہوتے ہیں اور کچھ مقامات تاریخ کے اوراق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ روم میں دو ہزار سال پرانا وہ کلوزیم ان کی تاریخ ہی کا حصہ ہے جہاں حکمراں اپنی تفریح کے لیے نہتے قیدیوں اور بھوکے شیروں کی لڑائی کا اہتمام کرتے تھے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے اس اسٹیڈیم کی ایک طرف کی دیوار گر چکی تھی۔

روم سے ہم استنبول گئے۔

استنبول بہت خوبصورت شہر ہے۔ اسے مساجد کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخی آثار یہاں بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اس شہر میں ہم نے ایک ہفتے قیام کیا۔ ہمارا ہوٹل شہر کے اندر تقسیم اسکوائر میں تھا۔

یہ شہر بلکہ پورا ملک ہی زبان سے ناواقفیت کے باوجود ہم پردیسیوں کے لیے اپنائیت رکھتا تھا۔ جس راستے سے بھی گزرتے سلام کی آواز خیر مقدم کرتی۔ اکثر راہ گیر ٹھہر کر بات کرنے کی بھی کوشش کرتے۔ یہ ملتِ اسلامی کے ناقابلِ شکست رشتے ہیں جہاں زبان اور زمین کی اجنبیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اسی ملک کے ایک شہر قونیہ میں جناب رومیؒ کی آخری آرام گاہ ہے۔ اہلِ تصوف کا مرکز۔ جہاں بزرگ رومیؒ کے فیض کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ جہاں اتاترک کے زمانے میں عائد کردہ تمام پابندیوں اور بندشوں کے باوجود رقصاں درویش آج بھی قصہ پارینہ نہیں بنائے جا سکے

اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کے دور حکومت میں عربی رسم الخط کا استعمال قانوناً منسوخ ہوا۔ پورے ملک میں مغربی طرز معاشرت اور لباس کی ترویج کی گئی۔ اور بھی کئی ایسے انقلابی اقدام ہوئے کہ یہ قوم اپنے ماضی کی تہذیب اور روایات سے دور ہوتی چلی گئی مگر اپنے دین سے بیگانہ نہیں ہوئی۔ اب یہ لوگ کلامِ الٰہی صرف رومن تحریر میں پڑھ سکتے ہیں لیکن صوفیا اب بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ اور اسلام کی محبت آج بھی دلوں کی زندگی اور تابندگی بنی ہوئی ہے۔

استنبول کے بازاروں میں جو فن پارے دامانِ نگاہ کو تھام تھام لیتے ہیں وہ قرآنی آیات کی خطاطی کے نادر نمونے ہیں۔ دلکش رنگوں میں حسین طرزِ نگارش سے آراستہ طغرے اور شیشے اور چینی کی چھوٹی بڑی طشتریاں سیاحوں کے لیے خاص کشش رکھتی ہیں۔ وہاں کسی دوکان پر نوران کی لکھی ہوئی کوئی آیت پڑھنے لگتے تو دوکاندار حیران ہو کر پوچھتے کہ "کیا آپ عربی پڑھنا جانتے ہیں؟" جبکہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ جو' ان آیات کو لکھ رہے تھے خود عربی رسم الخط میں ان کو پڑھنے سے معذور تھے۔

یہی حال مساجد میں تھا۔ کہ جب وہاں کسی دیوار یا محراب پر کندہ کوئی آیت کوئی اسم نور پڑھتے تو ہمارا گائڈ چونک کر یہی سوال کرتا۔

استنبول میں سلاطینِ عثمانیہ نے جہاں اپنے محلوں کو اپنی جاہ و ثروت کا نمونہ بلکہ

اشتہار بنا دیا وہیں مساجد کی تعمیر اور تزئین و آرائش میں بھی دلچسپی لی۔ اس شہر کی تمام مساجد قابل دید ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے ہمیں ان مساجد کو دیکھنے اور ان میں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کا موقع حاصل ہوا۔

ایا صوفیہ بھی دیکھا۔ یہ کلیسا جسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مگر اس وقت بھی اس کی دیواروں پر ماں اور بچے کی شبہیں موجود رہنے دی تھیں۔ جب ہم نے دیکھا ہے تب اس کو میوزیم بنا دیا گیا تھا۔

ہم نے سلاطین عثمانیہ کے زر و جواہر کی نمائش گاہیں بھی دیکھیں۔ ہوس سیر و تماشا نے سب سے پہلے توپ کاپی سرائے کا انتخاب کیا۔ یہ شاہی محل جو اب میوزیم ہے اپنے بیش بہا ساز و سامان، مرصع کاری کے بے مثال نمونوں اور دوسرے بے شمار نوادرات کے لیے مشہور ہے۔ جن میں روس، چین اور دوسرے ممالک کے نوادر بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ملبوسات، ظروف اور ہتھیاروں میں بھی ہیرے اور قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان عجائبات کے حسن و زیبائش میں کلام نہیں مگر دولت دنیا کی اتنی بہتات بھی کہیں اور نہیں دیکھی۔ یہ نمائش گاہ ہوسِ دولت و ثروت کا آئینہ بھی تھی۔ مثلاً" خالص سونے کے بنے ہوئے صرف ایک اونچے شمعدان کا وزن ایک من سے زیادہ تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قصر و ایوان میں دولت و حشمت کی فراوانی اور کوچوں قریوں میں غربت و افلاس کی بے چارگی ماضی میں بھی ڈھکی چھپی تو نہیں تھی۔ مگر عوام کے دکھ درد کو کب کسی نے دیکھنا چاہا ہے۔ ان کی محرومیوں کو کون سوچتا ہے۔

اس میوزیم کا ایک حصہ بے شک نہایت محترم ہے۔ جہاں شفاف شیشے کی دیوار کے پار شفاف شیشے ہی کے کیس میں چکنی مٹی پر ثبت حضورؐ کا نقشِ قدم محفوظ ہے۔

آگے بڑھے تو رحل پر قرآن مجید کا وہ نسخہ رکھا ہوا نظر آیا جس کی تلاوت حضرت عثمانؓ غنی عین اپنی شہادت کے وقت کر رہے تھے۔ کلام پاک اسی صفحے پر کھلا ہوا ہے جہاں حضرت عثمانؓ غنی کے پاک لہو کے چند قطرے گرے تھے۔

سونے کے ایک مقفل صندوق میں رسول کریمؐ کی عبا بھی محفوظ ہے۔ شاید کسی

سربراہِ مملکت کی آمد پر یہ صندوق کھولا جاتا ہو۔ ایک جگہ حضورؐ کے ذاتی استعمال میں رہنے والی تلوار بھی موجود ہے۔

توپ کاپی سرائے اپنے اس خزینے کے لحاظ سے واقعی دنیا بھر میں بے نظیر ہے۔

دوسرے دن سلطان عبدالحمید کا محل ڈولما بہچہ دیکھنے کا پروگرام تھا۔ مگر توپ کاپی میں سلاطین عثمانیہ کی بے تحاشا دولت کا نظارہ کرنے کے بعد مزید زرِ خالص اور ہیرے جواہرات دیکھنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس لیے وہاں پہنچ کر میں اور میری وجہ سے عزمی باہر ایک درخت کے سائے میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ عامر دوڑتے کھیلتے رہے اور نور داخلے کا ٹکٹ خرید کر صبیحہ کے ساتھ اندر چلے گئے۔

انہوں نے واپس آکر اس جگہ کی خوشنمائی کچھ اس طرح بیان کی کہ میں اور عزمی دونوں ہی اس محل کو دیکھنے کے مشتاق ہو گئے۔ اب داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اور دوسرے دن شام کی فلائٹ سے ہماری روانگی تھی۔ چنانچہ اگلی صبح آٹھ بجے داخلے کے دو ٹکٹ خرید لیے۔ علی الصبح ہوٹل سے روانہ ہونا پڑا۔ ہم تو پہنچ گئے مگر اس وقت وہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر لوگوں کا انتظار کرنے کے بعد ایک بیزار سا رہ نما (گائڈ) ہمیں ساتھ لے کر عمارت کے اندر داخل ہوا۔

محل کی آرائش و زیبائش قابلِ دید تھی۔ سجاوٹ آنکھوں کو اچھی لگی۔ اس کے علاوہ وہاں وہ تمام سامان نمائش بھی موجود تھا جو بادشاہوں کے قصر و ایوان میں ہوتا ہے۔ غسل خانوں کے نلکوں کی سونے کی ٹونٹیاں اور سونے کے ٹیلی فون سیٹ وغیرہ۔ اسلام میں خلافت کا جو تصوّر ہے وہ خلافتِ عثمانیہ کے دَور میں نہیں رہا تھا۔ بلکہ مدّتوں پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

اس محل میں اتاترک کا قیام بھی رہا تھا۔ پیچیدہ راستوں اور مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں اتاترک کا انتقال ہوا تھا۔ کمرے کا سامان جُوں کا توں رہنے دیا گیا تھا۔ اور محل کی تمام گھڑیاں اتاترک کی مَوت کے وقت پر رُکی ہوئی تھیں۔

ابھی تک ہم اپنے رہ نما سے رواں تبصرہ سنتے چلے آرہے تھے۔ اس کمرے میں پہنچ کر چند جملے کہنے کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ خاموشی کا وقفہ بڑھا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارا گائیڈ غائب تھا۔ صرف میں اور عزمی وہاں کھڑے تھے۔ اور پوری عمارت میں سناٹا تھا۔ ابھی تک سیاحوں کا کوئی دوسرا گروپ بھی نہیں پہنچا تھا۔

کہیں سنا تھا کہ یہ محل آسیب زدہ ہے۔ اب تو مجھے یقین آگیا۔ گھبرا کر عزمی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اور اس دہشت ناک خاموشی میں اپنی آواز سننے کی خاطر عزمی سے کہا کہ "تمہارے ابا انتظار کر رہے ہوں گے اب ہمیں فوراً" واپس چلنا چاہیے۔" اپنا تو جو بھی حال تھا مگر بچّے کو خوف کے احساس سے بچانا چاہتی تھی۔

کمرے سے باہر نکل کر آگے بڑھے تو ایک گوشے سے وہی اکتائی ہوئی انسانی شکل اپنی جانب آتی ہوئی دکھائی دی۔ ادھر میں بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش میں مبتلا تھی ادھر وہ بڑی عاجزی سے معافی مانگ رہا تھا کہ سگرٹ پینے کے لیے باہر کھلنے والی بالکنی میں چلا گیا تھا۔ عمارت کے اندر سگرٹ پینا ممنوع تھا۔ سو یہ زندگی میں پہلی اور غالباً" آخری بار کسی آسیب اور وہ بھی نقلی آسیب سے میری ملاقات کی رُوداد ہے۔

ترکی کا ملک دو بڑا عظموں میں واقع ہے۔ کچھ حصّہ یورپ میں اور بقیہ ایشیا میں۔ ان دونوں حصّوں کے درمیان آبنائے باسفورس ہے۔ جس کو عبور کرنے کے لیے چھوٹے جہاز ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ خشکی کے راستے آمدورفت کے لیے پُل بھی بنایا گیا ہے۔ ایک جہاز میں ہم نے بھی ترکی کے ساحلی علاقوں کی سیر کی۔ یہ سفر دلچسپ تھا۔

استنبول جاتے ہوئے ہم نے اپنے پروگرام میں جمعہ کا دن خاص طور پر شامل رکھا تھا۔ مگر یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ جمعہ کی نماز اس دل آویز مسجدوں کے شہر کی کس مسجد میں ادا کی جائے۔ چنانچہ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک سے رائے لی۔ اس نے کہا جمعہ کی نماز کا جو ایک خاص ماحول حضرت ایوب انصاریؓ کی مسجد میں ہوتا ہے وہ کسی اور مسجد میں نہیں ملے گا۔ ہم نے یہ مشورہ مان لیا۔

حضرت ایوب انصاریؓ رسول کریمؐ کے صحابی تھے۔ اور مدینہ منورہ میں حضورؐ کی

میزبانی کا شرف سب سے پہلے انہیں کو حاصل ہوا تھا۔ جب سرور عالمؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں انصار میں سے ہر شخص کی آرزو تھی کہ آپؐ کا قیام اسی گھر میں ہو۔ حضورؐ کے اخلاق کریمانہ کو کسی کی دل شکنی منظور نہیں تھی۔ اس لیے فرمایا کہ آپؐ کی اونٹنی جس دروازے پر جاکر بیٹھ جائے گی وہیں قیام فرمائیں گے۔ اور یہ شرف حضرت ایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا۔ ان کا مزار اور مسجد استنبول میں ہے۔

حضرت ایوب انصاریؓ کی مسجد میں سجاوٹ کا انداز بھی ہے اور سادگی کا حُسن بھی۔ اور اس کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ شاید محبت کی جلوہ گری۔

مسجد کا صحن مَردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر غریب طبقے کے لوگ نظر آرہے تھے۔ کچھ عورتیں بُرقع بھی پہنے ہوئے تھیں۔ صحن میں موسم گرما کی چمکدار دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ وہیں ایک طرف پانی کے نل لگے ہوئے تھے۔ اور لوگ وضو کرنے کے بعد اندر جارہے تھے۔ عزمی نور کے ساتھ مسجد کے اندر مَردوں کی صفوں میں جاچکے تھے۔ میں بھی صبیحہ کے ساتھ وضو کرچکی تھی۔ اتنے میں اذان کی آواز سنائی دی۔ اور میں وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بس وہ آواز سنی اور اس کے بعد وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ مسجد کی عمارت نہ یہ زمیں و آسماں نہ میں تھی نہ لوگوں کا ہجوم۔ اور دھوپ بھی کہاں تھی۔ حد نگاہ تک لطیف روشن دھندلکا تھا اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا سکون ایسی راحت کا عالم کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

تھا تو وہ ایک ہی لمحہ مگر جب تک مجھے ہوش آیا لوگ نماز پڑھ کر واپس آرہے تھے اور صبیحہ گھبرا گھبرا کر پوچھ رہی تھی ---- "اماں آپ کو کیا ہوگیا ہے؟" ---- کچھ اور خواتین بھی پاس آکر خیریت پوچھنے کی کوشش کررہی تھیں۔

نہ جانے حضرت بلال حبشیؓ کی اذان سُننے والوں کے دلوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

شاید اپنی پوری زندگی میں وہی ایک نماز ادا کرسکی ہوں جو میں اس دن اس مسجد میں نہیں پڑھ سکی تھی۔

بہت عرصے کے بعد میں نے اس کیفیت کو نظم کرنے کی ایک نامکمل سی کوشش بھی

کی۔ اس نظم کا عنوان ہے "دید کا لمحہ" اس کے چند مصرعے ہیں۔

دید کا لمحہ مرے پاس اکیلا آیا
تو جہاندار نظارہ تھا مگر ساتھ نہ تھا
ناز بردار تھی اس وقت کہ مسحور تھی میں
تو مرے سامنے آیا تو بہت دور تھی میں
عکسِ خورشیدِ جگر تاب تھا مہ پارہ تھا
میری پلکوں پہ دہکتا ہوا انگارہ تھا
اور پھر دل نے وہ بھولی ہوئی آواز سنی
بیعت درد کی کس ناز سے تجدید ہوئی
جانے یہ میں نے کہا' تو نے کہا' کس نے کہا
شعلۂ رخ کو کبھی آئینہ پرولا نہ ہوا
میں محبت ہوں محبت میں کہاں اندیشے
تو صداقت ہے صداقت کے ہزاروں چہرے

استنبول کی خوبصورت یادوں کو ساتھ لے کر ہم بیروت روانہ ہوئے۔

۶۹ء کا بیروت اس بیروت سے مختلف تھا جہاں سیاستِ دوراں کے ہاتھوں طویل عرصے تک انسانیت سربہ گریباں رہی ہے۔ اب خدا کا شکر ہے وہاں حالات بہتر ہوتے جارہے ہیں۔

جب ہم نے اس شہر کو دیکھا ہے یہ جاگتی راتوں اور شوقین مزاج سیاحوں کا شہر تھا۔ بحیرہ روم کے ساحل پر بسا ہوا' سانس لیتا ہوا' خوبصورت اور نہایت بارونق شہر۔

بیروت پہنچ کر ہمیں پاکستانی سفارت خانے سے معلوم ہوا کہ نور کے دوست اکبر عادل بھی ان دنوں وہیں موجود تھے اور ہوٹل فنیشین میں ٹھہرے ہوئے تھے جو وہاں کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔ ہم ان سے ملنے گئے تاکہ شہر کے قابلِ دید مقامات ترجیحی بنیاد پر

معلوم کر لیے جائیں۔ ہمارا قیام صرف چند دن کے لیے تھا اور اکبر عادل اکثر بیروت جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے ہمارا پروگرام بھی طے کیا اور خود ہی ہر جگہ ہمیں لے کر بھی گئے۔ ایک بڑی موٹران کی تحویل میں تھی۔

سب سے پہلے تو ہم اس موٹر میں بحیرہ روم کے ساحل پر بہت دور تک گئے۔ اور ہر تھوڑے فاصلے کے بعد پانی کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھے جو خاصا دلکش نظارہ تھا۔

بیروت کے نواح میں نہرالکلب کے قریب ایک مشہور غار ہے۔ اس کے اندر بھی گئے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ نیچے نہر بہہ رہی ہے جس میں اوپر سے پہاڑ کی پگھلی ہوئی برف کا پانی قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے۔ سیاحوں کی خاطر اس جگہ کو بہت پُرکشش بنا دیا ہے۔ روشنی کا انتظام اس طرح کیا گیا ہے کہ نیچے پتھروں پر مختلف شکلیں بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہم نے قدیم شہر بعلبک بھی دیکھا۔ بیروت سے تقریباً" چالیس پچاس میل دور ایک پہاڑی پر واقع بعلبک رومن حکمرانوں کی نو آبادی تھی۔ یہاں پرانے مندر ہیں جو بہت بلندی پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ مندر مختلف ستاروں کے نام سے موسوم ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک شراب کے دیوتا کا مندر بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر دو ہزار سال پرانے ہیں۔

اکبر عادل نے ہمیں سمندر کے ساحل پر بنے ہوئے ایک ایسے ریستوراں میں کھانا کھلایا جس کا کچھ حصہ پانی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اب تو ایسے ریستوراں دوسرے ملکوں میں بھی نظر آتے ہیں مگر اس وقت یہ ایک عجوبہ سا معلوم ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتیں تو یہی تاثر ہوتا تھا کہ ہم کسی جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے یاد آیا اسی ریستوراں میں ہم نے پہلی بار باباگنوش اور حمس کھایا تھا۔ یہ خوش ذائقہ خاص لبنانی کھانے اب دوسرے ممالک تک بھی پہنچ گئے ہیں۔

اکبر عادل کی وجہ سے ہم نے بیروت خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ اور سب سے انوکھا منظر جو وہاں دیکھا وہ ایک غیر ملک میں اکبر عادل کی غیر معمولی وضع داری کا مظاہرہ تھا۔ وضع یہ تھی کہ جہاں بھی جاتے ان کے ہاتھ میں پانوں کی ایک بڑی سی ڈبیا ہوتی۔ اور ایک سفید

فام بٹلر اپنی مکمل یونیفارم کالی بو اور کالے سوٹ میں ان کے پیچھے ان کا پاندان ہاتھ میں لیے ہوئے چلتا۔ جبکہ اکبر عادل خودٹی شرٹ اور نیکر پہن کر گھومتے۔

بیرونِ ملک سیاحت کا یہ انداز حیران کر دینے والا تھا۔

اکبر عادل پاکستان کی وفاقی حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بہت مہماں نواز اور مخلص دوست تھے۔ اور اچھے انسان تھے۔

نگاہوں نے زمیں کو آسماں دیکھا

اب ہم وہاں تھے جہاں پہنچنا ہم جیسوں کے لیے ایک معجزہ ہی ہوتا ہے۔ جہاں خود اپنی قسمت پر رشک آئے۔

ملکوں ملکوں گھومی۔ دل کو خوشی ملی۔ آنکھیں شکرگزار ہوئیں۔ تمام مسرتیں، تمام راحتیں اسی کا عطیہ تھیں جو رحیم و کریم بھی ہے۔ قدرتوں والا بھی ہے۔ مگر وہ مسافت تھی۔ قرار کا مقام وہاں کہیں نہیں تھا۔ نہ آنکھوں کے لیے، نہ دل کے لیے۔

اور پھر نگری نگری پھرتے ہوئے مسافر کو گھر کا رستہ بھی دکھایا گیا۔ وہ دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ اب ہم وہاں تھے جہاں پہنچ کر دوسری کوئی تمنا ساتھ نہیں تھی۔

یہ آنکھیں اور آسماں منزلت ارضِ مقدس۔ یہی تو وہ مقام ہے جسے دل و جاں کی آبرو کا مطلع کہا جائے۔ یہاں حاضری کی آرزوئیں اور تمنائیں اپنی جگہ مگر بات اجازت کی ہوتی ہے۔ اذنِ باریابی کی ہوتی ہے۔ ہم کیا اور ہمارے ارادے کیا۔

جب تک ان منوّر ہواؤں میں سانس نہیں لی یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ مسرت و سعادت میرا نصیب بھی ہو سکتی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ یاد تھا جب نور نے اپنے بیرونِ ملک سرکاری دورے سے واپسی میں عمرے کا پروگرام بھی شامل رکھا تھا۔

نور کے ساتھ ان کے ایک شریکِ کار اور دوست ریاض بخاری بھی تھے۔ جو بعد میں حکومتِ پاکستان میں آڈیٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ان دونوں کو فرینکفرٹ میں بھی دو تین دن قیام کرنا تھا۔ فرینکفرٹ سے جدہ روانہ ہونے سے پہلے نور کو الرجی کی شکایت ہو گئی۔ اتنی شدید الرجی کہ دونوں ہاتھوں کی سب انگلیاں بڑے بڑے چھالوں سے بھر گئیں۔ ایسی حالت میں عمرے کی ادائیگی اور روضۂ رسولؐ پاک پر حاضری ممکن ہی

نہیں رہی۔

نور کو مجبوری اور ساتھ ہی مایوسی کے عالم میں فوراً ہی وطن واپس آنا پڑا۔ یہ ریاض بخاری صاحب کا حسنِ اخلاق اور ان کی محبت تھی کہ وہ اس محرومی میں بھی نور کے شریک رہے۔ اور نور کے اصرار کے باوجود وہ بھی عمرہ کی سعادت حاصل کیے بغیر ساتھ ہی واپس آگئے۔ ان دونوں کے لیے وہاں حاضر ہونے کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ دوستی اور ہم راہی کا حق اس طرح کون ادا کرتا ہے۔ اس کے بعد بہت مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ہی کو اذن حضوری عطا فرمایا۔ عمرے بھی کیے حج بھی کیا۔ نور کے ساتھ مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہوا۔ وہ صاحبِ اکرام دلوں کے بھید جانتا ہے۔ لیکن ان دنوں نور بہت دل گرفتہ رہے۔ میں اس دکھ کو کم کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ ان سے کہتی "ہم اس ذات پاک کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاید اسی طرح آپ کے اشتیاقِ حضوری اور جذبِ دروں میں اضافہ منظور ہو۔ دلکش تمناؤں کو دعاؤں کی احتیاج بھی ہوتی ہے۔ صبر اور انتظار کی کیفیت سے بھی گزرنا ہوتا ہے۔"

مجھے ۷۹ء میں اس منزل آرزو تک پہنچنے کی خوشی حاصل ہوئی۔ مشرق بعید' امریکہ' یورپ اور مشرق وسطیٰ کے سفر سے واپسی کے موقع پر پہلی بار عمرے اور اس کے اگلے سال حج کی توفیق اور سعادت نصیب ہوئی۔ جب نگاہوں نے عبادت کی اور دل سجدہ ریز ہوا۔ خانہ کعبہ تک پہلی بار جو نگاہ پہنچتی ہے وہ ہماری عمر بھر کے لیے کتنا قیمتی' کتنا عزیز سرمایہ ہو جاتی ہے۔

یہ بیت اللہ ہے۔ دعائے ابراہیم علیہ السّلام ہے۔ اللہ کے بندوں کے لیے امن اور سلامتی کا مرکز ہے۔ کبھی منزل کبھی منزل نما ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد والہانہ طواف کرتے ہوئے لوگ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان بے تابانہ پھیرے لگاتی ہوئی مخلوق سب وہیں حاضر تھے۔ مگر کسے معلوم کون کہاں تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہر جانے والا اکیلا ہوتا ہے۔ کتنا ہی مجمع' کیسی ہی بھیڑ ہو کوئی کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اور کبھی کبھی اپنے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔

گیت مرے، آہنگ اس کا ہے

چُنری میری، رنگ اس کا ہے

خبر اور بے خبری کے اسی عالم میں ایک دن شوقِ فراواں کی انگلی تھام کر ہم دونوں غارِ حرا کی جستجو میں چل پڑے۔ سامنے اونچا دشوار گزار پہاڑ تھا۔ اور کوئی واضح پگڈنڈی یا گزرگاہ نہیں تھی۔ آگے بڑھے تو دیکھا کہ نشان دہی کے لیے کہیں کہیں کسی پتھر پر سفیدی لگا دی گئی تھی۔ راہ نما تو یہ تصور ہی تھا کہ۔ اس ہَوا میں مرے آقا کے نفس کی خوشبو۔ اور ان پتّھروں نے کبھی سرور عالمؐ کے قدموں کو چوما تھا۔ اور اب یہ اتنے محترم تھے کہ وہاں سے ہم کوئی چھوٹا سا کنکر بھی اٹھا کر اپنے ساتھ نہیں لا سکتے تھے۔ ان سنگ ریزوں کا رتبہ ہمارے بناوٹی گھروں اور آلودہ شہروں سے بہت بلند اور مقدس تھا۔ اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ ایسی جرأت نہیں کی جا سکتی۔

جبلِ نور کافی بلند ہے۔ نیچے نگاہ پڑتی تو سڑک پر چلتی ہوئی گاڑیاں کھلونے نظر آتیں۔ مگر جانے والوں کا راستہ، ایک ہی دُھن اور ایک ہی دھیان میں آسان ہو گیا تھا۔ اور پھر ہم وہاں پہنچ گئے جہاں ہم جیسوں کے دھیان کا راستہ بھی کہیں گم ہو جاتا ہے۔ کان میں آواز سی آئی۔ "یہی وہ جگہ ہے جہاں جبریلِ امیں نبوّت کی بشارت دینے پہلی بار رحمتِ عالمؐ کے پاس آئے تھے۔ یہاں مالکِ کون و مکاں کی جانب سے پہلا پیغام سید کونینؐ تک پہنچا تھا۔ یہاں ہواؤں نے پہلی بار "اقرا" کا لفظ سنا تھا۔"

غارِ حرا پاس تھا۔ تھوڑا سا نیچے کی جانب اُتر کر دائیں جانب ایک چٹان کی آغوش میں۔ جہاں پتھر کی ایک بہت بڑی سپاٹ سِل اس سلسلۂ کوہ کی طرف آتے آتے اس طرح ٹھہر گئی ہے کہ بیچ میں ایک در سا بن گیا ہے۔ اس جگہ سے باری باری گزرا جا سکتا ہے۔ اس در سے گزرے تو غارِ حرا کے سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ نظر آئی جہاں ہم سے پہلے پہنچنے والے کچھ لوگ جمع تھے۔ ایک وقت میں دو آدمی اندر جا سکتے تھے۔ بقیہ لوگ غار کے دہانے کے پاس کھڑے ہوئے انتظار کر رہے تھے۔

منزلِ مقصود سامنے تھی۔ ایسے میں ذہن کسمسایا۔ غار کے اندر تو سنا ہے اندھیرا ہوتا

ہے۔ اور یہاں اتنے لوگوں کی دیوار بھی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ ہوا کا گزر بھی نہیں ہو گا۔ مگر دل کے احکام زیادہ واضح تھے۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے اور اجالوں میں شرابور ہو گئے۔ اسی چٹان میں غار کے اندر ایک رَوزن کُھلا ہوا تھا۔ یوں جیسے کسی ہاتھ نے مہارت سے پتھر کو تراشا ہو۔ خاصا بڑا روشن دان تھا۔ اور جانب حرم سے آنے والی لطیف ہوائیں دل کو چھو رہی تھیں۔ غارِ حرا میں روشنی بھی تھی اور ہوا بھی۔

اسی روشن دان کے نیچے غار کی سطح پر ایک ہموار مستطیل پتھر تھا۔ درمیان سے کچھ گھسا ہوا سا۔ یہ روزن قبلہ رُخ تھا اور یہ سِل سیکڑوں سال سے جبینِ نیاز کے لیے سجدہ گاہ۔ غار حرا سے واپسی کب اور کیسے ہوئی مجھے یاد نہیں۔

اور پھر جانبِ بطحا سفر۔ جہاں مسافر پائے مژگان سے چل کر جانے کی توفیق اور مرحمت چاہتا ہے۔

یہ اور راستے ہیں حدی خواں! سنبھل کے چل
طیبہ کا ذرہ ذرہ مجھے دل دکھائی دے

مگر اس سفر، اس دربار اور اس کیفیت کو کون بیان کرے اور کیوں؟ نفس گم کردہ می آید جنید وبایزید ایں جا۔ جس آستاں سے ہر زمانے اور ہر زمین کے لیے مقامِ انسانیت اور شرفِ انسانی کا منشور جاری ہوا اسی در سے دلوں کو جمالِ محبت بھی عطا ہوا۔

منحصر درد کی توفیق پہ درماں طلبی

اس ادب گاہ میں تو بڑے بڑے فضیلت والے اپنی دستار باہر دہلیز پر چھوڑ کر حاضری کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اور نہیں جانتے اور اس کی پروا بھی نہیں کرتے کہ واپسی پر یہی دستار انہیں پھر مل سکے گی یا نہیں۔ یہاں حضوری کے آداب ہی کچھ اور ہیں۔

جب دعاؤں میں ہو نکہتوں کی سی خوتب انہیں سوچنا
درد محراب جاں، آنکھ ہو با وضو تب انہیں سوچنا
ایک ہی لمحہ شوقِ بے تاب کو عمر بھر دیکھنا
التجاؤں میں ہو ایک ہی رنگ و بُو تب انہیں سوچنا

دھیان کی لہر جو اس قدم تک گئی دل کی معراج ہے
زندگی کو اجالوں کی ہو آرزو تب انہیںؐ سوچنا
وہ وقار زمیں' افتخار زماں' تاب کون و مکاں
کہکشاں جب ہو زیر قدم چار سُو تب انہیںؐ سوچنا
جن کا مداح ہے خالقِ دو جہاں' مالکِ ہر مکاں
حرف سے ماورا ہو سکے گفتگو تب انہیںؐ سوچنا

یہ سفر کوئی عام سفر نہیں ہوتا۔ یہاں حرف گفتگو ناروا ہے۔ مجھے کسی لمحہ احسان کو الفاظ کے پیرہن میں دیکھنا یا دکھانا منظور نہیں۔ اور یہ میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔

غلام گردشیں

یوم حساب کی خبر ہم نے جنیوا میں سنی۔

عالمی سیاحت کے تجربے سے سرشار و شادماں واپسی کے سفر میں جب ہم جنیوا پہنچے تو وطن کی خیر خبر کے لیے ترسے ہوئے بھی تھے۔ یورپ کے سفر میں مختلف ممالک میں قیام اتنا مختصر رہا تھا کہ پاکستانی اخبار حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے کی مہربانی سے ہمیں اپنے اخبارات بڑی آسانی سے مل جاتے تھے۔ ان دنوں امریکہ میں ہلالی صاحب سفیر تھے۔

جنیوا میں حافظ عبدالمجید سابق فنانس سکریٹری جو نہایت فرض شناس اور زیرک افسر مانے جاتے تھے ریٹائر ہونے کے بعد ان دنوں اقوام متحدہ کے ادارے سے منسلک تھے۔ نور اسلام آباد میں ان کے ماتحت رہے تھے۔ نور کے ساتھ حافظ صاحب کا سلوک بہت اچھا رہا تھا اور ان کی بیگم بھی ہمیں ہمیشہ محبت اور شفقت کا پیکر ہی نظر آئیں۔ جنیوا میں انہوں نے ہماری دعوت کی اور انہیں کے گھر ہم نے مشتِ خاک کے زعم خدائی کی خبر سنی۔ وہیں ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد پاکستانی اخبار بھی دیکھنے کو ملے۔ اس وقت تک اس مامور شدہ روزِ حساب کی تفصیل سامنے نہیں آئی تھی۔

یحییٰ خاں کے لائے ہوئے مارشل لا کی خبر ہم نے واشنگٹن میں سن لی تھی۔ اور پھر نیویارک ٹائمز میں ان کی نجی زندگی اور مشاغل کے بارے میں جس تحقیر آمیز لہجے میں تفصیل شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی پڑھی تھی۔ لکھنے والے نے کیا کچھ نہیں لکھ دیا تھا۔ سب سے بوجھل حقیقت تو یہی تھی کہ جیسے تیسے جمہوریت کے لیے راہ نکلتے نکلتے ملک ایک بار پھر ایک آمر کے شکنجے میں تھا اور آئین منسوخ ہو چکا تھا۔ ایسے میں غیر ممالک میں مقیم اہل

وطن کسی لکھے ہوئے لفظ کی چبھن اور کسی دیکھتی ہوئی آنکھ کے ترحم کو کس کرب اور اذیت کے ساتھ برداشت کرتے ہیں اس کا احساس انہیں کو نہیں ہوتا جنہیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ وطن کی آبرو عزیز ہونا چاہیے ہاں اپنے نشۂ حکمرانی کی خاطر ہی سہی۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانے میں بہرحال اقوامِ عالم میں ہمارے ملک کا وقار قائم رہا تھا۔ ان کے دَور میں ملکی صنعتوں کو بھی فروغ ملا۔ جس کے ساتھ ہی کسی ملک کی ترقّی اور عوام کی خوش حالی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ وقتی طور پر امن و امان بھی تھا اور لوگ خوش بھی تھے۔ اجالوں کے سہانے خواب دیکھنے کے لیے آس کا ایک دیا بھی کافی ہوتا ہے۔

اس پس منظر کے ساتھ مجھے اپنی امریکن میزبان سے کہا ہوا وہ جملہ یاد آرہا ہے جو میں نے زندگی میں پہلی بار غرور کے لہجے میں ادا کیا تھا اور جان بوجھ کر۔ میرے مولا کو شاید وہ چاہت اور خوش یقینی میں نہایا ہوا گھمنڈ بھی پسند نہیں آیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وطن عزیز سے انتشار اور بدامنی کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ جو ہمارے صاحبانِ اقتدار کی بے ضمیری اور بے ہنری دونوں کا آئینہ بن کر پوری دنیا کے سامنے آئیں۔ جن کی انتہا بصد سامانِ رُسوائی ایک اور مارشل لا کی ابتدا تھی۔ اس وقت یہ اندازہ تو کسی کو نہیں تھا کہ اس بار آمریت کے اندھیرے اہانت' نفرت اور خوں ریزی کے ساتھ ہزیمت بھی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔

جنرل ایوب خاں کی حکومت کا آخری زمانہ تھا جب ۶۸ء میں ہم پہلی بار واشنگٹن پہنچے تھے۔ عالمی بینک کی جانب سے ای ڈی آئی (اکنامک ڈویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ) کا ایک چھ مہینے کا کورس ہوتا تھا جس میں شرکت کے لیے مغربی پاکستان سے نور اور مشرقی پاکستان سے ثناء الحق نام زد ہوئے تھے۔

واشنگٹن میں ہمارا قیام جس عمارت میں تھا اس کا نام کنکورڈیا تھا۔ اس لفظ کے معنی اتحاد اور ہم آہنگی ہیں۔ اس عمارت میں مختلف ممالک کے مندوب قیام پذیر تھے۔ یہ جگہ

ڈاؤن ٹاؤن یعنی اندرونِ شہر کے نزدیک تھی جہاں سیاہ فام آبادی کی اکثریت تھی۔ پہلے ہی دن ہم سب مہمانوں کی مشترکہ میزبان امریکی خاتون نے (جن کا نام بھول گئی ہوں) خیر مقدمی کلمات کے ساتھ ہمیں ہدایت کی کہ شام کو چھ بجے کے بعد سڑک پر اکیلے دوکیلے نکلنے سے گریز کریں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ گھڑی اور پرس کی سلامتی تو ممکن ہی نہیں تھی۔ مقابلے کی صورت میں مہلک ہتھیار کا استعمال بھی عام تھا۔

ایک چھوٹے سے کم سرمایہ' ترقی پذیر ملک اور اسلام آباد جیسے خاموش اور محفوظ شہر سے دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند' ترقی یافتہ اور جدید علوم کی برکتوں سے بہرہ ور ملک میں پہنچ کر وہاں کے اخلاق اور انسانی رویّوں کے بارے میں سیاہ فام نسل کے حوالے سے ہی سہی۔ یہ انکشاف کم ازکم اس وقت تک کے تجربات کی روشنی میں ایسا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے ذہن میں ترقی کا مفہوم تک دُھندلا گیا۔ اور پھر اچانک ایک احساسِ تفاخر نے سر اُٹھایا۔ میں نے اپنی امریکن میزبان سے کہا۔

"ہمارا ملک ابھی ترقی کی راہوں میں بہت پیچھے ہے۔ تعلیم کا اوسط بھی بہت ہی کم ہے۔ لیکن اپنے شہروں میں ہم رات کے کسی وقت بھی بے دھڑک باہر نکل سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ہماری جان اور مال کو اس قسم کے خطرات درپیش نہیں ہوتے" میرا یہ چاہت بھرا فخر کتنا عارضی ثابت ہوا۔

اس وقت تک کراچی بھی نفرت اور عصبیت کے عفریت سے محفوظ بارود اور دھوئیں کا نہیں' رفاقتوں اور محبتوں کا شہر تھا۔ آج کی طرح اندھیروں کا نہیں روشنیوں کا دیار تھا۔ پھر اسی قیام کے دَوران میں فخر و ناز کی شکست کے مرحلے آگئے آئے۔ میری ایک نظم کے مصرعے ہیں ۔

مرے پاس کاسۂ چشم میں
کئی شب چراغ نہاں رہے
وہ تھے خاکِ راہ کا قرض بھی
وہ جو نقدِ جاں سے گراں رہے

ایوب خاں کی خارجہ پالیسی نے بے شک ملک کو عالمی سطح پر قابلِ ذکر حیثیت تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس حیثیت کو جو استحکام حاصل ہوتا وہ انہیں کی سیاسی بے بصیرتی کی نذر ہو گیا۔ اس میں بددیانتی کا دخل نہ سہی لیکن اپنے دورِ حکومت میں ایوب خاں وطن عزیز کی پاک مٹی میں کچھ ایسے بیج بو گئے جن کا تلخ پھل بعد میں ہمارا مقدر بنا۔ سب سے بڑی بدنصیبی تو ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کی ہوئی اس نظریاتی مملکت کا دو ٹکڑے ہو جانا ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کی جانب پہلا قدم وہی تھا جب ایوب خاں نے ملک کے اندر سیاست پر پابندیاں عائد کیں۔ ملک کے دونوں حصّوں میں سیاسی عمل رُک جانے کی بناء پر ہی ایسی خلیج حائل ہوئی جس سے علاقائی سیاست نے جنم لیا۔ وہ وحدتِ عمل ختم ہو گئی جس نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ان حالات میں جب ۷۰ء میں یحییٰ خاں نے عام انتخاب کروائے تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان جو دوری پیدا ہو چکی تھی وہ نوشتۂ دیوار کی طرح سامنے آ گئی۔

اس سانحے سے بہت پہلے اپنی حکومت کو قیام و دوام بخشنے کے لیے ایوب خاں نے جمہوریت کا خود ساختہ ڈانواں ڈول ڈھانچہ بھی بنیادی جمہوریت کے نام سے متعارف کیا تھا۔ جسے لوگوں نے دل سے کسی وقت بھی قبول نہیں کیا۔

دولت اور غربت کے درمیان قد آدم اونچی دیوار بھی انہیں کے دورِ حکومت میں وجود میں آئی۔ وہ تو اپنے وقت پر رخصت ہو گئے۔ لیکن یہ دیوار اونچی اور اونچی ہوتی گئی۔ دولت مند خاندانوں کی گنتی بیس بائیس سے تجاوز کر کے سیکڑوں تک پہنچی اور اسی تناسب سے عوام کا احساسِ محرومی بڑھتا گیا۔

ایوب خاں اپنے گمان و یقین کے مطابق پورے خلوص سے ملک کی خدمت کر رہے تھے لیکن وہ سیاست داں نہیں تھے۔ اور کسی وقت بھی یہ بھولنا نہیں چاہتے تھے کہ وہ حاکمِ اعلیٰ ہیں اس لیے ان کا کوئی فیصلہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ان کے حواریوں میں اتنی

ہمت تھی کہ ان کے کسی غلط اقدام یا ان کے قریبی لوگوں کے کسی بے جا رویے کی سمت اشارہ ہی کر سکیں۔ پتہ نہیں کیوں ہر صاحبِ مسندو اختیار نے پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر ہی سمجھا۔

جس زمانے میں صدر ایوب کے خلاف لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اس وقت بھی انہیں صحیح اطلاع دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت ملک میں عشرۂ ترقی منایا جا رہا تھا۔ میں نے ایوب خاں کو بہت بار دیکھا۔ شعیب صاحب کے گھر جب بھی ان کی ضیافت ہوتی ہم اس میں شریک ہوتے تھے۔ کیونکہ شعیب صاحب نے ہمارا شمار ہمیشہ اپنے افرادِ خاندان میں کیا۔ ایوب خاں کی شخصیت باوقار تھی۔ خوش خلق بھی نظر آئے۔ لیکن ہر آمر کی طرح وہ بھی اپنی ذات کے عشق میں مبتلا تھے۔ ان کی بیگم سادہ دل اور نیک خاتون تھیں اور بعد میں ملک کے سربراہ کی بیگم ہونے کے باوجود ان کے مزاج اور برتاؤ میں کسی کے ساتھ بھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

ایوب خاں کے مارشل لا کا دور ۵۸ء میں شروع ہوا۔ ملک کا آئین منسوخ ہو چکا تھا۔ اور طاقت و جبروت کے مظاہرے کے لیے پہلا ہدف پرانے تجربہ کار آئی سی ایس افسران کو بنایا گیا تھا۔ ان کی ملازمت کے قوانین میں تبدیلی کی گئی اور پھران کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے سربراہ جنرل برکی اور ممبران میں محمد شعیب اور جنرل شیخ تھے۔

غیر قانونی فیصلے تو رسمی کارروائی سے پہلے ہی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس فیصلے کی زد میں جو اہم سینئر عہدے دار آئے ان میں ظفر الاحسن لاری تھے۔ جنھوں نے تھل کے ریگستان کی شادابی کا منصوبہ بنایا تھا اور بنجر زمینیں لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ابوطالب نقوی تھے جنھوں نے لٹے پٹے مہاجرین کی آبادکاری کا کام کیا تھا۔ عباس خلیلی تھے جو سکریٹری انڈسٹریز کی حیثیت سے صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہے تھے۔ فضل احمد کریم فضلی امور کشمیر سے متعلق تھے۔ اور کچھ نام میں بھول رہی ہوں۔ جو دوسری سروسز سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سب پر نااہلی اور اپنے

عہدے کے ناجائز استعمال کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ اور فیصلہ کرنے والوں کو کسی خاص ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔

اس زمانے میں نور شعیب صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری تھے اور یہ تمام فائلیں ان کی نگاہ سے گزرتی تھیں۔ مصروفیت تو بڑھ ہی گئی تھی مگر نور ان دنوں افسردہ اور دل گرفتہ بھی رہتے تھے۔ کبھی کبھی میرے پوچھنے پر ایک آدھ جملہ مجھ سے کہہ دیتے۔ نور جانتے تھے کہ امور مملکت میں پہلی بار جو فیصلہ مصلحت اور ناانصافی کی بنیاد پر کیا جائے وہ آخری بھی ہو' ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

سرکاری ملازمین کے ساتھ اتنی مہربانی ضرور کی گئی تھی کہ اس اولین "روز حساب" کو اچھالا نہیں گیا۔ ایسا دبے پاؤں آیا کہ عام لوگوں کو چھوئے بغیر لیکن اپنے پتھریلے نقوش قدم چھوڑ کر چپ چاپ گزر گیا۔ اس سے پہلے اس طرح الزام اور التزام آمیز برطرفی کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ ایوب خاں کا یہ حکم اور یہ فیصلہ آئندہ حکومتوں کے لیے ایک ایسی نظیر قائم کر گیا جس پر بڑی پابندی سے اور ہر بار بڑے پیمانے پر زور شور سے عمل ہوتا رہا ہے۔

اگر یہ ملازمتوں کی تطہیر کا عمل تھا' جیسا کہ اسے کہا جاتا رہا ہے تو وہی افسران جو ایک دور حکومت میں قطعی پاک داماں ثابت ہو چکے ہوتے ہیں دوسرے دَور میں اتنے ہی یقین کے ساتھ آلودہ دامن کس طرح ثابت ہو جاتے ہیں۔

بندوں کی خدائی اور کبریائی کے اذیت ناک مظاہرے ہم نے نہ صرف دیکھے بلکہ کسی نہ کسی حد تک برداشت کیے ہیں۔ یہ تو صرف مولا کا کرم ہے کہ نور ہر بار اس نامۂ سیاہ سے محفوظ رہے۔ اسی کا احسان ہے کہ اپنی مدت ملازمت مکمل کرنے کے بعد انہیں اپنی ملازمت میں توسیع بھی ملی۔ لیکن ایک سرکاری افسر کی بیوی کی حیثیت سے یہ تمام واقعات اور حادثات میرے تلخ ترین تجربے کا حصہ آج بھی ہیں۔ باریک دھاگے سے بندھی ہوئی ایک تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ اور ہوائیں تند خو تھیں۔ کسی وقت بھی یہ دھاگا ٹوٹ سکتا تھا۔ اپنی آبرو بھی عزیز تھی اور بچوں کی تعلیم و پرورش کے مراحل اور

فرائض بھی سامنے تھے۔

جب متروکہ جائداد کے نام پر حصے بخرے بٹ رہے تھے میری والدہ اور نور کے والد دونوں نے ہندوستان میں صاحب جائداد ہوتے ہوئے بھی پاکستان میں کوئی کلیم داخل نہیں کیا تھا۔ ہم نے تو اس وقت بھی اپنی عرضی صرف اللہ کے حضور ہی پیش کی تھی۔ اور بے شک وہ رزاق بھی ہے' رحیم و کریم بھی اور قادر مطلق بھی۔ پرورش کرنے والا تو وہی ہے۔ اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

اجتماعی برطرفی کا سلسلہ ہر دور حکومت میں جاری رہا۔ زیادہ اذیت ناک صورت حال یہ رہی کہ طاقت و اقتدار کی نمائش اور چند افراد کی ذاتی مصلحت اور ترجیحات نے محنتی اور ایمان دار چھوٹے بڑے ملازمت پیشہ لوگوں کو جو ذہنی اور ذاتی صدمہ اور نقصان پہنچایا وہ عوام کے سامنے داد و تحسین حاصل کرنے کے لیے کسی زریں کارنامے کی طرح پیش کیا جاتا رہا۔ اور یہ ڈھنڈورا کامیاب تھا۔

اس زمانے میں ہم دونوں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تھی کہ وہ ہمارے بچوں کو سرکاری ملازمت سے محفوظ رکھے۔ شکر ہے اس نے ہمارے داماد زبیر اقبال کو بھی اس طوق سے مامون رکھا۔ زبیر کی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہونے والوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے۔ آئی ایم ایف میں اہم عہدے پر فائز ہیں اور فرائض منصبی کے سلسلے میں بھی مطمئن اور کامیاب ہیں۔

ایوب خاں کا دور حکومت امن و امان کے لحاظ سے یقیناً" اچھا رہا تھا۔ اب تو وہ بھی ایک خوشگوار خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ایوب خاں کو انسان کی زندگی اور اس کی قدر و قیمت کا پاس لحاظ بھی اتنا تھا کہ جب عوام نے ان کے خلاف مظاہرے کیے اور ان مظاہروں میں جان کا زیاں بھی شامل ہوگیا تو انہوں نے فورا" مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ صدر ایوب نے دستور کے مطابق اسپیکر کو اختیارات تفویض نہیں کیے۔ بلکہ ملک کو ایک اور مارشل لا کے حوالے کردیا۔ جنرل یحییٰ خان کو' جن کے مشاغل ڈھکے چھپے نہیں تھے' اپنا جانشیں مقرر کیا۔ بعد میں یہ تقرر کچھ یوں نظر آیا

جیسے انہوں نے اپنے معزول ہونے کا انتقام پوری قوم سے لیا ہو۔ مشرقی پاکستان کا سقوط کچھ کم اندوہ ناک سانحہ نہیں تھا۔

جون ۶۹ء تھا جب دل میں سو اندیشے اور ذہن میں ہزار وسوسے لیے ہوئے واشنگٹن میں قیام اور اپنے عالمی سفر سے ہم واپس وطن پہنچے۔ سرکاری عہدے داروں کے احتساب کا اعلان ہو چکا تھا۔ جسے تطہیر کہا جا رہا تھا۔ اس بار ان کی اہلیت کے ساتھ ان کی دیانت اور کردار کو بھی اس خود ساختہ میزان پر رکھا گیا تھا۔ رشوت ستانی کا الزام بھی شامل تھا۔ اخبارات حکومت وقت کے اس اقدام کی تعریف اور توصیف کا فریضہ بڑے انتظام اور انصرام سے ادا کر رہے تھے۔ پورے ملک میں گھر گھر سب کو معلوم تھا کہ یہ اعمال نامہ بھرنے کے لیے کس کس کے ہاتھ میں تھمایا گیا ہے۔

ایسے میں اپنے گھر میں اپنے نوجوان بچوں اور نوکروں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے بھی ایک کرب انگیز شرمندگی کا احساس نشتر بن کر چبھتا رہتا تھا۔ کہ شاید اس فارم کا وصول کرنا ہی ان کی نگاہوں میں ہمیں مجرم کے بھیانک روپ میں پیش کر رہا ہو۔ اس سے زیادہ زہر بھرا شاید کوئی نشتر نہ ہو۔ کہ آدمی اپنی اولاد اور اپنے نوکروں کی نگاہوں میں خود کو بے وقعت فرض کر لے۔ یہ محض اپنا مفروضہ' اپنا گمان ہی سہی' وقتی ہی سہی مگر ایسا وقت جاں کنی کے عالم میں کٹتا ہے۔ یہ وقت مجھ پر بیتا ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ اپنے اس دکھ کا اظہار بھی اور سارے گلے شکوے بھی میں صرف اپنے محبوب وطن سے ہی کر سکتی تھی۔ میری کئی نظمیں ہیں جن میں اس بے چارگی اور دکھ کا اظہار ہوا ہے "نا پشیماں"' "لہو لہو راستے"' "گواہی"' "میری مجبور وفا" وغیرہ۔ اور یہ صرف سرکاری ملازمین کی بات نہیں ہے آمریت کے دور میں بے بسی کے موسم تو مختلف لباسوں میں بھی اہل وطن کے لیے آتے رہے ہیں۔

جو فارم نور کے پاس حکومت کی طرف سے پہنچا تھا وہ اتنے الجھے ہوئے اور الجھا دینے والے انداز میں ترتیب دیا گیا تھا کہ اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس وقت جتنے بے گناہ "گناہگار" تھے ان سب کا ایک ہی حال تھا۔ کہ کبھی اپنے

اثاثوں پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ نہ کچھ چھپایا تھا نہ کوئی رسید سنبھال کر رکھی تھی۔ میں ذکر اس فارم کو وصول کرنے والی اکثریت کا کر رہی ہوں۔ بقیہ اصحاب کو تو ہم نے ہمیشہ پھلتے پھولتے ہی دیکھا۔

اس فارم میں اپنے' اپنی بیوی اور والدین کے مال و متاع کی تفصیل قیام پاکستان کے بعد سے سال بہ سال کے حساب سے درج کرنا تھی۔ اگر اس پوری مدت میں ایک ہزار روپے سے زیادہ مالیت کی کوئی چیز خریدی یا فروخت کی گئی ہے تو اس کی رسید بھی پیش کرنا تھی۔ اس کے علاوہ اثاث البیت کی مکمل مالیت لکھنا تھی۔ جس میں فرنیچر ہی نہیں پہننے کے کپڑے بھی اور دروازوں کے پردے اور باورچی خانے کے برتن بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ غلط بیانی جرم بن جاتی اور گھر کے تمام سامان کی مجموعی قیمت بالکل درست کس طرح معلوم کی جائے یہ ترکیب کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ حال ان سب کا تھا جو بددیانتی اور بے ایمانی کے رازوں سے آگاہ نہیں تھے۔ نہ ایسے وقتوں کے لیے کوئی اصلی نقلی رسید ہی سنبھال کر رکھی گئی تھی۔ بینک کا حساب پیش کر دینا تو خیر آسان تھا۔ زیور کی قیمت کا صرف تخمینہ ہی لگایا جا سکتا تھا جو بڑی آسانی سے غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس فارم میں اور بھی بہت سے الجھاوے تھے۔

جب اس جبریہ سبک دوشی کی فہرست سامنے آئی تو اس میں وہ نام بھی شامل تھے جن کے اعلیٰ کردار اور ملکی خدمات کو ہرگز کسی گواہی یا ثبوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دور اور نزدیک کے ساتھیوں کو اتنا تو معلوم ہی ہوتا ہے۔ اور اس فہرست میں ایسے نام بہت تھے۔

آئندہ حکومتوں کے شوقِ تطہیر کی ایک مضحکہ خیز صورت یہ بھی سامنے آئی کہ برطرف ہونے والوں میں ان کے نام بھی موجود تھے جو پہلے ہی اپنی مدت ملازمت ہی نہیں اپنی عمر کی مدت بھی پوری کر چکے تھے۔ یہ نام چند ہی سہی مگر کسی اخبار کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مرے ہوئے لوگوں کی سرکاری ملازمت سے برطرفی کا ذکر کرے۔ یا اس کی جانب اشارہ ہی کرتا۔

یحییٰ خاں کے زمانے میں سرکاری عہدہ داروں کو برطرفی کے حکم نامے رمضان کے آخری عشرے میں عید سے چند روز قبل وصول ہوئے۔ اس برطرفی کے لیے تین سو تین کی گنتی مقرر ہوئی تھی۔ تھری ناٹ تھری (جو ایک قسم کی رائفل کو کہتے ہیں) ایک مطلق العنان آمر کی طاقت کی علامت۔ ان لوگوں کو پنشن کے حق سے بھی محروم کردیا گیا۔

ایک عرصہ گزر جانے کے بعد پنشن کے مستحق افراد نے سروس ٹریبونل میں اپیل کی جو منظور ہو گئی۔ اور ان کا حق مان لیا گیا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کا زمانہ تھا۔

ہم نے آمریت کے کیا کیا نمونے دیکھے ہیں۔ ضیاء الحق میں بظاہر تکبر نہیں تھا۔ خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ لیکن ان تین سو تین افسران کی برطرفی کا فیصلہ چونکہ ایک مارشل لا ڈکٹیٹر نے نافذ کیا تھا اس لیے حکومت نے سروس ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی اور مقدمہ ہار گئی۔ اس کے بعد ایک آمر کے فیصلے کی توثیق کی خاطر ضیاء الحق نے دستور میں ترمیم کی اور سروس ٹریبونل کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا گیا۔ یحییٰ خاں رخصت ہو چکے تھے مگر مارشل لا کی برتری موجود تھی۔

سید سعید جعفری اس سلسلے میں ضیاء الحق سے ملنے گئے۔ انہوں نے نہایت اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ صبر سے سعید بھائی کی باتیں سنیں پھر کہنے لگے "اب تمام دروازے بند ہو چکے ہیں"

سعید بھائی نے کہا "ابھی اللہ کی عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جو کبھی بند نہیں ہوتا۔ اب انصاف وہیں ہو گا۔"

اس جواب پر انہوں نے کسی ناخوشی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ان سب کی پچیس سال اور اس سے زیادہ مدت ملازمت کی پنشن بحال کرنا انہیں ہرگز منظور نہیں تھا۔

یحییٰ خاں کا ہی دور آمریت تھا جب اخباروں میں نوکر شاہی کا لفظ خاص طور پر بڑے تسلسل اور تواتر کے ساتھ استعمال ہونا شروع ہوا۔ کسی جماعت یا گروہ میں تمام لوگوں کے اعمال و افعال یکساں نہیں ہوتے۔ ہو ہی نہیں سکتے۔ مگر یہاں تمام آئینوں میں ایک

ہی رُخ دیکھنے پر اصرار تھا۔ مجھے کسی کی طرف داری مطلوب نہیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ جہاں جہاں رویّوں میں تکبّر کی خُو'بو آئی وہاں اس کے پیچھے کئی عوامل کار فرما تھے۔ بہت سی وجوہ تھیں۔ مجبوری نہ سہی ترغیبات تو تھیں۔

ایوب خاں کے دورِ حکومت سے پہلے جس قسم کی غیر جمہوری جمہوریت ملک میں جاری رہی تھی اس نے سرکاری ملازمین میں اپنی اہمیت کا احساس غیر ضروری حد تک اُجاگر کر دیا تھا۔ حکومتوں کی ناپائیداری اور بار بار تبدیلی۔ چند ریگر تو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر صرف تین مہینے ہی رہے۔ ایسے میں سرکاری افسران کا یہ فرض کرلینا تعجب خیز نہیں کہ حکومتی ڈھانچہ تو آنی جانی شے ہے۔ وزیر آتے ہیں اور جس محکمے کی سربراہی انہیں سونپی جاتی ہے ابھی اس کے کوائف سے مکمل آگاہ بھی نہیں ہوتے کہ چلے جاتے ہیں۔ اس لیے نظامِ مملکت کا استحکام صرف انہیں لوگوں کے علم اور تجربے اور انہیں کی موجودگی پر منحصر ہے۔ یہیں سے وہ مزاج پیدا ہوا جسے نوکر شاہی کہا گیا۔ اور جس نے ملک کو نقصان بھی پہنچایا۔

جب ایوب خاں کے ہاتھوں اچانک برطرفی کی رسم شروع ہوئی اور بڑی شدومد سے اگلی حکومتوں میں جاری رہی جس کے لیے بے ایمانی' نااہلی اور رشوت ستانی کے عذر تراشے گئے تھے تو سب ہی فکر مند ہوئے۔ اور آئندہ کارِ منصبی انجام دیتے ہوئے تذبذب کا شکار بھی رہے۔ اب ایک مسلسل غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ کیونکہ کسی بار بھی برطرفی کے فیصلے کرنے والوں کو کسی خاص ثبوت کی احتیاج ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ اندھیرے اور اجالے ایک ہی سلوک کے مستحق کیوں ٹھہرتے۔ سرکاری ملازمین کی کارکردگی بھی متاثر ہوئی جسے سرخ فیتے کا چکّر کہا گیا۔

ملازمتوں کا تحفظ ختم ہو جانے کے بعد کسی اندیشے کو مکمل طور پر رد کردینا امکان میں نہیں رہا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کب اس کا نام اس فہرست میں شامل کیا جائے گا۔ ہر دورِ حکومت میں یہ اعصاب شکن صورت حال بڑھتی چلی گئی۔ اور آبروؤں کے قتل نامے بڑی فراخ دلی سے تقسیم ہوتے رہے۔

جس تشویش کی دنیا میں ہم جی رہے تھے اس کا اندازہ عام آدمی نہیں کر سکتا۔ تشویش اپنے سکھ کی بھی تھی اور اپنی ساکھ کی بھی۔ کیونکہ ایسے مواقع پر عام شاباشی حاصل کرنے کی فضا بھی ہمیشہ پہلے سے تیار کرلی جاتی تھی۔ شخصی حکومت میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔

غالباً ۱۹۷۱ء تھا۔ نور وزارتِ خزانہ میں ایڈیشنل سکریٹری تھے۔ ایک معروف مغنیہ اپنے طائفے کے ساتھ ٹوکیو جارہی تھی۔ اور اپنے ساتھ ہی پورے طائفے کے لیے وزارتی مراعات، سفر خرچ اور الاؤنس کی خواہش مند تھی۔ یہ فائل نور کے پاس پہنچی۔ نور نے محترمہ کے لیے درجہ اوّل اور طائفے کے لیے درجہ دوم کے افسران کی مراعات و اخراجات کی منظوری لکھ کر فائل متعلقہ وزارتِ ثقافت کو بھیج دی۔ اگلے ہی دن صدر یحییٰ خاں کے سکریٹری عبدالقیوم کا فون آیا کہ صدر صاحب اس فیصلے پر ناراض ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اس پر فوراً نظرِ ثانی کی جائے۔ فائل واپس آگئی جسے لے کر نور اے جی این قاضی صاحب کے پاس گئے جو وزارتِ خزانہ کے سکریٹری تھے۔ قاضی صاحب نے نور کے فیصلے کی توثیق کردی۔ قیوم صاحب نے استفسار کیا تو نور نے بتادیا کہ فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ قاضی صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ قواعد و ضوابط کے مطابق محترمہ اس سے زیادہ مراعات کی حق دار نہیں ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ قیوم صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ صدر صاحب پوچھ رہے ہیں کہ اس فیصلے کا ذمہ دار کون افسر ہے اسے برخاست کردیا جائے۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ اب تم اس فائل کو لے کر مشیرِ مالیات ایم ایم احمد صاحب کے پاس جاؤ اور ان کی ہدایت حاصل کرو۔

ایم ایم احمد صاحب نے فائل دیکھی۔ نور سے سوالات کیے اور یہ فیصلہ کیا کہ ضابطے کے اندر رہتے ہوئے مغنّیہ کی فرمائش پوری نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اتنی رعایت کردی جائے کہ اصول کے مطابق جو اخراجات منظور کیے گئے ہیں اس کی مجموعی رقم دس فیصد اضافے کے ساتھ محترمہ کو دے دی جائے۔ اور پھر اسی فیصلے پر عمل ہوا۔

اس تمام واقعے میں تین چار دن لگے۔ نور نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ چھٹی ملنے کے آثار نظر آرہے ہیں۔ تم سامان باندھنے کے لیے تیار رہو۔ اگر نور کے سینئر افسران نور کا

ساتھ نہ دیتے اور ضوابط و قواعد کو بالائے طاق رکھنے پر آمادہ ہو جاتے تو نور کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سرکاری ملازمت کا تحفظ ہی نہیں اس کی حیثیت بھی ختم ہو چکی تھی۔

ایک واقعہ صدر ضیاء الحق کے زمانے کا یاد آگیا۔ وہ کبھی کبھی سینئر وفاقی افسران کو حکومت کے مسائل اور افسران کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے میٹنگ کیا کرتے تھے۔ ایک بار پلاننگ کمیشن کے آڈیٹوریم میں وفاقی سکریٹری اور ایڈیشنل سکریٹری جمع تھے۔ صدر اپنی حکومت کے مسائل بیان کر رہے تھے۔ نور اس زمانے میں اسٹیبلشمنٹ سکریٹری تھے اور انہیں کے ماتحت تھے کہنے لگے حکومت کا کام کیسے چلے۔ یہ سامنے جعفری صاحب بیٹھے ہیں۔ میں ان سے کوئی کام کرنے کو کہتا ہوں تو کہہ دیتے ہیں کہ قانون کے اندر رہ کر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ آپ اگر قانون میں تبدیلی کر دیں تو میں آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔

نور نے یہ قصہ مجھے سنایا تو میں نے کہا کہ اب آپ کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ نور کہنے لگے سرکاری ملازم کا اوّلین فرض ملک کے قانون کی پیروی ہے۔ میں اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں کہ صدر مملکت نے بھری محفل میں میری اس امانت داری کا اقرار کیا۔ آگے جو کچھ بھی ہو۔

شخصی حکومت میں ضابطے اور قانون کے مطابق پوری دیانت داری کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا آسان نہیں رہا تھا۔ ایسے میں جو لوگ سرکاری ملازمتوں اور ساتھ ہی اپنے اعلیٰ عہدوں کو جھیل گئے بس کوئی معجزہ ہی لگتا ہے۔

میں تو بس اتنا ہی جانوں
جب بھی اس کا نام لیا ہے
اس نے بڑھ کر تھام لیا ہے
آس نراس کے سارے بندھن
آنکھ کا آنسو، دھیان کا چندن

خوشیوں کے سب محل دومحلے
زخموں کے سب گہنے گجرے
میں نے اس کو سونپ دیے ہیں

کہانیاں مہ و سال کی

راولپنڈی اور اسلام آباد میں ہم کم و بیش تیس سال رہے۔ بیچ بیچ میں نور کے تبادلے بھی ہوئے لیکن مختصر مدت کے لیے۔ اور ہم ہربار واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔ جہاں سیاست اور حکومت کے سبھی موسم دیکھے بھی اور جھیلے بھی۔ وہاں ہم نے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نور نے اپنی وفاقی ملازمت کے باعث چار حکمرانوں کا دور حکومت کچھ زیادہ ہی نزدیک سے دیکھا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں' جنرل یحییٰ خاں' ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق۔ کیا دیکھا اور کیا دیکھنے کی خواہش ہی رہی یہ سب پاکستان کی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

ذہنی اور جذباتی طور پر اسلام آباد میں ذاتی دکھ میں نے ایک ہی برداشت کیا۔ وہ زہریلا دکھ جو ایک آمر کی آزار پسند ذہنیت کا آئینہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں نخوت حکمرانی کے سامنے انسان کی عزت نفس کے ساتھ ساتھ انصاف کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ فیصلہ تین سو تین افسران کے خلاف ہوا تھا جن میں دیانت دار بھی تھے۔ صاحب کردار بھی۔ مگر کرب اور اذیت میں تو سبھی مبتلا رہے تھے۔ یحییٰ خاں کا دور ہماری پوری قومی تاریخ میں اندھیرا اور اندھیرے ہی کا دَور تھا۔

میں اسلام آباد میں گزارے ہوئے اچھے دنوں کو یاد رکھنا چاہتی ہوں۔ راولپنڈی اور اسلام آباد سے میرے بڑے قریبی رشتے رہے ہیں۔ اس ہوا میں میرے تینوں بچوں کی ہنسی کی آواز آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ عزمی اور عامر لاہور میں پیدا ہوئے۔ مگر ان دونوں کے بچپن کی دلربائیاں اور شوخیاں بھی انہیں فضاؤں میں محفوظ ہیں۔ اسی شہر میں صبیحہ کی شادی کی شہنائی کا نغمہ ہمارے دل میں گونجا اور ہماری آنکھوں نے سنا۔ اور

جب جہاز اسے لے کر امریکہ روانہ ہوا تو میں نے نظم "رخصت" لکھی۔

"اے مہماں آہستہ جا۔"

ان دنوں ہم اسلام آباد کے ایف سکس تھری سیکٹر میں رہتے تھے۔ ایک مختصر سی سڑک کے دونوں طرف مکانوں کی قطاریں تھیں۔ اس شہر میں جو سرکاری رہائش گاہیں تعمیر کی گئی تھیں ان سب کا رُخ اور عموماً" نقشہ بھی ایک تھا۔ بس کمروں کی تعداد اور سائز میں فرق تھا اور وہ مکین کے عہدے اور گریڈ کے لحاظ سے خاص طور پر رکھا گیا تھا۔ اسی لیے تو صادقین نے کہا تھا کہ یہاں مکانوں کے بھی گریڈ ہیں۔

ہمارے سامنے والے گھروں میں زیادہ تر بنگالی خاندان تھے۔ اتنا قرب کہ روز ہی کسی نہ کسی بہانے ملاقات ہو جاتی۔ سب ہی یگانگت سے ملتے تھے۔

پڑوس کے مکانوں میں بھی عزیز دوست رہتے تھے۔ ہمارے قریب ترین پڑوسی ایک جانب شیخ عبدالرؤف (فنانس سکریٹری) اور نسیم اور دوسری طرف اعظم علی (ایڈیشنل سکریٹری دفاع) اور فریدہ تھے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ یعنی دھوئیں کا ساجھا تھا۔ اور محبت کی عمل داری۔

فریدہ عمر میں مجھ سے چھوٹی مگر برتاؤ میں بڑی بہن تھیں۔ ہر وقت مدد کرنے کو تیار۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ عامر اپنے بہن بھائی دونوں سے بہت چھوٹے تھے۔ صبیحہ اور عزمی اسکول اور کالج چلے جاتے اور گھر میں عامر ہوتے اور ان کی شرارتیں۔ ایک دن تو گھر میں آگ لگانے کی کوشش بھی کی۔ اتفاقاً" میں نے دیکھ لیا۔ سرزنش کی تو بڑی معصومیت سے کہنے لگے "اماں آگ بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کی گاڑی آجائے گی۔ اس کی گھنٹی کی آواز کتنی اچھی ہوتی ہے۔"

وہ فریدہ ہی تھیں جنھوں نے بڑی حد تک عامر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔ عامر فریدہ کے بچوں کے تقریباً" ہم عمر تھے اس لیے ان کی ہر قسم کی شرارتوں کا مرکز بھی زیادہ تر فریدہ کا گھر ہی ہوتا۔ مثلاً" ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا کُشن ان بچوں کے ہاتھ میں آتے ہی گیند کا روپ دھار لیتا۔ کبھی صوفے ریل گاڑی بن جاتے۔ اور فریدہ خوش

رہتیں۔ عامر گھر آکر مجھے اپنے اور دوستوں کے کارنامے فخریہ سناتے تو میں فریدہ کو فون کرکے معذرت کرتی۔ جس کے جواب میں وہ کہتیں "آپ کیوں خیال کرتی ہیں یہ سوچ لیجیے کہ میرے چار کے بجائے پانچ بچے ہیں۔" اور یہ روزانہ کا معمول تھا۔

شیخ عبدالرؤف اور نسیم جیسے پڑوسی بھی کم ملتے ہیں۔ اچھے دوست نصیب ہوں تو صبح و شام کے رنگ میں نکھار آجاتا ہے۔ نسیم سراپا خلوص ہیں مگر مشکل یہ تھی کہ ان کی محبت روزانہ ملاقات کا تقاضہ کرتی۔ اور میں ان کی ہر روز کی کافی پارٹی میں کبھی کبھار ہی شریک ہوتی۔ یہی وقت تو میں اپنے ساتھ بسر کرتی تھی۔ اس لیے نسیم میری شاعری سے بہت خفا رہتی تھیں۔ میری دو کتابیں "شہر درد" اور "غزالاں تم تو واقف ہو" اسی گھر میں مکمل ہوئیں اور اسی دوران میں شائع ہوئی تھیں۔ میں مصروف رہتی تھی۔ ان گھروں میں تقریباً "گیارہ سال ہم لوگ ساتھ رہے ہیں۔ چوتھا شعری مجموعہ "ساز سخن بہانہ ہے" کراچی میں ترتیب دیا گیا۔ یہاں میری مصروفیت کی شکایت کرنے والا کوئی نہیں ملا۔

صبیحہ کی شادی کے دنوں میں ایف سکس تھری سیکٹر میں ہمارے گھر کے ساتھ اور قریب جتنے مکان تھے ان سب کے گیسٹ روم میں ہمارے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ اکبر عادل نے اپنی پوری کوٹھی ہمارے مہمانوں کے قیام کے لیے دے دی تھی۔ رووف بھائی نے اپنے اور ہمارے گھر کے درمیان جو دیوار تھی اس میں ایک دروازہ بنوا دیا تھا۔ تاکہ کسی موقع پر کسی قسم کی دشواری یا کوتاہی نہ ہو۔ مہندی کے دن خواتین ہمارے گھر میں تھیں اور مرد ان کے گھر میں۔

جس شہر میں صبیحہ پیدا ہوئی تھی۔ جہاں اس کی پہلی سالگرہ ہوئی تھی نور کے تبادلوں کے باوجود خدا کے فضل و کرم سے اسی شہر میں اس کی شادی کی تقریب بھی منعقد ہوئی۔ اور جو لوگ اس کی پہلی سالگرہ میں شریک ہوئے تھے وہ دوسرے شہروں سے آکر اس کی شادی میں بھی شریک ہوئے۔ رشتہ داروں کے علاوہ ہمارے دوستوں نے لاہور' پشاور' کراچی سبھی شہروں سے آکر ہماری خوشیوں میں اضافہ کیا۔ مجھے یاد آرہا ہے مہندی کے دن رؤف بھائی تمام انتظامات کی دیکھ بھال میں مصروف تھے اور صادقین اپنی تمام بے

نیازیوں اور نیازمندیوں کے ساتھ شائقین میں "بسم اللہ" کے تحفے لکھ لکھ کر بانٹ رہے تھے۔ ان سب کے جذبہ خلوص کا احترام اور اعتراف کرنے کو جی چاہا اس لیے صبیحہ کی شادی کا ذکر کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

صبیحہ کی شادی کے دو سال بعد عزمی کو بھی امریکہ رخصت کرنا پڑا۔ اس رات میں نے اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر جو نظم کہی تھی اس کا عنوان ہے "وداع کی گھڑی سہی" عزمی کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر یہ جدائی بھی ناگزیر تھی۔ خدا کا شکر ہے عامر نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

میں اپنے بچوں کی بارے میں کچھ لکھنا چاہوں تو الفاظ بہت کم داماں نظر آتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی تصویر بنانے کے لیے کون سا رنگ سب سے زیادہ جچتا ہے۔ وہ تو راحتوں کے سبھی رنگ لے کر ہماری زندگی میں آئے ہیں۔ گرمیوں میں گھنیری چھاؤں اور سردیوں میں گلابی دھوپ۔ ہمارے سبھی موسموں کا رچاؤ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے بچوں کے نام ہے۔

عزمی کی شادی کے وقت تک ہم لوگ کراچی آ گئے تھے۔ اب عزمی اور شعاع بھی امریکہ میں ہیں اور صبیحہ اور زبیر بھی۔ امریکہ میں تو آج میرے کئی محبوب رہتے ہیں۔ میرے بچّے اور ان کے بچے۔ میرے پاس ہجر و فراق کے مضمون تو میرے بچوں ہی کے تعلق سے ہیں۔ یہ دوریاں ہیں بھی یا نہیں یہ کہنا مشکل ہے۔ میری صبیحہ کے تینوں بچے صباح، یوسف اور سمیرا اور میرے عزمی کے بچے فائز اور عازم بھلا مجھ سے دور کہاں ہیں۔ وہ تو ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہی رہتے ہیں۔

میری صباح اپنی کم سنی کے باوجود اس دوری کو زیادہ ہی محسوس کرتی رہی ہے۔ ہم اپنے دل کو یہی تسلّی دیتے رہتے ہیں کہ وہاں تعلیمی ماحول بھی بہتر ہے اور تعلیم کا معیار بھی۔ وہاں چھوٹے بچوں کی ذہانت کو پنپنے کے مواقع بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔ ہماری تہذیب کے جو قابلِ قدر رخ وہاں کے ماحول میں نہیں ہیں وہ کم از کم ان کے اپنے گھروں میں تو موجود ہیں۔ اور وہاں تدریسِ دین کے ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ جن شہروں

میں مسلمان تارکینِ وطن آباد ہیں وہاں یہ ادارے بھی موجود ہیں۔

میری ایک نظم کا عنوان ہے "اس کو نزدیک آنے نہ دو" یہ طویل نظم اپنے بچوں کے علاوہ نئی نسل کے ان سب بیٹوں اور بیٹیوں کے نام ہے جنھیں روزی کی تلاش نے پردیسی بنا دیا ہے۔ جو چراغاں چراغاں شہروں میں اپنے گلی کوچوں کی سانولی سلونی تصویریں اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے ہیں۔ اور پیچھے ان بچوں کو تسلی دیتی ہوئی ماں ہے ---- جدائی تو عفریت ہے ---- اس کو نزدیک آنے نہ دو ---- فاصلے دُوریاں کچھ نہیں ---- تم مرے پاس ہو میں تمہارے قریں ---- ہے وہاں جیسے دیپک کی لو اور یہاں روشنی ----

اور پھر یہی دوری اور جدائی کا احساس دل کو ڈسنے بھی لگتا ہے۔ ایک نظم ہے۔

بڑھتے ہوئے سائے

اب لوٹ آؤ
دیکھو کہ تمہارے نقشِ قدم
بھیگی ہوئی گھاس کے سینے پر
اس وقت نمایاں ہیں
دیکھو کہ گلوں کے چہرے بھی
کرنوں کی تپش سے ترساں ہیں
سوچو کہ نسیمِ دَوراں کو
آخر تو چال بدلنا ہے
سوچو کہ ابھی دن ڈھلنا ہے
ایسا نہ ہو مڑ کر دیکھو تو
خود اپنی نگہ انجان لگے
اِک نقشِ قدم رہبر نہ بنے

ایسا نہ ہو گھر کی راہوں میں

یادوں کے ہزاروں ڈھیر ملیں

اس ڈھیر میں اپنے کُوچے کو

تم جان نہ پاؤ

لَوٹ آؤ

ایسا نہ ہو آنسو دُھول بنے

اس دُھول میں گھر کے آنگن کو

پہچان نہ پاؤ

لَوٹ آؤ

ہاں اس کا بھی امکان تو ہے

جب رات پڑے

کجلائے ہوئے دیوٹ پہ دیا

جلتا نہ ملے!

دھیان کی لہریں اپنے بس میں کہاں ہوتی ہیں۔ محبتیں کب کسی فلسفۂ حیات کی تابع ہوئی ہیں۔ ذہن کیا نہیں سوچتا اور دل کیا نہیں چاہتا۔ مگر ایک موجود حقیقت یہی ہے کہ میرے وہ بچّے جو فی الحال دور دیس میں رہنے پر مجبور ہوئے مجھ سے کسی طرح بھی دور نہیں ہیں۔

اور اب تو میری ایک اور بیٹی بھی دعاؤں کے راحت آفریں جواب کی طرح میرے گھر اور میری زندگی میں آگئی ہے۔

ہمارے لیے وہ بہت روشن دن تھا جب عامر نے اپنی میڈیکل کی تعلیم مکمّل ہونے کے بعد پاکستان ہی میں رہنے بسنے کا فیصلہ کیا۔ جبکہ بھائی بہن دونوں امریکہ میں ہیں اور ان کے کالج کے ساتھی اور عزیز دوست بھی امریکہ جا رہے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ عامر

کبھی پشیمانی کے دکھ سے آشنا ہو۔ اس لیے فیصلے کا پورا اختیار اپنے بچے کو دے دیا تھا۔ لیکن اس نے تمام وسائل اور سہولتیں ہوتے ہوئے بھی اپنے وطن میں رہنے کو ترجیح دی۔ یہ عامر کے لیے بہت بڑا اور ہمارے لیے نہایت قابل قدر فیصلہ تھا۔

عامر کی شادی کے بعد ہمارے گھر کی رونق بھی واپس آگئی۔ ماہا کو ہماری زندگی میں شامل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر لگتا ہے کہ وہ کبھی ہم سے الگ نہیں تھی۔ صرف دعاؤں ہی میں نہیں ہمارے شب و روز میں بھی خوشبو کی طرح پہلے ہی کہیں نہ کہیں موجود تھی۔

ماہا جرمنی میں پلی بڑھی۔ وہیں اسکول سے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی۔ اور ہماری اقدار کی پاسداری کے لحاظ سے خالص پاکستانی اور مشرقی لڑکی ہے۔ عموماً" مغربی ممالک میں آنکھ کھولنے والی نسل اپنی تہذیب سے اتنی قربت کہاں رکھتی ہے۔ یہ اس کے اپنے مزاج کی خوبی بھی ہے اور اس تربیت کا نتیجہ بھی جو اسے اپنے ماں باپ سے ملی۔ رفیعہ بہن اور ڈاکٹر لائق علی اب بھی جرمنی میں رہائش پذیر ہیں۔ دونوں نیک طبع ہیں اور مخلص۔ محبت کرنا بھی جانتے ہیں محبت کی قدر کرنا بھی۔

ماہا کی آمد سے پہلے ہم دونوں کس قدر اکیلے تھے اس کا احساس تو گھر میں اس کی موجودگی کے بعد ہی ہوا۔ عامر آغا خاں اسپتال میں دن رات مصروف۔ خواہش کے باوجود ہمارے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکتے تھے۔ گھر تو بالکل ہی چپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب یہاں ماہا کی مسکراہٹ بھی باتیں کرتی ہے۔ اس کے بے ساختہ قہقہے اجالے بکھیر دیتے ہیں۔ سنتے آئے تھے کہ "بہو بے زباں ہی 'بھلی" میری بیٹی ماہا ہفت زباں ہے اور گفتگو صرف محبت کی زبان میں کرتی ہے۔

کچھ خوبصورت لوگ اور بھی ہیں جن کا تعلق میری شاعری سے نہیں لیکن میری زندگی کے ہر رنگ سے رہا ہے۔ اختصار کے ساتھ ہی سہی چند الفاظ ان محبتوں کے نام بھی لکھنا چاہتی ہوں جن کی موجودگی سے گردوپیش کا حُسن اور وقار قائم رہتا ہے۔ شاید انہیں صداقتوں نے مجھے ادب کی روایتی مصلحتوں سے بے نیاز رکھا۔

میں اپنے اور نور کے بھائیوں اور بہنوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ ان میں محمد حسن اور سعیدہ جعفری بھی ہیں، خالدہ اور معین عبّاسی بھی ہیں کچھ کا ذکر پہلے آچکا ہے اور آنا ہی تھا۔

اب جو سب نام لکھوں تو فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔ محبت کرنے والوں کے نام تو دل پر تحریر ہوتے ہیں۔ اور یہی ان کا حق بھی ہے۔

نور کے پھوپھی زاد اور حقیقی بہن بھائیوں میں ہمارے یہاں کوئی تفریق نہیں ہے۔ اپنے اپنے الگ گھروں میں اور مختلف شہروں میں رہتے ہوئے بھی ہم سب ایک مشترکہ خاندان کی حیثیت سے رہے۔ جیسے ایک ہی حویلی میں رہتے ہوں۔ یہی قرینے آج تک جاری ہیں۔ احترامات بھی دلداریاں بھی۔ ایسے خوش نصیب خاندان اب بہت کم نظر آتے ہیں۔

۸۰ء میں نور کا تبادلہ کراچی این آئی ٹی کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ پھر ریٹائر ہونے کے بعد اسی عہدے پر ان کی مدتِ ملازمت میں توسیع بھی ہوئی۔ اس کے بعد دس سال تک چیئرمین پاکستان براماشیل کے عہدے پر فائز رہے۔ اور دس گیارہ سال سے صدر انجمن ترقی اردو کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سو آخر کار کراچی ہی اپنا ٹھکانا ٹھہرا۔ پہلے پہل قیامِ پاکستان کے دنوں میں بھی اسی شہر نے ہمیں پکارا تھا۔ مجھے یاد ہے ۴۸ء میں جب کراچی پہنچی تھی تو نئے وطن کا خیر مقدم کرنے کی سرشاریاں بھی ساتھ تھیں۔ اور اپنی ذاتی نئی زندگی کے حوالے سے دل میں کچھ شوق بھی تھا اور کچھ خوف بھی۔ خوف اس لیے کہ اس وقت تک میرے بھائی بہنوں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا تھا۔ امی بھی ہندوستان میں تھیں۔ اور مجھے سسرال گھر میں جن لوگوں کے ساتھ رہنا تھا ابھی ان کے مزاج سے قطعی ناآشنا تھی۔ مگر ساتھ ہی آنکھوں میں طلوع ہوتے ہوئے دنوں کے خواب بھی بسے ہوئے تھے۔ گھبرا بھی رہی تھی اور مطمئن بھی تھی۔ کراچی شہر بھی اپنے ان دنوں کی بے سروسامانیوں کی باوجود پر کشش تھا۔ میرے لیے ساحل سمندر بڑی افسانوی سی حقیقت رکھتا تھا۔ ابھی تک کتابوں ہی میں

سمندر کو دیکھا تھا۔ وہیں اس کی نرم مزاج لہروں کے سہاگ گیت سنے تھے۔ وہیں اس کی نوحہ گری دیکھی اور وہیں بپھری ہوئی موجوں کے غیظ و غضب کا نظارہ بھی کیا تھا۔ لیکن ۴۸ء میں سمندر سے میری پہلی ملاقات بڑے اداس لمحوں میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اچانک دوری کی علامت بھی بن گیا تھا۔

نور مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی لے گئے تو اپنی زندگی کے ایک جانے پہچانے رخ سے نئی نئی جدائی اور دوری کا یہ احساس بھی ختم ہو گیا۔ وہاں من مانے دوست تھے اور ہم تھے۔ وہ چھوٹا سا شہر تھا اور اس کے تمام رنگ ہمارے نام تھے۔ وہ مختصر سا حلقۂ احباب اور وہ دَوران روز و شب ہماری پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ نیا شہر تو بعد میں آباد ہوا۔ ہمارے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع ہوا مگر آج تک میرے تصوّر میں راولپنڈی اور اسلام آباد الگ الگ نہیں ہیں۔

مستقل رہنے کے لیے کراچی مجھے کبھی پسند نہیں تھا۔ کچھ دنوں کے لیے آتی تو اس شہر کی گہما گہمی اچھی لگتی تھی۔ مگر کراچی کا مزاج کبھی میں سمجھ ہی نہیں سکی۔ یوں بھی اس ایک شہر میں کئی صوبے آباد ہیں اور اپنی اپنی علیحدہ شناخت پر مُصر بھی۔ اور اب تو عام بلکہ خاص لوگوں کی سوچ میں جو تبدیلیاں آتی چلی گئی ہیں وہ کراچی میں زیادہ ہی واضح اور زیادہ ہی اذیت آفریں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔

نور کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہم نے کراچی میں رہنے کا جو فیصلہ کیا تو اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ اور ہمارے لیے ایک ہی کشش۔ کہ یہاں میرے اور نور کے زیادہ تر رشتہ دار پہلے ہی موجود تھے۔ آب و دانہ کسی کو کہیں لے بھی جائے واپس یہیں آتا ہے۔

۸۰ء میں جب ہم یہاں پہنچے اس وقت تک کراچی سجا سجایا اور رسا بسا شہر تھا۔ ویرانیوں نے تو اگلے برسوں میں یہاں ڈیرا ڈالا۔ پہلے جہاں دھیرے دھیرے بہت سی دوریاں سمٹتی نظر آ رہی تھیں وہیں اب دیکھتے دیکھتے ناقابلِ یقین حد تک فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ارادتاً" بڑھائے جا رہے تھے۔ کوئی آسیب رفتہ رفتہ کراچی کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ یہ وہی کراچی تھا کہ جب یہاں اسلام آباد سے کچھ

دنوں کے لیے ہمارا آنا ہوتا تو روشنیوں اور خوشیوں سے چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ امن اور آشتی کے بلاوے اور محبتوں کے سندیسے دیتا ہوا شہر۔ سڑکیں رات کے ایک دو بجے تک آباد۔ لوگوں کے چہرے اعتماد اور اطمینان کے مظہر۔ اب یہ کیا ہوا کہ ہر راستہ اور ہر چہرہ خوف کے غبار سے اٹا ہوا ہے۔ یہ کیسا محاذ جنگ ہے کہ لوگ اپنے ہی خلاف بر سر پیکار ہیں۔

کیا آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو دن میں کہانیاں سناتی ہیں کہ مسافر راستہ بھول بیٹھے ہیں۔

اس پریشاں حال شہر کی ایک تصویر یہ نظم بھی ہے۔ اس کا عنوان ہے۔

ایک اور خبر

وہ جو خوشبو سا تھا۔
نودمیدہ شگوفوں کی آواز سا
بس گلی تک گیا تھا
وہ معصوم و ناداں
گھڑی دو گھڑی کو گلی میں گیا تھا
تو ماں کو کئی کام یاد آگئے تھے
ادھورے کئی کام
جو شام ہونے سے پہلے اسے ختم کرنا ہی تھے
اور تھکن دھیان میں کیسے آتی
کہ آتے ہوئے موسموں کے کئی دلربا راز
ممتا کی آنکھوں میں تھے
اور وہ تتلیوں، طائروں کے تعاقب میں
جانے کہاں تک گیا

گھر میں واپس نہ آیا

خبر آگئی

لوریاں سُننے والا

دھماکوں کی آواز سن کر

لہو کی گلابی رِدا اوڑھ کر سو گیا

نفرتوں کو ہدف دیکھ لینے کی مہلت نہ تھی

غضب کو نشانہ ضروری نہیں

صرف اک رقصِ وحشت

فقط دہشتِ بے اماں

ٹوٹتی چوڑیاں

خاک ہوتے ہوئے سائباں

حرف بکھرے ہوئے

آئینے کرچیاں کرچیاں

جاں کا رنگِ یقیں دل کا حسنِ بیاں

اور وہ

وہ جو کچے گھروندے کا مہتاب پارہ تھا

سب کا مقدر لکھا جا چکا

کتنی آنکھیں تھیں جو راستہ دیکھتی رہ گئیں

اور اگلی سحر ایک سرخی تھی اخبار میں

کہ حالات معمول ہی کے مطابق رہے

شہر میں!

اپنوں اور اپنے بچوں کی باتیں کرتے کرتے آج کے دُکھ تک آ پہنچی۔ جانتی ہوں کہ

قوموں کی زندگی میں اونچ نیچ بھی آتی ہی رہتی ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر کالی رات آخر آخر ایک روشن اور منزہ صبح کی نوید بھی ہوتی ہے۔

اپنے وطن اور اپنی پوری قوم پر فخر و ناز ہمارے بچوں کا حق ہے۔ جو انشاء اللہ صدیوں صدیوں تک قائم اور تابندہ رہے گا۔

روشنی نسلِ آدم کی میراث ہے

قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو

موجِ ہوا کا ہاتھ تھام کر چلنے کی تو آرزو ہی رہی۔ مگر کئی ان جانی ان دیکھی وادیوں گھاٹیوں تک رسائی بھی ہوئی۔ خدا کے فضل و کرم سے ہماری اس خوشی کا اہتمام ہمارے بچے کرتے رہتے ہیں۔

اپنے بچّوں اور ان کے بچّوں کے ساتھ جو وقت گزرتا ہے اس کا تو ایک ایک لمحہ یوں بھی قیمتی ہوتا ہے۔ ساتھ ہی عزمی اور صبیحہ امریکہ میں ہمارے قیام کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کبھی وقت کی حدود کو نظرانداز کرتے ہوئے ماضی کی غیر معمولی شخصیات سے غیر معمولی ملاقات ہو جاتی ہے۔ کبھی آسایشوں اور شادمانیوں سے چھلکتے ہوئے اس بَرِاعظم کے ایسے گوشوں تک بھی جا پہنچی جہاں قدرتی مناظر کا حسن و جمال اپنی معجز نمائی کی انتہا کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی دور کے آباد اور غیر آباد علاقے، کبھی آس پاس کے قریے اور کُوچے کبھی شہر کے اندر ہی کوئی انوکھا منظر، کوئی دلچسپ تماشا۔

اپنے بچّوں کو دیکھنے کے لیے طویل صبر آزما سفر بار بار کیا ہے اور ہر بار ہی ان کے ساتھ جشنِ نظارہ منایا ہے۔ سب کہاں کچھ مناظر کچھ تماشے یاد رہ گئے ہیں۔

صباح کی سالگرہ تھی۔ زبیر ہمیں کھانا کھلانے کے لیے مراکش لے گئے۔ موٹر تو واشنگٹن کی سڑکوں پر جا رہی تھی لیکن جس عمارت کی آگے رکی وہ باہر ہی سے الگ تھلگ نظر آئی۔ بیرونی دیوار چکنی مٹّی سے لپی پُتی ہوئی سی جس پر واضح عربی رسم الخط میں "مراکش" لکھا ہوا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا منقّش دروازہ تھا۔ زنجیرِ در کھڑکائی فوراً" ہی کواڑ کُھلے اور روایتی عربی لباس پہنے ہوئے ایک بی بی خیر مقدم کے لیے نمودار ہوئی۔ اس

کی رہ نمائی میں اندر داخل ہوئے تو وہاں امریکہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس ریستوراں کے کشادہ ہال میں قدیم عربی تہذیب و تمدن کا رچاؤ اس حد تک مکمل تھا کہ وہاں جتنے امریکی لوگ موجود تھے اس وقت وہ سب غیر ملکی نظر آرہے تھے۔

وہاں سجاوٹ کا انداز بلکہ ہر انداز ہی عام طعام خانوں سے بالکل مختلف تھا۔ دیواریں یہاں سے وہاں تک کپڑے پر کڑھے ہوئے رنگ بھرے گل بوٹوں سے آراستہ تھیں۔ ہر جانب ہی دستکاری کے خوش نما نمونے نظر آرہے تھے۔ ان دیواروں کے ساتھ جو نیچے سائز کے صوفے بچھے ہوئے تھے وہ بھی اسی طرح گل کاری سے مزیّن تھے۔ صوفوں کے ساتھ کچھ کرسیاں اس زاویے سے رکھی گئی تھیں کہ مہمانوں کے لیے کسی حد تک علیحدہ علیحدہ گوشے بن جائیں۔ سامنے لکڑی کی ایک نہایت خوبصورت منقّش گول میز تھی۔

ہم لوگ بیٹھ گئے تو ایک مؤدب بیرا ایک ہاتھ میں چلمچی اور دوسرے میں لوٹا تھامے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ یہ لوٹا بھی شکل میں عمر خیام کی صراحی سے ملتا جلتا تھا۔ بیرے نے اپنا ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بڑی تعظیم سے چلمچی میں باری باری ہمارے ہاتھ دھلوائے اور الگ الگ تولیہ پیش کی۔

ہمارے چونکنے کا مرحلہ تو اس وقت آیا جب ہمارے سامنے کھانا پیش کیا گیا۔ ایک بڑے طباق میں بریانی کی طرح پکے ہوئے چاول تھے جن پر کباب اور مرغی کے تکّوں کی سیخیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور ایک پیالے میں دہی کا رائتہ۔ اس کے علاوہ ہماری میز پر نہ کوئی پلیٹ تھی اور نہ چمچے اور نہ کانٹے۔ روٹی ہمارے ہاتھ میں تھما دی گئی۔

اب ہم نے آس پاس کے مہمانوں پر نگاہ ڈالی جن میں زیادہ تر امریکی خاندان تھے اور سب بہت ذوق و شوق سے مل جل کر اسی تھال میں چاول کے نوالے بنانے کی مشق کر رہے تھے۔ ہمارے لیے انگلیوں کی مدد سے کھانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مگر پورے خاندان نے ایک ہی برتن میں اس طرح کبھی شرکت نہیں کی تھی۔

کھانا ختم ہوا تو کمرے کی تمام بتیاں بجھ گئیں۔ اور فوراً ہی چار پانچ بیرے جلتی ہوئی پھلجھڑیاں اور کیک لیے ہوئے ہماری میز تک آئے۔ کمرہ دوبارہ روشن ہوا۔ کیک صباح

کے سامنے رکھ کر انہوں نے سالگرہ کا مخصوص گانا گایا اور واپس چلے گئے۔ کیک کے ساتھ چُھری موجود تھی لیکن اس کے ٹکڑے ہم نے ہتھیلیوں پر رکھ کر ہی کھائے۔

ایک بار پھر اس ہال کے تمام بلب بجھا دیے گئے۔ گھڑی دو گھڑی بعد روشنی ہوئی تو دیکھا کہ کمرے کے درمیانی حصّے میں جو خالی جگہ تھی اب وہاں ایک بہت بڑی اور خاصی اونچی میز بچھی ہوئی تھی جس پر ایک رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ امریکہ میں مراکش کا روایتی رقص بھی دیکھا اور نغمے بھی سنے۔ مگر وہاں یہ کوئی انوکھا ریستوراں نہیں تھا۔ سیاحوں اور مقامی لوگوں کی بھی توجہ حاصل کرنے کے لیے اکثر شہروں میں اس قسم کے طعام خانے کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ اور یہ لوگوں کو مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت سے متعارف کرنے کا ایک مقبول طریقہ بھی ہے اور ساتھ ہی سُودمند بھی۔ بہرحال یہ تماشا خاصا دلچسپ تھا۔

صبیحہ اور زبیر نے امریکہ میں جو سب سے انوکھی اور یاد رکھنے کے قابل جگہ ہمیں دکھائی وہ سنگِ زرد کی وادی (یلو اسٹون پارک) ہے۔ یہ پارک موجودہ امریکی تمدن سے مختلف اپنی الگ ہی شناخت رکھتا ہے۔ اور یہی اس کی خصوصیّت ہے۔ اس شناخت کو قائم رکھنے کا خاص اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

یہ علاقہ وایومنگ اسٹیٹ میں ہے۔ ہَوائی جہاز سے ہمارا پہلا پڑاوٴ بوزمین تھا۔ جو چھوٹا سا ناقابلِ التفات سا شہر ہے۔ پتہ چلا کہ اس شہر کی کل آبادی میری لینڈ یونیورسٹی کے طلباء کی تعداد سے کم ہے۔ جہاں صبیحہ اقتصادیات پڑھاتی ہیں۔ یہاں وقت واشنگٹن سے تین گھنٹے پیچھے تھا۔ بوزمین کے ہوائی اڈے سے زبیر نے دس دن کے لیے موٹر کرائے پر حاصل کرلی تھی۔ سنگِ زرد کی وادی اس شہر سے تقریباً" دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔ یلو اسٹون پارک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سب سے پرانا اور سب سے بڑا نیشنل پارک ہے۔ یہ علاقہ تقریباً" بائیس لاکھ ایکڑ زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ جس کی تین جانب اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یہ وسیع و عریض رقبہ اپنے قدرتی عجوبوں کے لیے دُور دُور تک مشہور ہے۔ گہری گھاٹیاں' آبشار' دریا' جھیلیں اور خصوصاً" گرم پانی کے فوارے اور

چشمے جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ اسی علاقے میں ہیں۔ اور ان تمام حسین اور کسی حد تک حیران کر دینے والے نظاروں کے علاوہ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے جنگلات۔ ان جنگلات کا قدرتی ماحول محفوظ اور قائم رکھنے کا ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ سیاحوں کے قیام کے لیے جو کاٹج اور کیبن بنائے گئے ہیں وہ بھی باہر سے ناتراشیدہ لکڑی سے بنے ہوئے گھروندے ہی نظر آرہے تھے۔ جہاں تک پہنچنے کے لیے پتھروں پر چلنا بھی ضروری تھا۔

زبیر نے کینین لاج میں دو کیبن کرائے پر حاصل کیے تھے۔ کینین لاج نام تو بھاری بھرکم تھا مگر وہاں جتنے رہائشی کمرے تھے وہ باہر سے جنگل میں کسی کُٹیا کی طرح ہی نظر آرہے تھے۔ ان کمروں کے اندر بے شک تمام جدید آسائشیں مہیّا تھیں۔ سوائے ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن۔ ٹی وی تو غالباً" اس پورے علاقے میں کہیں نہیں تھا۔ کسی ریستوراں میں بھی نہیں دیکھا۔ ٹیلی فون سڑکوں پر ہنگامی ضرورت کے لیے کہیں کہیں موجود تھے۔ یا شاید کچھ طعام خانوں میں بھی ہوں گے

جنگل کے بیچ رہنے کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ سیکڑوں سیاحوں کی موجودگی کے باوجود وہاں ویرانیوں کی حکمرانی تھی۔ اور ان ویرانیوں کا اپنا ہی ایک روپ سنگھار بھی تھا۔ ایک بکھرا بکھرا بناؤ سا۔

یہاں انسانی ہاتھ قدرت کے کسی کام میں دخل انداز نہیں ہوتے۔ جو درخت جہاں گر گیا وہیں پڑا ہوا۔ زمین پر سُوکھے ہوئے پتے اور ٹوٹی ہوئی شاخیں بکھری ہوئی۔ کہیں ہرے بھرے گھنے پیڑوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے میں گُندھی ہوئی اور کہیں دور دور تک درختوں کے بے بَرگ و بار تنے کھڑے ہوئے۔ جنہیں وقت نے چونے جیسے سفید رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اور اِدھر اُدھر جنگلی جانوروں کے غول کے غول۔ نہایت بدشکل بھینسیں جنہیں بِسان (Bison) کہتے ہیں۔ بارہ سنگھے' ہرن' جنگلی گھوڑے' ریچھ اور دوسرے بڑے چھوٹے ہر قسم کے جانور آزادی سے اس پورے علاقے میں گھومتے رہتے ہیں۔ اس نیشنل پارک میں کسی جانور کو شکار کرنا ممنوع ہے۔ اس لیے وہ انسانوں سے خوف زدہ بھی نظر نہیں آتے۔ ڈرے سہمے تو ہم لوگ ہی تھے۔ سیاحوں کو بیک وقت اپنی اور ان

جانوروں کی حفاظت کی تاکید خاص طور پر کی جاتی ہے۔

ان جنگلات میں درختوں کے بیچ کچھ محفوظ علاقے بھی ہیں جن کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں جہاں سیاح گھوم پھر سکتے ہیں۔ ایسی ہی ایک پگڈنڈی پر چلتے چلتے میں کہیں اور ہی جا نکلی۔ سر کے اوپر پتوں کا سائبان تھا۔ شاخوں پر رنگ رنگ کے پرندے چہچہا رہے تھے اور ان کی آوازوں کے سائے سائے یکراں خاموشی بکھری ہوئی تھی۔ عجیب سا دُھند لکا تھا اور دھند لکے کا طلسم مسحور کن تھا۔ ایسے میں نرم رفتار ہوا کے تخاطب نے دھیان کی لہروں کو ان دیکھے قدیم زمانوں تک پہنچا دیا۔

سوچنے لگی کسی صدی میں تو یہ علاقہ انسان کا مسکن بھی رہا ہو گا۔ اس خطّے میں آسمان کی بے مروتی اور زمین کی شعلہ سامانی ہزاروں سال پرانی سہی مگر زندگی تو اس سے پہلے بھی موجود تھی۔ انسان سانس لے رہا تھا۔ کبھی تو کسی نہ کسی حد تک یہ خطۂ زمین بھی آباد رہا ہو گا۔ اِکّا دکّا ٹھکانے ہی سہی۔ کہیں کوئی غار کہیں درختوں کی گھنیری شاخوں میں گھونسلے جیسی کوئی مچان۔ سیدھی سادی مشقت بھری مگر مطمئن زندگی۔ طائروں کی طرح صبح صبح روزی کی تلاش میں نکلنا اور شام پڑے دن بھر کی کمائی کے ساتھ اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپسی۔ کوئی احساسِ زیاں یقیناً" ان کے ساتھ نہیں ہوتا ہوگا جو بھی میسّر آگیا اس پر قانع۔ پیہم کشمکش اور مسلسل ناآسودگی تو تہذیبِ حاضر کا عطیہ ہے۔ ان لوگوں کے لیے ہنسنا اور رونا دونوں ہی آسان رہے ہوں گے۔

میں سوچ رہی تھی کسی اَن دیکھی بستی کی طرف جانے والی کوئی پگڈنڈی ادھر سے بھی گزری ہوگی۔ دلوں کو دھڑکنا تو لاکھوں سال پہلے بھی آتا ہو گا۔ کسی دن کسی مدھر بول کی کوئی بے ساختہ لَے کسی ڈھول کی بے تال سی تھاپ زمین کے اس ٹکڑے نے بھی سنی ہو گی۔ کیا کبھی ان راستوں سے کوئی ایسا شکاری بھی گزرا تھا جس کا انتظار آہو کر رہے ہوں۔

اس زمین کے اصل باشندے تو یقیناً" وہی لوگ تھے جنہیں مدّتوں بعد آباد کاروں نے آکر ریڈ انڈین کا نام دیا اور رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان تک ختم کر دیا۔ اب امریکہ میں جو

بچے کھچے ریڈانڈین لوگ یا قبیلے باقی رہ گئے ہیں وہ عام طور پر نظر بھی نہیں آتے۔ بس کہیں کہیں ان لوگوں کی دستکاری کے نمونوں کی دکانیں سجا دی گئی ہیں۔ ایسی ایک دکان سیاحوں کی دلچسپی کی خاطر ییلو اسٹون پارک میں بھی ہم نے دیکھی۔

ییلو اسٹون پارک کا موجودہ علاقہ شدید آتش فشانیوں' زلزلوں اور برف باریوں کے ساتھ ہزار سال بھگتا کر وجود میں آیا ہے۔ پارک کی سطح کے نیچے اب بھی آتش فشاں مادہ موجود ہے۔ جس کی وجہ سے گرم پانی کے گیزر جگہ جگہ زمین سے پھوٹتے رہتے ہیں۔ یہاں دو سو سے زیادہ اُبلتے ہوئے پانی کے فوارے اور ہزاروں گرم پانی کے چشمے ہیں۔ ان کے علاوہ جا بجا تالاب ہیں۔ کچھ گدلے مٹیالے لیکن زیادہ تر نہایت خوش نما اور خوش رنگ ہیں۔ سبز' نارنجی' قرمزی' نیلے وغیرہ۔ گرم پانی کے ان ذخیروں کو مختلف دلکش رنگ ایلجی اور بیکٹریا نے عطا کیے ہیں۔ جو اُن کی تہہ میں ہے۔ ہر گیزر اور تالاب کا کوئی نہ کوئی دلچسپ نام بھی رکھا گیا ہے۔ مثلاً ''اولڈ فیتھ فل'' مارننگ گلوری ''کیسل'' وغیرہ۔

میمتھ ہاٹ اسپرنگ بھی قابلِ دید ہیں۔ یہاں قدرت نے خوبصورت چبوترے سے بنا دیے ہیں۔ اور پانی کئی منزلوں سے نیچے گرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر ٹیرس سے بہتے ہوئے پانی کا رنگ بھی اپنا اپنا ہے۔ ییلو اسٹون پارک میں چشموں اور فواروں کے نظارے ہی سب سے زیادہ پُرکشش ہیں۔ اس جگہ زمین کے نیچے جو چٹان ہے اسے میگما کہتے ہیں۔ یہ چٹان ہمیں اسکرین پر دکھائی گئی جو ایک دہکتا ہوا انگارہ یا شعلہ زار ہے جس کی وجہ سے گیزر اور گرم پانی کے چشمے وجود میں آتے ہیں۔ کوئی گیزر اپنی توانائی ختم ہونے پر بند ہو جاتا ہے تو کہیں آس پاس دوسرا گیزر سر اٹھاتا ہے۔ اسی طرح ابلتے ہوئے پانی کے تالاب اور چشمے بھی اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

اولڈ فیتھ فل اس پارک کا سب سے مشہور اور سب سے پرانا گیزر ہے۔ جو بڑی مستقل مزاجی سے اپنی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتا رہتا ہے یہ ''قدیم وفادار'' ہر روز پابندی سے ہر پچاس یا پچپن منٹ کے بعد اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور تقریباً سو فٹ تک بلند ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی کی بنچیں بچھا دی گئی ہیں لوگ معلوم وقت پر

اسے دیکھنے کے لیے آکر یہاں بیٹھ جاتے ہیں اور اس وفادار نے مایوس کبھی نہیں کیا۔ فاصلہ اتنا ہے کہ گرم پانی کی پھواریں تماشائیوں تک پہنچتے پہنچتے اپنی تمازت ہواؤں کی نذر کرچکی ہوتی ہیں۔ یہ بڑا خوبصورت نظارہ تھا۔ زمین سے پھوٹتی ہوئی رُوپہلی کونپلیں جو دیکھتے دیکھتے شاخ شاخ سر اُٹھاتی گئیں اور سرو کے نقرئی باوقار درخت کے رُوپ میں ڈھل گئیں۔ دور تک شفاف دُودھیا دھواں سا جو اس کی دید میں حائل بھی نہیں تھا۔ بھینی بھینی پھوار کی سوغات بانٹتا ہوا یہ شجرِ مہتاب کچھ دیر اپنے پورے افتخار اور حُسن کے ساتھ ہمارے سامنے رہا اور پھر آہستہ آہستہ قامت میں کم ہوتے ہوتے واپس زمین کی گود میں آسودہ ہوگیا۔

یلو اسٹون پارک کے ان تمام پُرکشش مقامات کو دیکھنے کے لیے لکڑی کی راہداریاں بنادی گئی ہیں۔ جن کی مجموعی لمبائی تقریباً تین سو میل ہے۔ سیاحوں کو صرف اسی ٹریک پر چلنے کی ہدایت کی جاتی ہے کیونکہ آس پاس کھلے میدان میں کسی وقت بھی اُبلتے ہوئے پانی کا کوئی فوارہ اچانک جاری ہو سکتا ہے۔

اس شدید گرم پانی کی بے تابیوں یا اٹکھیلیوں سے کچھ فاصلے پر برفانی پانی کی ایک بڑی جھیل بھی تھی۔ جو برسوں تک گلیشیئر کے پگھلنے سے جمع ہوتا گیا ہے۔ یلو اسٹون لیک تقریباً بیس میل لمبی اور پندرہ میل چوڑی ہے ہم نے کشتی میں اس جھیل کی سیر بھی کی۔ سطحِ سمندر سے سات آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر حدِ نگاہ تک گہرا نیلا پانی ہی پانی تھا۔ کوئی اور چھور نظر نہیں آرہی تھی۔ پانی کے براہ راست لمس کو وہاں بھی ترسے تھے یہاں بھی پانی میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آگ اور برف دونوں کا مزاج اعتبار کے قابل نہیں تھا۔

یلو اسٹون کا کینین بھی قابلِ دید ہے۔ یہ کھاڑیاں اور گھاٹیاں بعض مقامات پر دو ہزار فٹ تک گہرائی میں چلی گئی ہیں۔ اس طویل گھاٹی کے دونوں طرف پہاڑوں نے حدِ نگاہ تک جو ناہموار دیوار سی بنائی ہوئی ہے اس پر اتنے مختلف اور ایسے سلیقے سے بکھرے ہوئے دلکش رنگ نظر آتے ہیں جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے تجریدی مصوری کے شاہکار

تخلیق کیے ہوں۔ ہماری موٹر اوپر پہاڑی راستوں پر جا رہی تھی اور نگاہیں اس حصار رنگ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ شدید موسموں کا تضاد اور ہواؤں کا مسلسل بے تابانہ سفر بھی کیسے کیسے اعجاز کا حامل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً" دو مقامات گرینڈ ویو کینین اور آرٹسٹ پوائنٹ ایسے ہیں جہاں رنگوں کی سحر کاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

اس کینین سے شمال کی جانب جو پہاڑی علاقہ ہے وہاں وادی زرد کے وہ جنگل ہیں جن کے اشجار پتھر میں ڈھل گئے ہیں۔ ان درختوں کو تقریباً" ساٹھ ہزار سال قبل آتش فشاں کے لاوے اور شدید برف باری کے ملے جلے عمل نے پتھر بنا دیا ہے۔ کیسی کیسی محرومیاں ہوتی ہیں۔ ان درختوں سے تو اب ہوائیں بھی سرگوشیاں نہیں کرتیں۔ پاس سے ہو کر بیگانہ سی گزر جاتی ہیں۔ کوئی طائر ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ ایسا ہی ایک شجرِ سنگ ہماری عارضی رہائش سے نسبتاً" نزدیک بھی تھا۔ جس کے گرد لوہے کا جنگلہ بنا دیا گیا ہے۔

امریکہ میں بہت شہر دیکھے۔ آرٹ کے خزینے بھی دیکھے اور قدرتی مناظر بھی۔ سب کا ذکر نہ ضروری ہے نہ مجھے منظور ہے۔ گھومتے پھرتے جہاں بھی کسی وجہ سے ٹھٹکی بس وہی دھیان میں ساتھ لے چلی۔

اب جو شہر مجھے یاد آیا ہے اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔ فلاڈیلفیا' یہ شہر ریاست پنسلونیا میں ڈیلاویر دریا کے کنارے آباد ہے۔ اسی شہر میں جیفرسن اور بنجمن فرینکلن وغیرہ نے اعلان آزادی لکھا تھا۔ اور یہیں انڈیپنڈنس ہال میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا آئین منظور ہوا۔ آئین بنانے کے لیے جب سینیٹ اور کانگریس کے ممبران اکٹھا ہوئے تھے تو انہوں نے ایک ہی عمارت میں قیام کیا تھا۔ اوپر کی منزل میں سینیٹ کے لوگ تھے اور نچلی منزل میں کانگریس کے ممبر۔ اسی زمانے سے اپر ہاؤس اور لوئر ہاؤس کی اصطلاح رائج ہوئی۔ آزادی کا اعلان لوہے کی ایک بہت بڑی گھنٹی بجا کر کیا گیا تھا۔ تاریخ چار جولائی ۱۷۷٦ء تھی۔ بعد میں بھی برسوں تک یہ گھنٹی جس پر اعلانِ آزادی کندہ کیا گیا ہے ہر سال چار جولائی کو بجائی جاتی رہی۔ جب ہم نے اسے دیکھا تو اس میں بہت چوڑا شگاف پڑ چکا تھا۔ اب یہ لوہے کی شکستگی آلود گھنٹی نمائش کے لیے

شیشے کے شوکیس میں رکھی ہوئی ہے۔ اور امریکی بڑی عقیدت سے اس کا دیدار کرتے ہیں۔ فلاڈیلفیا کئی سال تک امریکی حکومت کا صدر مقام بھی رہا جو بعد میں واشنگٹن ڈی سی منتقل ہوا۔

فلاڈیلفیا میں تمام پرانی تاریخی عمارتیں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ جو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔ یہاں قابل دید مقامات بہت ہیں۔ روڈن میوزیم میں آگسٹ روڈن کے بنائے ہوئے داد طلب مجسمے اور میوزیم آف آرٹ میں پچاس ہزار سے زیادہ آرٹ کے دلکش نمونے ہیں جن میں فرانسیسی مصوروں کے شاہکار بھی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے میوزیم ہیں۔ پارک ہیں۔ مشہور یونیورسٹیاں اور قیمتی لائبریریاں ہیں۔ امریکہ کی پہلی لائبریری اسی شہر میں قائم ہوئی تھی۔ امریکی گائڈ بڑے ذوق شوق اور تفصیل سے ان تمام مقامات اور ان کی اہمیت کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کرتے رہے۔ میرے ذہن میں شہر کا مختصر سا خاکہ محفوظ رہ گیا جو بہرحال اپنی پہچان رکھتا ہے۔ اور امریکن تاریخ میں اہمیت بھی۔

فلاڈیلفیا شہر کے مزاج کی بات کروں تو پانچ منزل میں پھیلا ہوا سمایا ہوا بازار بھی یاد آجاتا ہے۔ اس شاپنگ مال کی عمارت بھی شاندار تھی اور سامان کا اندازہ تو اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً" دو سو دکانیں قطار در قطار صرف زیورات اور جواہرات کی تھیں۔ بہرحال وہاں پہنچ کر پہلے ہم نے اپنی تکان میں کچھ اور اضافہ کیا اور پھر وہیں ایک ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس تاریخی شہر کی سیر ہم نے دو گھوڑوں کی بگھی میں بیٹھ کر کی۔

ایک اور یاد سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ایک بار صبیحہ اور زبیر ہمیں بحرالکاہل کی طویل ساحلی شاہراہ پر لے گئے۔ جسے ہائی وے ون کہا جاتا ہے لاس اینجلز پہنچ کر زبیر نے ایئر پورٹ سے ہی موٹر کرائے پر حاصل کرلی تھی۔ میں اور نور ۶۸ء میں اپنے امریکہ کے پہلے سفر کے موقع پر بھی کیلی فورنیا میں سان فرانسسکو وغیرہ کئی شہر دیکھتے ہوئے لاس اینجلز تک گئے تھے۔ وہ سفر ہم نے امریکہ کے مغربی ساحل سے ہی شروع کیا تھا۔ اس وقت بچے

ہمارے ساتھ نہیں تھے اس لیے تفریحی مقامات سے ہمیشہ آزردہ ہی لوٹتے تھے۔ خصوصاً ڈزنی لینڈ۔ پھر ہالی وڈ اور یونیورسل اسٹوڈیو جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ ۸۶ء میں دوبارہ کیلی فورنیا گئے تو خدا کے فضل و کرم سے ہمارے بچّے اور ان کے بچّے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بلکہ دراصل ہم ان کے ساتھ تھے۔

اس بار ہم دونوں ڈزنی لینڈ کی سیر میں تو شریک نہیں ہوئے البتہ ان کے ساتھ ہالی وڈ جاکر ان ایکٹریسوں کے نقوش پا سیمنٹ کے فرش پر دیکھے جن کے چہروں کے نقوش سے بھی کم کم ہی آشنا تھے۔ اور بچوں کے ساتھ یونیورسل اسٹوڈیوز بھی گئے۔ جس کا شہرہ بہت سنا تھا۔ اور واقعی یہ تماشا دلچسپ تھا۔ جس گاڑی کے ڈبوں میں سیاحوں کو بٹھایا گیا تھا کبھی کوئی عمارت اچانک اس کے اوپر گرنے لگتی۔ لوگ گھبرا کر بچاؤ کی سوچتے ، مگر گرنے سے پہلے ہی عمارت اپنی بنیادوں پر دوبارہ استوار ہو جاتی۔ کبھی آگ کے شعلے جارحانہ انداز سے لپکتے ہوئے گاڑی کی کھڑکیوں تک آجاتے۔ کبھی ہم شدید بارش اور طوفان میں گھر جاتے اور جس پُل پر ہماری گاڑی جا رہی تھی اس کا سامنے کا حصہ ہی ٹوٹ کر گر جاتا۔ مگر دیکھتے دیکھتے آگ کا گمان تک باقی نہیں رہتا' مطلع بھی صاف ہو جاتا اور گاڑی پُل پر سے بخیریت گزر جاتی۔ ناگہانی آفات ایسی خوش انجام کہاں ہوتی ہیں۔ تمام وقت گاڑی میں ہلچل مچی رہی۔ خاصا انوکھا سفر تھا۔

یونیورسل اسٹوڈیو میں گھومتے پھرتے وہاں عکس بند کی ہوئی کئی مشہور فلموں کے مناظر بھی موجود ملتے ہیں۔ مختلف ممالک کے گلی کوچے' بازار اور عمارتیں وغیرہ۔

ہمیں دعوت نظارہ کیلی فورنیا کا مشہور تاریخی محل ہرسٹ کیسل بھی دے رہا تھا۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقعی یہ وسیع و عریض قصر ذوقِ تزئین اور ساتھ ہی بے انتہا دولت کے تصرّف کا مظہر تھا۔ نایاب سازوسامان سے آراستہ دو سو کمروں کا یہ قصرِ زرّیں دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اس کی تعمیر ۱۸۶۵ء میں شروع ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ اور اضافے بھی ہونا تھے جو نہیں ہو سکے۔ وقت کے اپنے ہی احکامات ہوتے ہیں۔ اب اس محل کو نمائش گاہ بنا دیا گیا ہے۔

اس پوری عمارت کو دیکھنے کے لیے چار پانچ دن درکار ہوتے ہیں۔ ہم نے انیسویں صدی کے مراعات یافتہ طبقے کے طرزِ زندگی کی پرچھائیاں اور زر ومال کی کرشمہ سازیاں دیکھنے کے لیے ایک دن اس کی نذر کیا۔ جو دیکھا سو دیکھا اور جو نہ دیکھا اس کی تصویریں دیکھ لیں۔ اور اس خاندان کی کہانیاں بھی سنیں۔

اگلے دن ہم لوگ ہائی وے ون کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس شاہراہ پر اجلی دھوپ، خوشگوار ہوا اور پُر سکون سمندر کے ساتھ ہم نے کئی دن بسر کیے۔ اوپر نیلا آسمان نیچے سڑک کی ایک جانب حدِ نگاہ تک گہرے پانی کی کہیں نیلی اور کہیں سبز نظر آتی ہوئی سلوٹوں بھری پُر اسرار چادر اور دوسری جانب کبھی چٹیل میدان اور ٹیلے اور کہیں سرسبز میدان اور پہاڑیاں۔

صباح اور یوسف راستے بھر بحرالکاہل میں سیل دیکھنے کے لیے بے تاب اور اس کوشش میں کبھی کبھی کامیاب بھی ہوتے رہے۔ سیل گہرے سیاہ رنگ کا نہایت بے ہنگم اور بدشکل بحری جانور ہے۔ قدوقامت میں بچھڑے کے برابر۔ اسے سمندری شیر بھی کہا جاتا ہے۔ خشکی پر بھی زندہ رہتا ہے۔ لوگ اسے پکڑ کر کچھ نہ کچھ کرتب بھی سکھا دیتے ہیں۔

سمندر میں کسی ٹاپو پر دھوپ سینکنے کے لیے سیل اکٹھا ہو جاتے تو دور سے ایسے لگتا جیسے کسی ٹیلے پر سفید اور سیاہ بڑے بڑے بے تکے دھبّوں کی دری بچھی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر یوسف اور صباح دونوں بہت مسرور ہوتے۔

ہائی وے ون پر فاصلے فاصلے سے آبادیوں کے آثار بھی ملتے رہے۔ اس طویل شاہراہ سے کسی ہوٹل، کسی قصبے یا بیچ کو جاتے ہوئے مسافر نواز راستے کم نہیں ہیں۔ کھانے پینے اور رات میں قیام کرنے کے لیے کوئی مسافر خانہ کوئی ٹھکانا تلاش کرنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں تھی۔ یہ آسایش گاہیں تیراکی کے شوقین لوگوں کے لیے خاص طور پر مہیا کی گئی ہیں۔ ہم جہاں بھی ٹھہرے خاصی تعداد میں لوگ موجود ملے۔

اسی سفر اور حضر کے دَوران میں ہمارا گزر ایک ایسے چھوٹے سے شہر سے ہوا جہاں

قیام ایک نہایت خوبصورت تجربہ تھا۔ اس جگہ کا نام کارمیل تھا۔ ایسا اعتماد صفت شہر میں نے دنیا کے جس ملک یا جس کونے تک بھی جاسکی کہیں نہیں دیکھا۔ کارمیل میں نہ کسی چوراہے پر ٹریفک سگنل ہے نہ کوئی کانسٹبل نگرانی کے لیے موجود ہوتا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ یہاں کبھی کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔ جبکہ سیاحوں کی آمدروفت مسلسل جاری رہتی ہے۔ امریکہ میں جہاں لال 'پیلی' ہری بتیاں زیادہ ہی چیختی پکارتی ہوئی ملتی ہیں اور پھر بھی حادثات ہوتے رہتے ہیں یہ شہر ایک عجوبہ ہی نظر آیا اور اس قابل ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے۔

ایک سال اپنے بچوں کے پاس گئی تو کنیڈی اسپیس سینٹر دیکھنے کا شوق مجھے فلوریڈا بھی لے گیا۔ فلوریڈا میں کوکو بیچ کے نزدیک اسلم کا گھر تھا اور ان دنوں باجی بھی ان کے ساتھ مقیم تھیں۔

کنیڈی اسپیس سینٹر کیپ کیناورل میں ہے اور امریکہ کا سب سے پہلا خلائی اسٹیشن ہے۔ دوسرا خلائی اسٹیشن کیلی فورنیا میں ہے اور تیسرا اور سب سے بڑا ہیوسٹن میں۔ کیپ کناورل (Cape Canaveral) ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور یہ جگہ اسلم کے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ ہم دونوں بہنیں اسلم کے ساتھ کنیڈی اسپیس سینٹر کی سیاحت پر روانہ ہوگئیں۔ راستہ بظاہر کچھ غیر آباد سا نظر آرہا تھا۔ ہماری موٹر منزل کے نزدیک پہنچی تو دور ایک طرف ایک بڑی سی عمارت نظر آئی۔ اسلم نے بتایا کہ یہاں خلائی شٹل تیار کیے جاتے ہیں۔ اس عمارت کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خلائی شٹل کی تیاری اور تکمیل کے لیے کچھ اور عمارتیں بھی مخصوص ہیں۔ ہم جس سڑک پر جارہے تھے اب اس کے متوازی ایک اور کشادہ سڑک بھی نظر آئی۔ جس پر مٹیالے زرد رنگ کے باریک سنگریزے یا دانے دار مٹی بچھی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ خلائی شٹل کو اسپیس لانچ پیڈ تک لے جانے کے لیے جو بہت بڑی اور خاص قسم کی گاڑی یا ٹرک استعمال کیا جاتا ہے وہ اس مخصوص سڑک پر فی گھنٹہ ایک میل سے بھی کم رفتار پر رینگتا ہوا چلایا جاتا ہے۔

اسپیس سینٹر پہنچ کر ہم نے وہ جگہ دیکھی جہاں راکٹ نصب کرنے اور خلائی شٹل کو

لامحدود خلا کے سفر پر روانہ کرنے کے لیے اسپیس لانچ پیڈ بنایا گیا ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہم کسی شٹل کو لانچ پیڈ سے پرواز کرتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ناممکن کی خواہش تو بہرحال کی جا سکتی ہے۔

اسپیس لانچ پیڈ سے تھوڑا ہٹ کر خاصی اونچائی پر ایک بہت بڑا لوہے یا فولاد کا ڈرم آہنی کھمبوں پر ٹکا ہوا تھا۔ خلائی شٹل کی ڈرامائی پرواز کے وقت پانی سے بھرا ہوا یہ ڈرم بھی ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

خلائی شٹل جس وقت اپنے خلائی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اتنا تیز دھماکہ ہوتا ہے جو وہاں موجود متعلقہ لوگوں کو سماعت سے محروم کر سکتا ہے۔ اس ڈرم سے آس پاس کی فضا میں پانی کی پھواریں بکھرنے لگتی ہیں جو اس تیز و تند آواز اور حدت دونوں کو جذب کر کے قابلِ برداشت حد تک کم کر دیتی ہے۔

اسپیس سینٹر تک پہنچنے کے لیے باقاعدہ بس سروس کا انتظام بھی ہے۔ گائڈ خلائی پروگرام کے مختلف مراحل اور خلا میں انسان کے سفر کی فلم دکھانے کے لیے لوگوں کو مختلف عمارتوں میں لے جاتے ہیں۔ ایک جگہ چاند کی سطح کا نمونہ بھی موجود ہے۔ اور ابھی تو چاند سے آگے جانے کے پروگرام بھی ہیں۔ خلا میں حکمرانی کے خواب دیکھنے والے شاید کارِ زمیں نمٹا چکے ہیں۔ ان کے پاس دکھانے اور بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اور میں نئی دنیا کے بااختیار ارادوں سے بہت دور تیسری دنیا کی مخلوق کے بارے میں سوچ رہی تھی جن کے لیے ابھی تک زمین بھی تنگ ہے۔

ویرانیاں دلوں کی بھی کچھ کم نہ تھیں ادا
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

فلوریڈا میں ڈزنی ورلڈ بھی قابلِ دید مقام ہے۔ خصوصاً" ایپکاٹ سینٹر۔ اس کا چرچا بہت سنا تھا۔ جگہ زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ اسلم کے گھر سے ڈزنی ورلڈ پہنچنے کے لیے موٹر سے دو گھنٹے کا راستہ تھا۔ کیلی فورنیا میں ڈزنی لینڈ کی کچھ جھلکیاں ہم نے اپنے پہلے سفر میں دیکھی تھیں۔ جو چھوٹے بچوں کے تخیل اور تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے۔

جہاں بچے اپنی کہانیوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ فلوریڈا میں ڈزنی ورلڈ کا علاقہ ڈزنی لینڈ کے برسوں بعد صورت پذیر ہوا ہے۔ یہاں بھی وسیع رقبہ بچوں کی تفریح اور ان کی دلچسپیوں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کی دل پسند کہانیوں کے کردار بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں' ہنسنے کھیلنے کے سامان بھی اَن گنت ہیں۔ اور ان کے ذوقِ تجسّس کو اُبھارنے کے لیے نت نئے تماشے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ اس حصے کا نام میجک کنگڈم ہے۔

ہمیں ایپکاٹ سینٹر سے دلچسپی تھی۔ ڈزنی ورلڈ میں ذہن کی اپج اور سائنس کے کمالات پر مبنی یہ ایک انوکھا سا علاقہ ہے۔ جہاں کچھ بھی ناممکن نظر نہیں آتا۔

ایپکاٹ سینٹر بھی بہت وسیع رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے جتنے گوشے ہم دیکھ سکے وہ سب حیران کر دینے کی حد تک غیر معمولی تھے۔ ایک خاص قسم کی کشتی میں ہمیں سمندر کی پُراسرار گہرائیوں تک بھی لے جایا گیا۔ گہرے پانی کے پردوں میں چُھپی ہوئی نیرنگیاں بھی دیکھیں اور رنگینیاں بھی۔ قسم قسم کی بحری مخلوق بھی اور لہلہاتی ہوئی سرسبز جھاڑیاں بھی۔ کچھ پتّوں کے پھولوں جیسے رنگ کچھ جانوروں کی گھورتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ کبھی ڈر لگا کبھی جی خوش ہوا۔ ہمارے اور اس بے تھاہ پانی کے درمیان صرف شیشے کی دیوار حائل تھی۔

سمندر کے سفر سے واپس آئے تو کبھی ہمیں آسمانوں کی سیر کرائی گئی کبھی زمین کے سربستہ راز کھولے گئے۔ ایک اور جگہ خاصی دلچسپ تھی۔ جہاں خلا کو سرسبز و شاداب کرنے اور وہاں سبزیاں کاشت کرنے کے لیے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ ہم نے سبزیوں کی ایسی بیلیں دیکھیں جن کی جڑوں کا مٹّی اور پانی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یہ بیلیں ستونوں کے سہارے زمین سے اونچی اس طرح لٹکی ہوئی تھیں کہ ان کی جڑیں بھی سامنے تھیں اور پھل بھی۔ ترئی' کدو وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام پودے اپنی خوراک نم ہوا کے ذریعے مختلف کیمیکل سے حاصل کرتے ہیں۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ہماری چھوٹی سی ریل گاڑی کے تمام شیشے مضبوطی سے بند تھے۔ اور جہاں ہم تھے یہ جگہ بھی غالباً" زیرِ زمین تھی۔ یہ تجربات اور ان کی کامیابی کا امکان ابھی محدود ہے۔ مگر انسان کی تمنّائیں اور اس

کی خواہشیں لامحدود ہیں۔ شاعر نے کہا تھا۔ "الجھے سلجھے کسو کاکل کے گرفتار رہو۔"

ایپکاٹ سینٹر میں پوری دنیا کے خاص ممالک کی تہذیب و تمدن کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ بلکہ ننھے منے شہر ہی آباد کر دیے گئے ہیں۔ وہاں ہم نے جاپان بھی دیکھا' چین بھی گئے' انگلینڈ' روم' میکسیکو' مراکش وغیرہ بہت ملک اور شہر دعوت نگاہ دے رہے تھے۔ کوئی ملک باہر سے جھانکا کسی کو گھوم پھر کر دیکھا۔ اور کہیں اس ملک کے تاریخی واقعات کی جھلکیاں مدور پردہ سیمیں پر دیکھیں۔ ان میں سے کچھ شہروں میں خریداری بھی کی۔

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ امریکہ کے ہر بار کے سفر اور قیام میں ہم نے کچھ دلچسپ مقامات بھی دیکھے۔ عزمی اور شعاع کے ساتھ نیو انگلینڈ میں بھی بہت سے حسین قدرتی مناظر دیکھے۔ پر سکون' سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ پہاڑیاں بھی' دریا بھی' وادیاں بھی۔ خصوصاً" موسم خزاں میں یہ خطہ زمین بہاراں بہاراں ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے اس علاقے کی جو قیمتی یادیں ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح وہاں کی علم و ادب کی مشہور شخصیات سے بھی ہے۔

ایمرسٹ میں عزمی کے گھر ہر قسم کی کتابیں حاصل کرنے کی سہولت رہتی ہے۔ کبھی کوئی تصنیف پڑھتی ہوں' کبھی کسی مصنف کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس طرح ان لوگوں کی زندگی کے کئی گوشے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور پھر جب ان کے گھر جاتی ہوں تو کچھ دیر کے لیے ان کے زمانے میں پہنچ جاتی ہوں۔ مدتوں مشاہیر سے ملاقات کے لیے ترستی رہی تھی اس لیے میں اپنے اس قسم کے پھیرے کو ملاقات کا نام ہی دیتی ہوں۔ ایملی ڈکنسن اور سلویا پلاتھ سے تفصیلی ملاقات بھی ان دونوں کی غیر معمولی اور ڈرامائی زندگی کے حوالے سے ہوئی تھی۔

نیو انگلینڈ کی ریاستوں میں جن مشہور اہل قلم کا عارضی یا مستقل قیام رہا ان کے ناموں سے سبھی واقف ہیں۔ ان کی تخلیقات بھی اہل ذوق کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ مجھے موقع ملا تو کسی کسی کے گھر تک بھی جا پہنچی۔ کبھی خوشی ہوئی کبھی عبرت۔ گھر کے

در و دیوار بھی تو کچھ نہ کچھ باتیں کرتے ہیں۔

نیو انگلینڈ کی ریاستوں کے درمیان فاصلے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں کوئی دشواری نہیں تھی۔ ایک صبح مارک ٹوئن کا قلعہ نما مکان دیکھنے ہارٹ فرڈ جا پہنچے۔ وکٹورین اسٹائل کا یہ مکان اس نے ۱۸۷۴ء میں دریا کے کنارے تعمیر کروایا تھا۔ مکان اب بھی موجود ہے۔ دریا اب وہاں نہیں ہے۔ اور مکین بھی کوئی نہیں ہے۔ اس کی ایک لڑکی کا انتقال اس کی زندگی میں ہوا۔ دوسری اس کے بعد لاولد مری۔ یہ عمارت سرکاری تحویل میں رہی۔ اور اس کی شناخت بھی تبدیل ہوتی رہی۔ پہلے اسے اسکول بنادیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد یہاں لائبریری قائم کی گئی۔ طویل عرصے تک مختلف روپ بدلنے کے بعد اب اس مکان کو مارک ٹوئن کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا گیا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ کمروں کی آرائش بھی وہی رکھی گئی ہے جو اس کی زندگی میں تھی۔ سازوسامان نقلی ہی سہی مگر اب یہ مکان اپنی اصلی صورت دوبارہ حاصل کر چکا ہے۔

میں نے دیکھا چند اوراق کی ایک کاپی اور اس کے ساتھ لگی ہوئی پنسل اب بھی بلیرڈ روم میں موجود ہے۔ جس پر وہ اچانک دھیان میں آنے والے خوبصورت جملے لکھ لیا کرتا تھا۔

وہاں ہم جیسے دوسرے شائقین بھی موجود تھے۔ آوازیں بھی تھیں مگر تنہائی اور خاموشی کی دھند بڑی گہری تھی۔ اس گھر میں مارک ٹوئن کہیں نہیں ملا جس سے ملاقات کا شوق مجھے وہاں لے گیا تھا۔ مارک ٹوئن کی رہائش گاہ کے سامنے ہی مشہور ناول نگار ہیریٹ بیچر کا مکان تھا۔ پھر میں اس کے گھر کے اندر نہیں گئی۔

رابرٹ فراسٹ کا تعلق بھی اُنیسویں صدی سے ہے۔ اس کا قیام کچھ عرصے ایمرسٹ میں بھی رہا تھا۔ زیادہ عرصہ اس نے ورمانٹ میں بھی نیو ہیمشائر کے ایک فارم میں گزارا۔ سو ہم ورمانٹ بھی گئے اور نیو ہیمشائر بھی۔ اور پھر اس کی شاعری میں اس سے ملاقات کی۔ جس میں نیو انگلینڈ کا حسن و جمال بھی بڑی طرفگی اور سادگی سے بیان ہوا ہے۔

شعاع اور عزمی ہمیں کنکارڈ میں آرچرڈ ہاؤس بھی لے گئے جہاں لٹل وومین کی مصنفہ لوئیسا مے الکاٹ رہتی تھی۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں کنکارڈ مشہور ادیبوں کا مسکن رہا ہے۔ رہنما کتاب میں ان دانشوروں کا قبرستان بھی قابلِ دید مقامات کی فہرست میں شامل ہے شاید کچھ لوگ ادھر کا بھی پھیرا لگاتے ہوں۔ کنکارڈ اپنی تاریخی حیثیت کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہ شہر بوسٹن کے نزدیک ہے۔ اور امریکی تسلط سے پہلے جنگی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ کنکارڈ کے ایک پُل پر جسے نارتھ برج کہتے ہیں انگریزی فوج کے ساتھ انقلابی امریکیوں کی ایک مختصر لیکن نتائج کے لحاظ سے فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔ اب وہاں ایک سپاہی کا مجسمہ ہے اور ایک پتھر نصب ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ "یہاں وہ پہلی گولی آزادی کے نام پر چلائی گئی جس کی آواز پوری دنیا نے سنی" اب یہ کون کہے کہ پوری دنیا تو کئی حوالوں' کئی ناموں سے اب تک بہت سی گولیوں کی گھن گرج سنتی رہی ہے۔ مجبوریوں کی آواز کہاں سنائی دیتی ہے۔

نیو انگلینڈ کے بہت سے قریوں کوچوں میں گئی ہوں۔ سب کا ذکر کروں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔

کنیڈا کے دو سفر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بار صبیحہ اور زبیر کے ساتھ راستے میں جگہ جگہ ٹھہرتے گھومتے ہوئے ہم لوگ ٹورانٹو تک پہنچے تھے۔ ہمارے ساتھ عامر اور عزمی بھی تھے۔ صباح اس وقت دو ڈھائی سال کی تھی۔ اسے خوش رکھنا اس سفر کا سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ ہم نے نیاگرا فال بھی حسبِ روایت امریکہ اور کنیڈا دونوں جانب سے دیکھا۔ اس سفر کی سب سے دلچسپ یاد تھاؤزینڈ آئی لینڈ (ہزار جزیرے) کی ہے۔ ان ہزار جزیروں کے بیچ پہنچنے اور دور نزدیک سے ان کا نظارہ کرنے کے لیے موٹر بوٹ کا باقاعدہ انتظام تھا۔ موٹر بوٹ کا چکّر خاصا طویل تھا مگر بہت دلکش۔ ان میں سے ہر جزیرے کی وسعت صرف ایک گھر کی متحمل ہو سکی ہے۔ اور یہ مکان آباد تھے۔ ہرے بھرے لان بھی اور پھولوں کی کیاریاں بھی۔ کہیں بھی خالی زمین نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر بنے ہوئے یہ مکان پانی کی وسعتوں میں موجوں کی اٹھکیلیوں سے ہم کنار بھی تھے اور بے

نیاز بھی۔ ساحل تک پہنچنے کے لیے اپنی اپنی ذاتی لانچ بھی موجود تھی۔

موٹر بوٹ سے یہ منظر کچھ ایسا نظر آرہا تھا جیسے کسی بچے نے سلوٹوں بھرے فرش پر خوشنما کھلونے بکھیر دیے ہوں۔ پانی میں بنے ہوئے گھر ہم نے پہلی بار دیکھے تھے۔ سنا تھا کہ ایک زمانے میں جب رہائش اور آمدورفت کی موجودہ سہولتیں میسر نہیں تھیں ان جزیروں کی زیادہ سے زیادہ قیمت پانچ ڈالر تھی۔ کہتے ہیں ان میں سے ایک جزیرہ ایک ڈالر میں بھی خریدا گیا تھا۔

ٹورانٹو کا دوسرا سفر جو مجھے یاد ہے وہ ۸۲ء میں حفظ الکبیر قریشی کے بلاوے پر وہاں پہلی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں فیض صاحب، جمیل الدین عالی اور احمد فراز شریک تھے۔ ہندوستان سے علی سردار جعفری اور دوسرے شاعر تھے مجھے سب نام یاد نہیں۔ ان کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا میں رہنے والے اردو کے شعرا کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔

۶۸ء میں جب کچھ لوگوں نے واشنگٹن میں مشاعرہ کرنا چاہا تھا تو میرے میزبانوں کو وہاں سکونت اختیار کرنے والے اہلِ ذوق میں شاعر کوئی نہیں مل سکا تھا۔ اگر ہوں گے بھی تو اس وقت تک ان کے نام اتنے جانے پہچانے نہیں تھے۔

ٹورانٹو میں ان ادیبوں اور شاعروں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جو اردو کی دنیا سے بہت دور امریکہ اور کینیڈا میں رہتے ہوئے اپنی شناخت بھی قائم رکھے ہوئے ہیں اور اردو زبان اور اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اور اب تو ان شعرا کے کئی قابلِ ذکر شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ایک اجنبی ماحول میں اپنی تلاش کا عمل ہے جس نے اشعار کا پُرکشش لہجہ اختیار کیا ہے۔

اس اردو کانفرنس میں پہلے دن مقالے پڑھے گئے۔ دوسری شام مشاعرہ تھا۔ امریکہ اور کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے والے جن اہلِ قلم حضرات اور خواتین سے میری ملاقات ہوئی ان میں بیدار بخت، رضا الجبار، حفظ الکبیر قریشی، اشفاق حسین زیدی، حمیرا رحمٰن، نیر جہاں، عبدالقوی ضیا، شاہین اور عرفانہ عزیز (ریاض) شامل ہیں۔ عرفانہ عزیز

وہاں قیام سے پہلے پاکستان میں بھی اپنا مقام اور نام رکھتی تھیں۔ مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہیں۔ جن قابلِ ذکر لوگوں سے وہاں میری ملاقات ہوئی ان میں سے کچھ نام شاید میں بھول گئی ہوں۔

ٹورانٹو میں کانفرنس کے انعقاد اور مشاعرے کے بعد امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں مشاعروں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ میں نے ان مسلسل مشاعروں میں شرکت سے معذرت کرلی۔

شعراور ادب کے حوالے سے مجھے ایک اور شہریاد آگیا۔ جہاں جانے کا ارادہ تو بہت بار کیا تھا لیکن کوئی نہ کوئی مجبوری وہاں پہنچنے میں حائل ہوتی رہی تھی۔ جرمنی کا ایک چھوٹا سا شہر ہائڈل برگ۔ جو ہم پاکستانیوں کے لیے اپنی الگ ہی شناخت رکھتا ہے۔

ہائڈل برگ جانے کا موقع ہمیں عامر کی شادی کے بعد مل سکا۔ مایا کے والدین ڈاکٹر لائق علی اور رفیعہ بہن فرینکفرٹ میں رہتے ہیں۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو ان لوگوں کے ساتھ فرینکفرٹ میں وہ مکان بھی دیکھا جہاں گوئٹے پیدا ہوا تھا اور گوئٹے میوزیم دیکھنے بھی گئے۔ اور پھر انہیں کے ساتھ ہائڈل برگ جانے کی خواہش بھی پوری ہوئی۔ ان دونوں شہروں کے درمیان کوئی خاص فاصلہ بھی نہیں ہے۔ اور خوش قسمتی سے ان دنوں پروفیسر فتح محمد ملک ہائڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے تعلق سے موجود تھے۔

ہم وہاں پہنچے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فتح محمد ملک بھائی کو فون کر دیا تھا۔ وہ بارش کے باوجود ہماری رہنمائی کے لیے موجود تھے۔ وہی خلوص وہی محبت جو اسلام آباد میں ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا اب بھی اسی طرح موجود اور نمایاں ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم کچھ دن ان کے پاس بھی قیام کریں۔ ہائڈل برگ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ایک پروگرام بھی رکھنا چاہتے تھے ہمیں بچوں کے پاس امریکہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ بہت دنوں بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی مگر اپنائیت کا جو رشتہ پہلے رہا تھا وہ اسی طرح برقرار تھا۔ برقرار ہے۔

ہائڈل برگ تاریخی شہر ہے۔ اندرون شہر قدیم مکانات، قلعے اور کلیسا بھی موجود

ہیں۔ پورا علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ مگر ہمارے لیے اس شہر کی تمام زیبائی ہمارے آفاقی شاعر اقبال کے نام کے حوالے سے تھی اور رہے گی۔ ہائڈل برگ ہم سب کو اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ وہاں ہمارے شاعر نے قیام کیا تھا۔ ہمارے لیے دریائے نکر اہم تھا جس کا ذکر علامہ اقبال نے کیا۔ وہ پتلی سی پگڈنڈی جو ہمیں اوپر ٹیلے سے دریا کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی نظر آرہی تھی وہاں کتنی نظمیں ان پر طلوع ہوئی ہوں گی۔

دونوں جانب سرسبز پہاڑ تھے۔ درمیان میں وادی جس میں مطمئن سا دریا نکر بہتا ہے۔ اقبال نے جس گھر میں قیام کیا تھا اس کے مقابل دریا کے پار پہاڑ پر ایک پرانا قلعہ ہے۔ ہائڈل برگ کیسل۔ جو اس وقت دھوپ چھاؤں میں کسی تصویر کی طرح نظر آرہا تھا۔ دیکھنے کے لیے وہاں اور بھی بہت سے مقامات تھے۔ تاریخی عمارات' روسی چرچ کی آب و تاب اور پہاڑ اور وادیاں۔ مگر ہائڈل برگ میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر کہیں ادھر اُدھر جانے کا دھیان ہی نہیں آیا۔

میری یادوں کی زنبیل میں کچھ خوش رنگ دن اور بھی ہیں۔ ان کا بھی بیان ہو جائے۔

۸۷ء میں مجھے سوویت یونین جانے کا موقع ملا۔ جشن پشکن کے سلسلے میں پاکستانی ادیبوں کا سہ رکنی وفد وہاں گیا تھا۔ جس کے سربراہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ تھے۔ ان کے علاوہ اس ڈیلی گیشن میں رضا ہمدانی تھے اور میں تھی۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ ان کے علمی' ادبی اور تحقیقی مقام سے سبھی واقف ہیں۔ اور ان کے مزاج میں جو انکسار ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے۔ انکسار رضا ہمدانی کے مزاج کی خصوصیت بھی ہے۔ معروف شاعر ہیں۔ انہوں نے اور فارغ بخاری نے اردو زبان میں پشتو ادب کے گرانقدر تراجم بھی کیے ہیں۔ سوویت یونین میں رضا ہمدانی کے ایک اور کمال سے آگاہی ہوئی۔ وہ ان کی فی البدیہہ شعر گوئی ہے۔ ہر موقع کی مناسبت سے نہایت خوبصورت فی البدیہہ اشعار اردو میں بھی اور فارسی میں بھی کہتے اور سب کو سناتے رہے۔

ہم ماسکو پہنچے تو ہمارا استقبال مریم سیگانوف نے کیا۔ پشکن کے صد سالہ جشن کی منتظم ریماکزوکوف تھی۔ تمام پروگرام اسی کی زیر نگرانی اور اسی کی ہدایت کے مطابق ترتیب دیے گئے تھے۔

اس میں کلام نہیں کہ یہ پورا پروگرام نہایت شاندار تھا اور ہمارے لیے بہت پرکشش بھی۔ مگر حیران کن بات یہ تھی کہ ہمیں کسی تقریب کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں بتایا گیا۔ ماسکو پہنچنے کے بعد توقع تھی کہ ہمارے قیام اور سفر کا پورا پروگرام جو یقیناً پہلے سے طے شدہ تھا ہمیں بتادیا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہر شام صرف اگلے دن کے پروگرام سے مطلع کر دیا جاتا۔ اسی طرح کسی دوسرے شہر جانے کے بارے میں بھی ایک رات پہلے اطلاع دی جاتی۔ ممکن ہے اس قدر رازداری ان لوگوں کے مزاج اور تربیتِ کار کا حصہ ہو۔ مگر ہمارے لیے زحمت کا باعث رہی۔ مجھے تو روس پہنچنے سے پہلے یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ ہمارا ادبی وفد جشن پشکن میں شرکت کے لیے جارہا ہے۔ پتہ نہیں یہ کس کی کوتاہی تھی۔

ماسکو میں ایک رات پشکن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مشاعرہ تھا۔ اس کی اطلاع مجھے ریماکزوکوف نے دوپہر کو لنچ کے وقت دی۔ میں نے نظم لکھی اور ترجمان کو لکھوائی اور منتظمین نے کسی روسی شاعر سے فوراً ہی اس کا ترجمہ بھی کروالیا۔ مشاعرے میں جب میں نے نظم پڑھی تو اس کے بعد وہ منظوم ترجمہ بھی سنایا گیا۔ داد بھی ملی اور گلدستے بھی۔

دوسرے ممالک کے ادبی ڈیلی گیشن بھی اس مشاعرے سے پہلے ماسکو پہنچ گئے تھے۔ اور سب کے لیے ایک تعارفی تقریب منعقد ہو چکی تھی۔ اس مشاعرے میں سبھی شعرا نے نظمیں سنائیں۔

پشکن ماسکو میں ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اسے روس کا سب سے بڑا شاعر اور ادیب مانا جاتا ہے۔ اس نے اپنے عہد کے ادبی مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسے عیش و عشرت ورثے میں ملی تھے مگر اس نے اپنی شاعری میں طبقاتی فرق

اور استحصال کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ اس کی شاعری مجبور اور مظلوم طبقے کی آواز تھی۔ جس کی وجہ سے اسے کچھ عرصہ جلاوطن بھی رہنا پڑا۔ اس نے کہا تھا" میں بے رحم دور میں آزادی کی عظمت کے نغمے گاتا ہوں۔"

ماسکو میں ہمارا قیام ہوٹل رسیا میں تھا۔ جس کا شمار دنیا کے بہت بڑے ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ اس میں بیک وقت پانچ ہزار افراد قیام کر سکتے ہیں۔ رسیا ہوٹل ریڈ اسکوائر کے نزدیک کریملن کے سامنے ہے۔ روس کے مشہور ریڈ اسکوائر کے طویل و عریض میدان کا فرش سرخ پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس میدان میں انقلاب روس کی سالگرہ اور دوسرے اہم مواقع پر فوجی پریڈ اور سرکاری تقاریب ہوتی ہیں۔ روسی لیڈر پریڈ کا معائنہ لینن کے مقبرے کی اوپر کی منزل سے کرتے ہیں جو ریڈ اسکوائر کے احاطے میں ہے۔ ہم اس مقبرے کے اندر شیشے کے تابوت میں محفوظ حنوط شدہ لینن کو دیکھنے بھی گئے۔

ریڈ اسکوائر میں سامنے ہی سینٹ بیسل کا چرچ ہے۔ یہ آٹھ گنبد والی چار سو سال پرانی خوبصورت عمارت ریاست کے تاریخی مقامات میں سے ہے۔ اس چوک میں ایک گول چبوترہ بھی تھا جہاں سے زار حکمرانوں کے زمانے میں شاہی احکامات سنائے جاتے تھے۔ وہیں کریملن کی حد بندی کرنے والی اونچی پر شکوہ دیوار تھی۔ اس دیوار پر روس کے اہم رہنماؤں' دانشوروں اور جانباز سپاہیوں کے نام کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایسی کچھ تختیاں زمین پر بھی ایک لائن میں لگی ہوئی تھیں۔

سوویت یونین میں ماسکو شہر کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور کریملن کو ماسکو کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔ وہاں روسی حکومت کے دفاتر ہیں۔ اہم سرکاری عمارتیں ہیں۔ سپریم سوویت روس کی پارلیمنٹ کے اجلاس گرینڈ کریملن پیلس میں ہوتے رہے ہیں اور بہت سے فیصلے جو یہاں کیے جاتے تھے پوری دنیا پر اثر انداز ہوتے تھے۔ روسی کمیونسٹ پارٹی جو ایک عرصے تک پوری سوویت یونین کو کنٹرول کرتی رہی ہے اس کا ہیڈ کوارٹر بھی ماسکو میں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے اجلاس کانگریس محل میں ہوتے تھے۔ ان دفاتر کے علاوہ کریملن کی چہار دیواری کے اندر شاہی محل بھی ہیں۔ اور کچھ کیتھڈرل جو چودھویں اور پندرھویں

صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کریملن کے اندر جو میوزیم ہیں ان میں زار حکمرانوں کے تاج اور ان کے جواہرات اور نوادرات محفوظ ہیں۔

کمیونسٹ حکومت کے قیام کے بعد کریملن میں داخلہ عام پبلک کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ مگر چند سال کے بعد کچھ حصے بطور نیشنل میوزیم نمایش کے لیے کھول دیے گئے۔

ماسکو بہت بڑا اور شان دار شہر ہے۔ جب ہم وہاں گئے ہیں اس زمانے تک کسی بھی روسی باشندے کو ماسکو میں سکونت اختیار کرنے کے لیے باقاعدہ اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔

ماسکو میں سیاحوں کی دلچسپی کا سامان بہت ہے۔ اونچی اونچی شاندار عمارتیں' ہرے بھرے پارک اور بہت کشادہ اور صاف ستھری اجلی اجلی سڑکیں۔ روسی حکمراں زار بھی زیادہ تر ماسکو میں رہایش پذیر رہے اس لیے اس شہر میں پرانے شاہی محل بھی ہیں' تاریخی میوزیم بھی اور آرٹ گیلریز بھی۔

ہمیں وہاں ہر روز ہی شہر یا نواحِ شہر میں کوئی نہ کوئی قابلِ دید جگہ دکھائی گئی۔ جس میں سینٹرل لینن میوزیم بھی تھا اور میوزیم آف رِوولیوشن بھی۔ ادبی پروگرام بھی جاری تھے۔ ادیبوں کی کالونی دیکھی اور ایک دن ریلوے ورکرز یونین کے اراکین سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ ہمارا ترجمان ولادک بہت صاف اردو بولتا تھا اس لیے کہیں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ ریلوے ورکرز یونین کی طرف سے باقاعدہ جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں اس دن صرف پاکستانی وفد کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت حاصل تھی۔ دوسرے ملکوں کے وفود کسی دوسری جگہ مہمان تھے۔ ہمیں ڈائس پر بٹھایا گیا۔ پھول اور تحفے بھی پیش کیے گئے۔ نظمیں بھی سنی اور سنائی گئیں۔ تقاریر بھی ہوئیں۔ جلسہ ختم ہوا تو کھانے کی میز پر ترجمان کی مدد سے روسی ادیبوں اور شاعروں سے دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔

ماسکو سے ہمارے میزبان ہمیں پسکوف' میخائیل اور لینن گراڈ کے علاوہ تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے تک لے گئے۔ اس پورے سفر کے دَوران میں ہمارے تاثرات مسلسل ریکارڈ کیے جاتے رہے۔ کبھی کبھی باقاعدہ انٹرویو بھی ہوتا تھا۔ خاص بات یہ نظر

آئی کہ وہاں عام لوگ بھی شاعروں اور ادیبوں کا بہت احترام کرتے ہیں اور انھیں پہچانتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہاں تعلیم عام ہے۔

پسکوف ماسکو سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں بارہویں صدی سے سولھویں صدی تک کے بنے ہوئے قلعے ہمیں دکھائے گئے۔ ترجمان تاریخی واقعات بھی بیان کرتا جارہا تھا۔ کچھ پہاڑیاں دیکھیں جو پولینڈ اور جرمنی کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ایک چھوٹا سا چرچ پتھروں کو تراش کر پہاڑ کے اندر بنایا گیا تھا۔ اس کے سامنے ایک طویل سڑک ہے جس کا نام "خونی شاہراہ" ہے۔ اس سڑک پر بہت لوگ مارے گئے تھے۔ وہیں پہاڑوں کے بیچ ایک کھُلا راستہ تھا جس کا نام "موت کا دروازہ" ہے۔ ولادک نے کہا جب دشمن اس راستے سے گزرتے تو قلعے کی برجیوں اور پہاڑیوں کے پیچھے سے روسی سپاہی ان پر گولیاں برساتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی لاشوں کے انبار سے یہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ترجمان نے بڑے خلوص سے ہمیں آگاہ کیا کہ اس دروازے سے گزرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔

پسکوف میں سب سے خوبصورت نظارہ وہ تھا جہاں پہاڑوں کے بیچ سے آتے ہوئے شفاف اور ٹھنڈے پانی کے چار چشمے ایک جگہ جاری تھے۔ ولادک نے کہا کہ سولھویں صدی سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ ان میں سے ایک چشمہ صحت کے لیے ایک مسرت کے لیے ایک ذہانت کے لیے اور چوتھا جوانی کے لیے ہے۔ سب نے اوک سے ان چاروں چشموں کا پانی پیا۔ پتہ نہیں ان میں سے کوئی چشمہ محبت کے نام کیوں نہیں تھا۔

پسکوف سے واپس آکر اگلے دن ہم لوگ میخائیل روانہ ہوئے جہاں پشکن کی آخری آرام گاہ ہے۔ سرسبز و شاداب میدان' جنگل اور پہاڑیوں سے گھِرا ہوا یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ پہلے ہمیں پشکن اور اس کے نانا کے مکانات دکھائے گئے۔ اس کے نانا کی جاگیر بہت بڑے رقبے میں تھی جہاں کچھ پہاڑیاں پشکن کے نام سے موسوم تھیں۔ ایک قطعۂ زمین کا نام پشکن نے "جزیرۂ تنہائی" رکھا تھا۔ جہاں وہ اکثر ایک گھنے پیڑ کی

چھاؤں میں فکرِ سخن میں مصروف رہتا۔ اس درخت کے تنے کا کچھ حصہ بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس کے ایک دوست کے گھر میں وہ کرسی بھی ہمیں دکھائی گئی جس پر بیٹھ کر اس نے کئی اہم نظمیں لکھی تھیں۔ بہرطور نمائش کے لیے وہاں بہت کچھ موجود تھا۔

پشکن کے جشن کی تقریبات میخائیل میں منعقد ہوئیں۔ جن میں ہمارے علاوہ ہندوستان اور دوسرے کئی ممالک کے وفود بھی شریک تھے۔

جشن کی پہلی صبح تمام ادیبوں کا جلوس پشکن کے مرقد کی طرف روانہ ہوا۔ جس کی قیادت ریماکزوکوف کررہی تھی۔ اس کے پیچھے ہر قطار میں چار چار ادیب تھے۔ یہ بہت لمبا جلوس تھا۔ شروع میں روسی ادیب اور شاعر تھے جن کے ہاتھوں میں گلدستے تھے۔ اس جلوس کے پورے راستے میں دونوں جانب لوگ احترام کے ساتھ قطار در قطار کھڑے ہوئے تھے۔ اور استقبال کے لیے بینڈ بج رہا تھا۔ مقبرے پر پہنچ کر روسی ادیبوں نے مختصر تقاریر کیں' ترانے سنائے' مرقد پر موم بتیاں روشن کیں اور پھول چڑھائے۔

پشکن کی موت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی نہایت حسین تھی جس کے چاہنے والے بہت تھے۔ پشکن اس حقیقت سے باخبر بھی تھا اور ظاہر ہے کہ بے نیاز بھی نہیں تھا۔ اپنے ایک فرانسیسی رقیب سے جو روس میں رہائش پذیر تھا ڈوئیل میں زخمی ہوا اور اس کے دو دن بعد مرگیا۔ اس زمانے میں اس قسم کے مقابلوں کو قانون کا تحفظ حاصل تھا

میخائیل میں کئی دن تقاریب کا سلسلہ جاری رہا۔ عالمی مشاعرہ اس جشن کا آخری پروگرام تھا۔ جو ایک صبح پشکن کی پہاڑیوں پر منعقد ہوا۔ خوبصورت نظارہ تھا۔ جنگل کے بیچ سرسبز پہاڑی میدان میں کہیں رنگ رنگ کے چھوٹے چھوٹے کیبن تھے کہیں سرخ اور سبز خیمے اور چھتریاں۔ دھوپ تیز ہوئی تو مشروب کی دکانیں بھی نظر آئیں۔ مندوبین کے لیے اونچائی پر اسٹیج بنایا گیا تھا جس کے سامنے سامعین کی نشست تھی جو ہزاروں کی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ اطراف میں روس کی تمام ریاستوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔

مشاعرے میں تمام شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ منظوم تراجم بھی فوراً" ہی سنائے جاتے

رہے۔ یاد رکھنے کے قابل محفل تھی۔ اس مشاعرے میں شرکت اچھی لگی۔

میخائیل سے ہم لوگ لینن گراڈ گئے جو ماسکو کے بعد روس کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اور تجارتی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک عرصے تک روس کا دارالحکومت بھی رہا ہے۔ یہ شہر روس کے اوّلین زار پیٹر نے سینٹ پیٹرس برگ کے نام سے آباد کیا تھا۔ زار پیٹر غریب طبقے کا ہمدرد تھا اس لیے وہاں اس حکمراں کا نام عزت اور تکریم سے لیا جاتا ہے۔

ایک چوک میں اس کا مجسمہ بھی موجود ہے۔ انقلابِ روس کے بعد اس شہر کا نام لینن گراڈ رکھ دیا گیا تھا جو موجودہ انقلاب کے بعد دوبارہ سینٹ پیٹرس برگ ہو گیا ہے۔ یہ شہر بحیرہ بالٹک کے ساحل پر آباد ہے۔ موسم صاف ہو تو دور سمندر میں فن لینڈ جزیرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ سردیوں میں یہ سمندر منجمد ہو جاتا ہے۔ موسم گرما میں اس میں جہاز چلتے رہتے ہیں۔

زار پیٹر نے کچھ عرصہ یورپ میں گزارا تھا اس لیے لینن گراڈ پہلا روسی شہر ہے جہاں عمارتوں میں یورپ کا طرزِ تعمیر بھی نظر آتا ہے۔ بڑا سجا ہوا اور خوبصورت شہر ہے۔ شاندار محل' پبلک عمارتیں اور کشادہ پارک۔ اس کے علاوہ میوزیم اور لائبریریاں ہیں۔ ہر روز ہی ہم نے کوئی نہ کوئی تاریخی عمارت دیکھی۔ کسی نہ کسی دلکش منظر تک جا پہنچے۔

لینن گراڈ کو شہرِ میوزیم کہتے ہیں۔ شہر کے اندر عمارتیں ابھی تک اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے طرزِ تعمیر کے مطابق محفوظ رکھی گئی ہیں۔ عمارتوں کے اندر تبدیلیاں آچکی ہیں لیکن باہر سے ان کا وہی پرانا رنگ روپ قائم ہے۔ شہر کے تقریباً" وسط میں دریا کے کنارے ایک شاہی محل ہے جس کے شاندار گرجا کا سنہرا کلس دور سے شہر کی منظر نمائی کرتا ہے۔

موسم گرم میں رہائش کے لیے حکمرانوں نے شہر کے نواح میں محل بنوائے تھے۔ جہاں جگہ جگہ مجسّمے اور فوارے تھے جو فن کاری کے دلکش زاویے پیش کر رہے تھے۔ شاہی قلعوں اور محل دو محلوں سے آگے بڑھے تو مصوری کے نادر نمونے بھی دیکھے اور

سنگ تراشی کے شاہکار بھی۔

ہم نے پشکن کا مدفن اس کے آبائی شہر میخائیل میں دیکھا تھا یہاں ہمیں وہ مکان خاص طور پر دکھایا گیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری دو دن بسر کیے تھے۔ وہ اس کی ایک دوست کا مکان تھا۔ اب اسے پشکن میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں اسی راستے سے اندر لے گئے جہاں سے وہ آخری بار گزرا تھا۔ جس جگہ پشکن زخمی ہوا تھا وہاں ایک مینار بنا دیا گیا ہے۔

ہمارے میزبان ہمیں اپنے تاریخی واقعات سے بھی آگاہ کرتے رہے۔ اس شہر نے دکھ بھی بہت جھیلے ہیں۔ انقلابِ روس میں اس شہر نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ اس عوامی انقلاب کا منصوبہ بھی اسی شہر میں بنایا گیا تھا۔ جس کا نقشہ اب ایک بڑی سیاہ دیوار پر دمکتے ہوئے ستارے کی شکل میں موجود ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی لینن گراڈ روس پر حملے کے لیے جرمن فوج کا سب سے بڑا اور اہم نشانہ تھا۔ جرمن فوج کے محاصرے کے دَوران میں اس شہر کے لاکھوں باشندے فاقوں سے مرگئے۔ شہری عمارتیں بمباری سے تباہ ہو گئیں مگر یہاں اسلحہ تیار ہوتا رہا اور مقابلہ جاری رہا۔ تمام مصائب کے باوجود ان لوگوں کے حوصلے اور یہ لوگ شکست آشنا نہیں ہوئے۔ ولادک بڑے افتخار سے ہمیں لینن گراڈ کی کہانی سنا رہا تھا۔

لینن گراڈ میں صبح و شام کا نظام خاصا مختلف اور دلچسپ ہے۔ اس کا علم تو تھا مگر برتنے کا موقع پہلی بار ملا۔ یوں تو ماسکو میں بھی رات کے دس گیارہ بجے تک اونچی عمارتوں کی گمٹیوں پر دھوپ کی کرچیاں نظر آتی رہتی تھیں مگر موسمِ گرما کا سورج لینن گراڈ پر زیادہ ہی مہربان تھا۔ ہم لوگ وہاں مئی کے آخر میں گئے تھے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہاں سورج کس وقت غروب ہوتا تھا۔ انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے موسم سرما میں وہاں سورج کی روشنی بہت تھوڑی دیر رہتی ہے۔ اور جون کے مہینے میں تقریباً" تین ہفتے لینن گراڈ کی راتیں بھی اجلی ہوتی ہیں۔

دلچسپ تجربہ تھا مگر نماز کے وقت کا تعین مشکل ہو گیا تھا۔ یوں بھی نمازِ فجر کے بعد

سارا دن سب لوگوں کے ساتھ مختلف پروگراموں میں گزر جاتا۔ رات کے کھانے کے بعد کمرے میں واپسی ہوتی تو بقیہ چاروں نمازیں پڑھتی تھی۔ لینن گراڈ میں دھوپ کا قیام زیادہ ہی طویل تھا۔ میں رات کو کمرے میں واپس آکر باہر بکھری ہوئی دھوپ کو دیکھتی اور ظہر اور عصر کی نماز بڑے اطمینان سے پڑھتی اور پھر مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے کھڑکی کے دبیز پردے کھینچ لیتی۔

لینن گراڈ سے ہمارا مختصر سا قافلہ جب تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے پہنچا تو ایسا لگا جیسے ہم اپنے ہی ملک کے کسی شہر میں آنکلے ہیں۔ پاکستان میں بھی ایک دو بار کچھ تاجک ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت خلیق اور زندہ دل لوگ ہیں۔ دوشنبے میں سب لوگوں سے مل کر کچھ اپنائیت کا سا احساس ہوا۔ ہمارے لیے ان کا رہن سہن اجنبی نہیں تھا۔

ان کی زبان فارسی ہے جو ہمارے یہاں رائج نہ سہی مگر ہمارے رشتے اس زبان سے بہت پرانے اور پائیدار ہیں۔ ان لوگوں کے نام بھی دیس پردیس کا فرق کم کرنے کے لیے کافی تھے۔ خانم موجودہ، لائق شیر علی، مومن قناعت اور باقی رحیم زادہ وغیرہ۔ لباس بھی وہی شلوار قمیص سے ملتا جلتا، کچھ خواتین نے سر پر رومال باندھا ہوا تھا۔ کچھ چادر اوڑھے ہوئے بھی نظر آئیں، کھانا بھی وہی تھا جو ہمارے گھروں میں پکتا ہے۔

اپنے کلام کے علاوہ جب وہ لوگ حافظ، سعدی، جامی، رومی، عمر خیام، غالب اور اقبال کے اشعار سناتے تھے تو محسوس ہوتا تھا جیسے ان لوگوں کو ہم ہمیشہ سے جانتے ہیں سدا ملتے رہے ہیں۔

وہاں جو فارسی رائج ہے اسے تاجک زبان کہا جاتا ہے جس کا رسم الخط روسی ہے۔ ان کی نئی نسل فارسی رسم الخط سے قطعی ناآشنا ہے۔ فارسی میں شعر کہتے ہیں اور روسی طرز تحریر میں لکھتے ہیں۔ خانم موجودہ نے ایک خوبصورت شعر سنایا۔ میں نے فرمائش کی کہ یہ شعر اپنے دستخط کے ساتھ لکھ کر دیجیے شاعرہ فارسی رسم الخط میں لکھنا نہیں جانتی تھی۔ وہاں موجود ایک بزرگ شاعر کی وساطت سے میری فرمائش پوری کی۔ دوشنبے میں ہمارے

خیر مقدم کے لیے مشاعرے اور مختلف ادبی تقاریب منعقد ہوتی رہیں۔ ایک ادیب کے بیٹے کی شادی میں شرکت کا بھی موقع ملا۔ جہاں مشرقی اور مغربی رسوم کا دلچسپ امتزاج دیکھا۔ اس کے علاوہ شہر کے پُر فضا مقامات کی سیر بھی کرائی گئی۔

دو شنبے کی سرحدیں افغانستان' ایران اور چین کے کوہستانی سلسلوں سے ملتی ہیں۔ پُر پیچ اور شاداب پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے وہ لوگ ہمیں نوریک یا نورے ڈیم دکھانے بھی لے گئے جہاں دریا کے پانی سے برقی قوت حاصل کی جاتی ہے جس نے اس ریاست کے لیے ترقی کی راہیں کھول دی ہیں اور ابھی اس ڈیم کی توسیع کا کام جاری تھا۔ دو شنبے صنعتی شہر بھی ہے اور وہاں ثقافتی مراکز بھی بہت ہیں دانش گاہ علما' دانش گاہ موسیقی اور دانش گاہ طب اور سائنس وغیرہ ہم نے کچھ لائبریریاں اور دانش گاہیں اندر جاکر دیکھیں کچھ کا نظارہ باہر سے کیا۔

ایک دن عظیم دانشوروں کے مجسمے دکھانے بھی لے گئے۔ جن میں صدرالدین عینی' ترسون زادہ اور بابا جان غفوروف وغیرہ کے علاوہ قدیم مشاہیر کے مجسمے بھی تھے سب نام مجھے یاد نہیں۔ وہ پھول یاد ہیں جو ان کے قدموں میں رکھے ہوئے تھے۔ رودکی کے مجسمے کے پاس گلگشتِ رودکی ہے جہاں پھول ہی پھول تھے۔

دو شنبے میں جہاں جہاں ہم گئے ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر فردوسی لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں ملکی اور غیر ملکی نادر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ایک کمرے میں قرآن کریم کے مجلد اور مرصع گرانقدر قلمی نسخے رکھے ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ایک اور بڑے ہال میں دیواروں پر مشاہیر کی تصویروں کے بڑے بڑے فریم سجے ہوئے تھے جن میں نظامی' رودکی' فردوسی' حافظ' جامی' عمر خیام' ابن سینا' غالب' اقبال اور دوسرے عظیم شاعر اور دانشور موجود تھے۔ تصویروں کے علاوہ ان میں سے اکثر شعراء کے کلام کے مجلد قلمی نسخے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں فردوسی کا نہایت آراستہ 'شاہنامہ' بھی تھا اور کلیات جامی کا زیبا ترین نسخہ بھی۔

نظامی' رودکی اور جامی جیسی کئی باکمال شخصیات کا تعلق وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں

سے تھا۔ یہ عظیم لوگ اہل دل بھی تھے اور اہلِ نظر بھی۔ موجودہ دور میں ان جیسے نامور شاعر تو وہاں نہیں ہیں لیکن سنا ہے کہ ان ریاستوں میں عام نگاہوں سے اوجھل کہیں کہیں صوفیا کے مراکز اب بھی قائم ہیں۔

سویت یونین میں ہمارا قیام تقریباً بیس دن رہا اور یہ قیام دلکشا تھا۔ کچھ نام پتے کچھ تصویریں اور جو کتابیں مجھے وہاں تحفتہً ملتی رہیں ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں جن میں جامی کا خوبصورت دیوان بھی ہے۔

ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کے علاوہ وہاں کی عام زندگی کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ان تمام حکایات کے باوجود جو ہم نے سن رکھی تھیں وہاں نہایت واضح طبقاتی فرق نظر آیا۔ امیر طبقہ کس حد تک امیر ہے اس کا اندازہ لگانا میرے لیے ناممکن تھا مگر کم مراعات یافتہ طبقے کی زندگی کا چلن وہی تھا جو عام طور پر ہمارے شہروں میں ہے وہاں مشترکہ خاندان کا رواج بھی ہے۔ ان لوگوں کو مغربی ممالک کی طرح "خانہ بزرگاں" (اولڈ پیپل ہوم) تعمیر کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی جہاں بوڑھے ماں باپ اپنی موت کا انتظار کرنے کے لیے داخل کردیے جاتے ہیں۔ دو شنبے میں خصوصاً" مشرقی تہذیب کی پاسداری کسی نہ کسی حد تک موجود تھی۔

وہاں بنیادی سہولتیں سب کو حاصل تھیں۔ بڑھاپے اور معذوری کی پنشن اور علاج معالجہ وغیرہ۔ بچوں کی تعلیم بھی حکومت کی ذمہ داری تھی لیکن اعلیٰ تعلیم اور اس کے لیے مضامین کے انتخاب کا فیصلہ بھی حکومت ہی کی مرضی پر منحصر تھا۔ میں ۷۸ء میں وہاں گئی تھی۔

خدا کے فضل وکرم سے سفر تو میں نے بہت کیے ہیں لیکن سفرنامے لکھنے کی طرف کبھی طبیعت راغب نہیں ہوئی۔ یہ جو چند مقامات کا کچھ نہ کچھ ذکر آگیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ خوشیاں بھی میرے حسابِ شب و روز میں شریک ہیں۔ جو ساعتیں فراغت اور راحت کی نصیب ہوجائیں ان کا تذکرہ بھی شکرانۂ نعمت سمجھتی ہوں اور قلم کو بہانہ بنا کر ایک بار پھر ان ساعتوں کا لمس بھی محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے کی کئی کہانیاں ان کہی

بھی رہ گئیں۔ کسی سفر میں یادداشت کے لیے کبھی کوئی پرچی پاس نہیں رکھی ڈائری لکھنا مدّتوں پہلے ترک کرچکی ہوں بس یاد کے دریچے سے کبھی کوئی منظر دیکھ لیتی ہوں اور کبھی کسی بستی کسی باغ و راغ میں جا نکلتی ہوں ملکوں ملکوں گھومنے والے ایسے اناڑی کہاں ہوتے ہوں گے۔

سفر تو میں نے صدیوں کے بیچ بھی کیا ہے اور اس سفر سے اپنی کتاب "غزل نما" ساتھ لے کر واپس آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے "غزل نما" میرا سفرنامہ ہے۔ کچھ جانے پہچانے کچھ بُھولے بسرے قدیم شعرا کے کلام کے جھروکوں سے میں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کا نظارہ کیا تھا تھوڑی دیر وہاں قیام بھی کیا۔ ان ہواؤں میں سانس بھی لی۔ اردو زبان اور اردو شاعری دونوں کو قدم قدم چلتے اور آئینے آئینے بنتے سنورتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس دَور کے کچھ شعرا کا تعارف اور انتخابِ کلام مرتّب کرتے ہوئے اس عہد کے خدوخال بھی نگاہوں کے سامنے تھے۔ ان شعرا میں سے کئی آج بھی زندہ ہیں اور وہ جو وقت کے غبار میں بے نام و نمود ہوئے کچھ اشعار ان کے بھی غیرفانی ہیں۔

"غزل نما" انہیں صدیوں کے بیچ گزارے ہوئے چند لمحوں کا سفرنامہ ہے "غزل نما" کی دوسری جلد ابھی مجھ پر قرض ہے۔

جو رہی سو بے خبری رہی

یہ خود نوشت ایک عام سی لڑکی اور ایک روایتی گھریلو عورت کی چھوٹی سی کہانی ہے جس میں کوئی کہانی بھی نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ لڑکی اکیلی تھی اور بہت اکیلی اپنے دل کی تنہائی میں گرفتار اور وہ عورت چار دیواروں کے حصار میں رہ کر بھی اپنے وجود کی پہنائیوں میں سرگرداں رہی۔ اس نے سوچا کہ میں سائے کا پیچھا نہیں کروں گی۔ اب میرے سائے کو میرے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا جل کی مچھلی ریت پر جینے کا ہنر سیکھنا چاہتی تھی۔

یہ جو شعروسخن کا سفر ہے یہ اپنی ذات سے ہی شروع ہوتا ہے اور پھر حسبِ توفیق حیات اور کائنات تک پہنچتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ میں نے تو صرف لمحۂ موجود سے باتیں کی ہیں۔ میں اپنی شاعری کو فن کہنا پسند نہیں کرتی۔ میرے لیے شاعری حیات کا منظر نامہ بھی ہے اور بیانِ حیات بھی۔ اور وہ جو لڑکی تھی وہ تو اپنے اشعار کی دنیا میں ہی سانس لے رہی تھی۔

آنکھیں کیا کچھ نہیں دیکھتیں دشت و صحرا بھی اور گل و گلزار بھی۔ لمحوں کی انگلی تھام کر چلی تو لو دیتے ہوئے چراغوں کا اجالا بھی دیکھا اور پھر بجھتے ہوئے چراغوں کا دھواں بھی۔ اپنی زندگی بیک وقت ذاتی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی' تصویریں بنتی بھی ہیں بگڑتی بھی ہیں۔ کبھی حد نگاہ تک کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوئے' سراب ہی سراب' تشنگی ہی تشنگی کبھی پیروں کے نیچے بھیگی ہوئی گھاس کا دلپذیر لمس' کسی پیڑ کی مہربان چھاؤں' آواز دیتا ہوا کوئی رنگ' سانس لیتی ہوئی کوئی خوشبو۔ یہ سب کچھ تو ہوتا رہا ہے ہوتا رہے گا۔ سارے نظاروں میں اپنا تو وہی ہے جو دو پلکوں کے بیچ بسیرا کرلے۔

شاعری کی دنیا میں ادا بدایونی اور ادا جعفری کے درمیان بارہ پندرہ برس کی مسافت حائل رہی وجوہ کچھ بھی ہوں مگر ایسا ہوا کہ آئینے دُھندلا گئے تھے۔ وہاں میں تو موجود تھی مگر وہ شاعرہ کہیں نہیں تھی۔

یہ بہت طویل عرصہ تھا اور بڑی نامانوس مسافت۔ دشتِ بے آب و گیاہ بھی اور خیاباں خیاباں گل و سمن بھی۔ اپنے بچوں' اپنے گھر میں بہت خوش رہی جو میرے مولا کا بہت بڑا کرم ہے مگر تمام وقت ایک احساسِ محرومی بھی تھا جو دل میں چُبھتا رہتا تھا لب جوئبار بھی تھی اور پیاسی بھی تھی۔ اب اس معاملے میں سُود و زیاں کا فیصلہ کیسے ہو۔

اس خودنوشت کے بارے میں مجھے ایک وضاحت بھی کرنا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے کبھی کسی سے دکھ نہ پہنچا ہو۔ دوستوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے مگر جن باتوں نے دل دکھایا انہیں اپنی یادوں میں کیوں شریک رکھا جائے یہ زندگی بہت مختصر ہے اور عفو و درگزر میرے مولا کی صفت ہے اور اسے پسند ہے ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا۔

مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آئے ہیں اکثر دعاؤں میں

میں نے اس سرگزشت میں صرف انہیں لوگوں کا ذکر کیا ہے اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہیں کہیں صرف ان کے نام لکھے ہیں جن سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوتے رہے اور مل کر خوشی ہوئی۔ شاید ایسے کئی عزیز اور محترم نام لکھنے سے رہ بھی گئے ہوں جس کا افسوس رہے گا۔ ہماری یادداشت کبھی کبھی ہمارے ساتھ بے وفائی بھی کرجاتی ہے۔

شعر و ادب کی دنیا میں' میں نے جو سفر شروع کیا تھا وہ شدید روایتی ماحول اور قدامت پسند خاندانی پس منظر کی وجہ سے میرے لیے زیادہ ہی دشوار اور حوصلہ طلب تھا۔ پیروں میں قدیم رسم و رواج کی زنجیریں تھیں جن سے سمجھوتا منظور نہیں تھا اور جنہیں توڑنے

کی طاقت بھی نہیں تھی۔

میرا یہ سفر آسان نہیں تھا۔ مجھے تو گنجان خاردار جھاڑیوں میں راستہ تلاش کرنا تھا۔ دو جھجکتے ہوئے پیروں کو ایک پگڈنڈی تراشنا تھی۔ وہی پگڈنڈی جسے وقت کی رفتار نے آج ایک ہموار اور روشن رہ گزار بنا دیا ہے اور جہاں اب میں تنہا بھی نہیں ہوں۔ اور یہ بھی میرے مولا کا احسان ہے کہ میں آج تک تھکی نہیں۔

حالات کی نامہربانیاں کبھی کبھی مہربانیاں بھی بن جاتی ہیں۔ میں نے پہلے پہل آسمان کو روزنِ زنداں سے دیکھا تھا۔ یہ زندگی جو انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے میں اسے پوری آب و تاب کے ساتھ کہاں دیکھ سکی تھی۔ میرے پاس تو یہ بہت سے لبادوں میں ملبوس اور مستور آئی تھی۔ اس کی کچھ جھلکیاں ہی نظر آ سکی تھیں۔ مگر یہی احساس میرے لیے تسکینِ دل و جاں کا کچھ نہ کچھ سامان بھی ثابت ہوا۔ شاعری کے سہارے مجھے اظہار کی جو آسودگی میّسر آئی وہ بہت سی محرومیوں کی تلافی کا بہانہ بن گئی۔ اس کے بعد زندگی سے میرے تعلّقات بیک وقت حریفانہ بھی رہے اور دوستانہ بھی۔

میں نے جو راہِ سخن میں پیش آنے والی اپنی ذاتی دشواریوں کا ذکر کیا ہے اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں مجھ سے پہلے کسی عورت نے شاعری نہیں کی۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ تذکروں میں اٹھارویں صدی تک کی شاعرات کے نام موجود ہیں اور انتخاب کلام بھی۔ ان میں مہ لقا بائی چندا کا نام نمایاں ہے۔ وہ پہلی شاعرہ تھی جس کا دیوان ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا اور غلام صمدانی گوہر نے "حیاتِ مہ لقا" کے نام سے اس کے حالاتِ زندگی بھی شائع کیے۔ تذکروں میں مہ لقا بائی کے علاوہ بھی قادرالکلام شاعرات کے نام ملتے ہیں مگر یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ خواتین کی شاعری کے ابتدائی دَور کا جو کلام ہمارے سامنے آیا ہے ان میں زیادہ تر شاعرات کا تعلق اربابِ نشاط کے طبقے سے تھا جن کی راہِ سخن میں کوئی مجبوری حائل نہیں تھی بات کرنا انہیں مشکل نہیں تھا ان کے علاوہ کچھ دوسری خواتین بھی اس زمانے میں شعر کہہ رہی تھیں جن کے نام اور منتخب اشعار تذکروں میں موجود ہیں اور یہ اشعار بے شک قابلِ داد ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر تک خواتین کی شاعری کا پہلا دور تھا۔ میں صرف اردو شاعری کی بات کر رہی ہوں۔

وقت کے فرمان کے مطابق خاتونِ خانہ پر عائد پابندیاں کم ہوتی گئیں اور اس کے لیے حصول علم کے دروازے کھلتے گئے۔ یہ خوش قدم عہد اردو ادب میں خواتین کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔ اس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوا۔ اس زمانے میں خواتین کے رسالے بھی جاری ہوئے جن کی وجہ سے ان میں ادبی ذوق عام ہوا اور انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں لکھنا شروع کیا۔ ان خواتین کی شاعری اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر اس دَور میں خواتین کو آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا گیا۔ ابھی تک ان کے سامنے رکاوٹیں بھی تھیں' اندیشے بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری اپنی کوئی پہچان پیش کرنے سے قاصر رہی۔ یقیناً" یہ ان کی مجبوری ہی تھی کہ یہ شاعرات روایتی اور تقلیدی شاعری کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر دور کے شعرا حضرات میں بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں جو تقلیدی شاعری میں اپنی پوری عمر گزار دیتے ہیں۔

میں خواتین کی شاعری کے جس دوسرے دَور کا ذکر کر رہی ہوں وہ کسی منفرد لہجے کی گواہی نہیں دیتا۔ ان خواتین کی غزل میں عموماً" طرز بیان بھی وہی رہا جو اس دَور کے شعرا کے کلام میں رائج تھا۔ صرف ان کے نام سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ اشعار کسی خاتون نے لکھے ہیں۔ کبھی کبھی انہوں نے اپنا نام بھی حروف تہجی کے پردے میں چھپانا مناسب سمجھا۔ مثلاً" ز۔ خ۔ ش۔ جو اس دور کی ایک اہم اور قادر الکلام شاعرہ تھی۔ اس کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا تھا جو قومی اور تاریخی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس کی اشاعت نہیں ہو سکی۔ شاید کچھ غزلیں آج بھی کہیں محفوظ ہوں۔

خواتین کی شاعری کے تیسرے دَور کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے جو مزید ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آج تک جاری ہے۔ اس دَور کا ذکر ترقی پسند تحریک کا نام لیے بغیر

نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک کے سیاسی اور نظریاتی عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا تھا اور کیا گیا لیکن اس تحریک نے اردو ادب میں تاریخ ساز رجحانات کو فروغ دیا۔ اس کا تخاطب براہِ راست زندگی کی سچائیوں سے تھا۔ اس لیے اس کے اثرات ہمہ گیر تھے۔

اس دور میں بہت سی تلخ حقیقتوں پر مبنی شاہکار افسانے تخلیق ہو رہے تھے۔ شاعری بار بار کے دہرائے ہوئے روایتی مضامین کو رد کر رہی تھی۔ نئے موضوعات تھے اور جدید طرزِ اظہار رائج ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں اردو شاعری نئے اسالیب سخن سے متعارف ہوئی جو وسعت بیان کے لیے ناگزیر تھے جدید ادب کا آغاز اور ارتقا بھی اسی ادبی تحریک کا عطیہ ہے۔

شاعری میں خواتین کو ان کا اپنا اور سچا لہجہ بھی اسی ادبی تحریک نے دیا ہے جو اپنی واضح شناخت رکھتا ہے خود وہ تنظیم رہی یا نہ رہی مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات دور رس ہیں خصوصاً سماجی زندگی کی تلخیاں حدودِ بیاں تک آئیں۔

جب میں نے شعر کہنا شروع کیا وہ ترقی پسند ادب کے عروج کا زمانہ تھا۔ میں اس کی باقاعدہ ممبر کبھی نہیں رہی مگر ان دُھندلکوں میں جہاں میں تھی نئے شعروادب کا خود اعتماد مزاج اور لہجہ میرے لیے ایک نئے موسم کا سندیسہ تھا اور دلکشا تھا۔ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی اگر آسان نہیں تھی تو اب اتنی مشکل بھی نہیں رہی۔ سوچ اور الفاظ کے بیچ فاصلے کم ہونے لگے۔ خوابوں کو آئینے میسّر آجائیں اتنی تسلّی بھی بہت ہوتی ہے۔ یہی فضا تھی جہاں میں نے سنگین دیواروں سے بیزاری کا واضح اظہار کیا۔ نئے افق نے آواز دی تو حویلی کی اونچی اونچی دیواریں چھوٹی پڑ گئیں۔ اپنی بات اور اپنے ہی لہجے میں کہنے کی جرأت ہوئی اور یہ میرے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میری پہلی کتاب ہے جو ۴۷ء میں مرتب کر کے ناشر کو بھیج دی تھی اور ۵۰ میں شائع ہوئی، میری شاعری کا آغاز نظم گوئی سے ہوا تھا۔

مجھے احساس ہے کہ مردوں کے اس معاشرے میں جہاں عورت کی اپنی کوئی حقیقت ہی

نہیں تھی' میرا احتجاج بھی بلند آہنگ نہیں تھا۔ اسے احتجاج کہوں بھی یا نہیں۔ بہرحال اسے نسل در نسل منتقل ہونے والی فرسودہ روایات سے انحراف یقیناً" کہا جاسکتا ہے۔ اس وقت یہ پہلی پہلی جراَتِ اظہار تھی اور خواتین کی شاعری میں ایک نئے اور اپنے لہجے کا آغاز بھی۔

اونچی آواز میں بات کرنا میرے مزاج میں نہیں تھا اور سب دیواریں مسمار کرنا میں نے کبھی چاہا بھی نہیں مگر میں نے عورت کو مجبوری اور محکومی کی زندگی بسر کرتے دیکھا تھا اور اس دکھ کو سہا بھی تھا۔ میری شاعری اسی دکھ کے نام تھی۔ اس بے برگ و نوا زندگی کی تصویر نمائی مجھ پر لازم تھی اور اس وقت اس ماحول کے فرسودہ اور اذیت آفریں رواج کی قدیم روایات سے انحراف اور اس کے اظہار کا تجربہ میرے لیے دل آویز بھی تھا اور بہت قیمتی بھی۔ اور یہ کتنا ضدی تجربہ ہے اسے میں جانتی ہوں۔

کچھ عرصے کے بعد تازہ واردانِ بساطِ سخن کے کلام میں تمام ناانصافیوں کے خلاف احتجاج بھی پوری توانائی کے ساتھ سامنے آیا۔ معاشرتی زندگی میں انقلاب تو نہیں آیا مگر دیکھتے دیکھتے وقت نے ثابت کردیا اور معاشرہ اسے ماننے پر مجبور ہوا کہ عورت نہ ذہنی طور پر پس ماندہ ہے نہ حسیاتی لحاظ سے مفلس۔ میرا لہجہ بلند آہنگ آج بھی نہیں ہے مگر مجھے خواتین کی شاعری میں احتجاج کی یہ بے جھجک بے تامل اونچی آواز اچھی لگتی ہے۔ اس زندگی کی تصویر کشی کے لیے گہرے رنگ بھی درکار تھے۔

ادھر جب یورپ اور امریکہ میں نسائیت کی تحریک (فیمنسٹ موومنٹ) شروع ہوئی جسے سِلویا پلاتھ کی المناک موت نے نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ تو ہماری خواتین کی شاعری میں کہیں کہیں آزادیٔ اظہار کا جارحانہ انداز بھی آگیا۔ میں اسے شدید ردِّعمل کی شاعری کہتی ہوں۔ یہ سب کچھ اپنے اپنے مزاج اور اپنے اپنے مشاہدات پر بھی منحصر ہوتا ہے۔

خواتین کی شاعری کے تیسرے موجودہ دور میں سخن ور خواتین کے نہایت معتبر نام موجود ہیں' تعداد میں یہ نام ابھی کم سہی لیکن یہ شاعری نمایاں حیثیت اور مقام رکھتی ہے۔

وہ جسے صنفِ نازک کہہ کر حصار در حصار رکھا گیا تھا اب قافلۂ حیات میں محض گردِ کارواں کی طرح شریک نہیں ہے گیلی لکڑی کی طرح سلگنے والی تاریک راہوں میں چراغوں کی طرح جلنا بھی جانتی ہے اور پھر چراغوں سے چراغ جلتے رہے ہیں۔ صداقت اور زندگی پر اعتبار کیوں نہ آئے۔

اس شاعری میں نسائیت کی نمائندگی بھی کھل کر ہوئی جو وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ مگر آج مشرقی عورت اپنی ذات کے سوا بھی پورے معاشرے کے زخموں اور جراحتوں کی گواہ ہے اور ہر ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ غمِ دوراں سے اغماض ممکن ہی کہاں ہے۔ خواتین کی شاعری محض نسائیت کے حوالے تک محدود نہیں رہ سکتی۔ شاعری کو مردانہ اور زنانہ خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ نہ اس پر اصرار کیا جاسکتا ہے۔

شاعری بھی زندگی کی طرح کسی ایک موڑ پر ٹھٹک کر کھڑی نہیں رہ جاتی۔ ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ہر عہد کی شاعری اپنی ترجیحات خود متعین کرتی ہے۔ کبھی ارادی اور کبھی غیر محسوس طور پر شعر و ادب کی دنیا مسلسل تغیر آشنا رہی ہے۔ نئی لفظیات کا دور آتا ہے۔ نئے محاورے جنم لیتے ہیں۔ کچھ الفاظ اور رویے اپنی عمر پوری کر چکے ہوتے ہیں۔ تخلیق ادب اور زبان دونوں کے تسلسل اور قیام کا ثبوت بھی یہی ہوتا ہے۔

ایک جیتا جاگتا انسان زندگی اس کے پورے تناظر میں دیکھتا ہے پیرایۂ اظہار کچھ بھی ہو اپنے عہد کے حقایق سے چشم پوشی یا بے اعتنائی ممکن بھی نہیں ہوتی اور جائز بھی نہیں۔ اپنے قلم کو معاشرے کے صرف ایک گوشے کی تصویر کشی کے لیے کیوں وقف کیا جائے۔

معاشرہ آج بھی مرد کا ہے۔ عورت ذاتی طور پر اب بھی بہت کچھ سہہ رہی ہے۔ بہت سی ناانصافیاں اب بھی اس کا مقدر ہیں۔ مگر اب اس کی عمر صرف چہار دیواری کے حصار میں بسر نہیں ہوتی وہ اپنے عہد کے مسائل کا ادراک بھی رکھتی ہے اور اقدار کی شکست

وریخت کا احساس بھی۔ انحطاط پذیر سیاسی ' سماجی اور معاشی عوامل سے اس کا بھی اتنا ہی واسطہ ہے جتنا مَردوں کا ہے۔ میں آگہی کے جس علاقے کا ذکر کر رہی ہوں وہاں وہ اپنے ذاتی دکھوں کی گٹھری اُٹھائے اجتماعی زندگی کے کرب میں بھی مکمل شریک ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ پھر بھی وہ جینے کی سکت رکھتی ہے اور جینے کے لیے جدوجہد کی بھی۔ میری نسل اور اس کے بعد کی نسل بھی بہت سے امتحانوں سے گزری ہے۔ سیاسی اونچ نیچ اور وہ بھی کیسی بلندی اور کیسی پستی۔ آدرش اور تہذیب کا انحطاط اور پامالی۔ دیکھنے والوں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ آمریت کے زمانے بھی جھیلے۔

شاعری اپنی سوانح عمری بھی ہوتی ہے اور اپنے عہد کے شب و روز کا منظر نامہ بھی۔ عورت کے دکھ درد میں نے آنکھ کھولتے ہی دیکھے اور بہت قریب سے دیکھے ہیں۔ عورت کا پہلا روپ جو میں نے دیکھا وہ میری ماں کا تھا۔ آندھیوں میں چراغ کی لَو اونچی رکھنے والے ہاتھ مجھے یاد ہیں۔

میری شاعری میں بغاوت کے منصب پر فائز عورت بھی نہیں ملے گی اور ان تمام مصائب کے باوجود جو وہ جھیلتی آئی ہے تھکی ہاری لاچار عورت بھی نہیں۔ میرے دل نے کبھی اسے شکست خوردہ تسلیم نہیں کیا۔ میری نظموں میں عورت ترحم طلب نہیں ہے۔ وہ زندگی کو برتنا جانتی ہے۔ اس کے دکھ بیان کرتے ہوئے میرے لہجے میں تلخی یا جھنجلاہٹ نہیں آئی۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے چند نظموں کے عنوان لکھ رہی ہوں۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" "میرے خواب ادھورے" "وصال و ہجر کے موسم" "شام و سحر کے درمیاں" اور "شجرِ نازاں" وغیرہ۔ میرا لہجہ دھیما ہی رہا۔ ہاں اپنے مشاہدات اور احساسات پوری صداقت کے ساتھ نظم کیے ہیں اور ابھی تک ان کا قرض بھی باقی ہے۔

زندگی تو بڑی وسعتیں بڑی بے کرانیاں رکھتی ہے۔ میری رسائی تو کچھ لمحوں تک ہی رہی ہے جنھوں نے مجھ سے باتیں کی ہیں۔ جنھیں میں نے اپنے دکھ درد سنائے ہیں اور کبھی جن کی آنچ اپنے دل میں محسوس کی ہے۔ سو میری کہانی تو لمحوں ہی کی کہانی ہے۔

میری سوچ ہے اور میں ہوں۔ ایسے میں نہ جدیدیت کے فیشن کا دھیان آیا نہ روایت کی روایتوں سے واسطہ رکھا۔ میں نے اپنے قلم کو صرف نسائیت کے نام بھی وقف نہیں کیا۔ میرے لیے یہ تسلّی کافی ہے کہ اپنے قلم کے آگے شرمندہ کبھی نہیں رہی نہ کسی تذبذب میں گرفتار رہی۔ میں نے تو کبھی عام مشاعروں میں شرکت بھی نہیں کی۔ غیر ممالک سے بھی بُلاوے آتے رہے اور آتے رہتے ہیں۔ میں اس رسم کو نباہنے پر بھی آمادہ نہیں ہوئی۔ یہ خوشی کیا کم ہے کہ وسائل موجود ہوتے ہوئے بھی کبھی اپنی کسی کتاب کی تقریبِ رُونمائی منعقد نہیں ہونے دی۔ نہ شہرت کا کوئی آسان راستہ اختیار کیا۔ ادبی دنیا کی سیاست سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھا۔ شاید ان فیصلوں نے مجھے نقصان پہنچایا ہو مگر اس سلسلے میں قطعی مطمئن ہوں۔

اب تو جیسے صدیاں بیت گئیں۔ ایک لحظۂ خواب آشنا کے اکسانے پر حرفِ سخن کی یا اپنی تلاش میں نکلی تھی' وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔ کن راستوں گزری کن وادیوں پہنچی اس کا حساب میں کیوں رکھوں' میرے لیے تو شکر کا مقام یہی ہے کہ راہ سفر ابھی سامنے ہے اور ذوقِ سفر ساتھ ہے۔

جو گفتگو "بیزاری" اور "دو نین کنول" سے شروع ہوئی تھی وہ اپنے بچوں سے تخاطب تک بھی پہنچی اپنے بچوں کے نام کچھ لکھنا راحت آفریں ہے۔ میرے لیے یہ بہت منزہ موضوعاتِ سخن تھے مگر قیام تو کسی مقام پر بھی واجب نہیں تھا۔ کوئی اگلا موڑ کسی اور ہی منظر تک پہنچا دیتا ہے اور ہر منظر مسافر نواز کہاں ہوتا ہے۔ شاعر اور ادیب اکہری زندگی کب بسر کرسکتا اپنی بساط بھر اپنی ذات کے علاوہ بھی اندھیرے اجالے برتنا ہوتے ہیں۔

بھیگی بھیگی پلکوں والی
جتنی آنکھیں ہیں' میری ہیں
دُکھ کی فصلیں کاٹنے والے

جتنے ہاتھ ہیں میرے ہیں
شاخ سے ٹوٹی کچی کلیاں
آگ میں جھلسے کومل مکھڑے
اُلجھی اُلجھی لٹ بھی میری
دھجی دھجی آنچل بھی
کالی رات کی چادر اوڑھے
اُجلے دن کا رستہ دیکھ رہی ہوں

اُجلے دن کا رستہ ہمارے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی قومیں دیکھ رہی ہیں اور دیکھتی رہی ہیں۔ انسان سرکٹ بھی رہا ہے اور دیس ہو یا بدیس کبھی اپنوں کبھی غیروں کے ہاتھوں مجروح اور نوحہ کناں رہنے پر مجبور بھی ہوا ہے۔

اردو ادب تہی داماں کبھی نہیں رہا اور آج تو دنیا کا گھیرا بھی سمٹ گیا ہے۔ فاصلے کم ہوئے دکھ کچھ اور بڑھ گئے ہیں جگ بیتی بھی آپ بیتی بن گئی ہے۔ عالم اسباب میں انسانیت کا تار تار گریباں اور ظالم و مظلوم دونوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کچھ غم دل میں رہے تو کچھ حرف بیاں تک آئے ہیں۔ جدید افسانے ہوں نظمیں ہوں یا غزل کے اشعار، شاعر اور ادیب کسی نہ کسی حد تک کسی نہ کسی طور سبھی دکھوں کی گواہی دیتے رہے ہیں۔ موضوعات سخن پہلے بھی محدود نہیں تھے آج بھی نہیں ہیں۔

میری نظم "مسجد اقصیٰ" مسلمان حکمرانوں کی بے ضمیری کا نوحہ بھی ہے۔ سقوط ڈھاکہ بھی ایک آمر کی بے تدبیری اور نشہ اقتدار کا نتیجہ تھا۔ ورنہ جغرافیائی دوری اور لسانی اختلافات کے باوجود کوئی ایسا حل تلاش کیا جاسکتا تھا جس سے پوری قوم کی آبرو مجروح نہ ہوتی نہ اتنی خوں ریزی کی نوبت آتی اور ایسی دوریاں بھی نہیں ہوتیں۔ میں نے گم ہوتے ہوئے اور گم شدہ مشرقی پاکستان کے نام بھی کئی نوحے لکھے۔

میں بنگلہ دیش کبھی نہیں گئی مشرقی پاکستان بار بار جاتی رہی تھی وہاں ہم دونوں کے

دوست بھی تھے اور بنگال کی سرزمین کا جادو بھی۔

مشرقی پاکستان کا ایک خواب جیسا منظر مجھے ابھی تک یاد ہے۔ چٹا گانگ کی پہاڑیوں میں ایک دن ہم لوگ بدھ کا مندر ڈھونڈنے نکلے ڈھونڈنے کا لفظ شاید غلط ہے کیونکہ راستہ پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔ وہ ساحل سمندر کے قریب ایک سرسبز چٹان تھی جہاں بدھ کا استھان بنایا گیا تھا۔ دور سے یہ جگہ نظر نہیں آرہی تھی درختوں کی سبز قبائیں تھیں اور ان پر مالا جیسی جھولتی ہوئی ہری بھری بیلیں۔ پیروں کے نیچے بھی زمردیں فرش تھا۔ ہم لوگ ایک پگڈنڈی پر جو اس مندر کے زائرین کے قدموں نے بنائی ہوگی چلتے رہے۔ اچانک ہی سامنے تھوڑی دور پر ایک کٹیا سی نظر آئی۔ جس کے اطراف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں اور دروازے پر بھی ایک پیڑ کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں یا کوئی بیل تھی جو جھالر کی طرح لٹکی ہوئی تھی۔

ہمارے قافلے میں چار پانچ لوگ تھے۔ نزدیک پہنچ کر ہم لوگ ٹھٹکے کہ بہرحال یہ ایک فرقے کی عبادت گاہ تھی۔ وہاں ہمارا داخلہ ممکن ہو یا نہ ہو۔ اتنے میں سامنے بے کواڑ دروازے میں کھڑا ہوا ایک سنت یا پروہت نظر آیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے در پر جھکی ہوئی شاخوں کو ہٹا رہا تھا۔ شاید اس نے ہمارے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ ہم نے مسکراہٹ کی جھلک اس کے چہرے پر دیکھی۔ گویا اس سکوں آشنا مطمئن انسان نے خندہ پیشانی سے ہمیں بدھ کے مندر میں داخلے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ پروہت یا بھکشو ایک چھوٹے سے چبوترے کے آگے کھڑا ہوا تھا۔ نہ ہم نے کچھ کہا نہ پروہت کچھ بولا۔ مندر کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس چبوترے پر کچھ خودرو پھول اور کچھ پیالوں میں پانی اور چاول وغیرہ' مختلف کھانے کی چیزیں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ بدھ سے عقیدت کے اظہار یا شاید عبادت کا ایک طریقہ تھا۔ وہ شہزادہ جو محل دو محلے تیاگ کر اپنی تلاش میں نکلا تھا اور مدتوں دنیا کے بلاووں سے بے نیاز اس کا سفر ایک ہی محور اور ایک ہی مرکز پر جاری رہا تھا۔ یہاں گویا اس کے لیے ضیافت کا اہتمام تھا یا پھر یہ اسی سے بھکشا لینے کا ایک انداز تھا۔

وہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ خاموش علاقہ۔ وہ چھوٹی سے علامتی عبادت گاہ اور پروہت کا آسودہ چہرہ۔ ہم کٹیا کے اندر تھے اور چپ تھے۔ باہر سے چڑیوں کی ملی جلی آوازیں کسی بھجن کی طرح کان میں آرہی تھیں۔ دلکش قدرتی مناظر میں رچا بسا ہوا ایسا طمانیت آفریں ماحول تھا کہ نروان کے معنی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔

باہر آئی تو سوچا کہ جاتے جاتے اس طلسمی ماحول کو اپنا نام تو بتاتی جاؤں۔ کسی اہم جگہ جاتے ہیں تو اکثر وزیٹرز بک پر دستخط کرنے کا دستور ہے۔ وہ جس نے پیڑ کی چھاؤں میں نروان حاصل کیا اور خود چھتنار بن گیا اس کے حوالے سے وہ کٹیا اپنا مشاہدہ اور تاثر رقم کرنے کی کتاب تو یقیناً" تھی سوچا یہاں دستخط کرنا ضروری ہے۔ درخت جھوم رہے ہیں کسی برگ سبز پر اپنا نام لکھ دوں مگر دل نے ذہن کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ دل جو اپنی مراد جانتا ہے۔

اب لکھتے لکھتے اچانک یہ دھیان آیا کہ کیا ہم خود کو اتنا جانتے ہیں کہ اپنے بارے میں کچھ لکھ بھی سکیں۔ پتہ نہیں میں نے کیا لکھا اور پڑھنے والے کیا پڑھیں۔ اپنے آپ سے متعارف ہونا مجھ جیسی ایک محدود علاقے میں عمر بسر کرنے والی کے اختیار میں کہاں۔

حقیقت یہی ہے کہ میں نے تو اب بھی جسے زندگی کہتے ہیں اس کی صرف جھلکیاں ہی دیکھی ہیں۔ مجھ جیسے روز و شب کے جزیروں میں جاگتے سوتے رہنے والے کیا جانیں کہ کس کا سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں پہنچا دیتا ہے۔ زندگی کے بحر بے کراں میں اپنا پتہ کس نے پایا ہے۔

حرف سخن اور وسیلہ اظہار نے بے شک دل کو آسودگی عطا کی۔ خوشیاں حاصل ہوئیں۔ مگر مسافر کو قیام سے کیا غرض۔ ایک راستہ وہ بھی تو ہے جو آنکھ او جھل ہے۔ وہ ایک ہی راستہ جو من مانی منزلوں کو جاتا ہے۔ مگر اس راہ تک پہنچنے کے لیے نہ جانے کتنے آفتاب درکار ہوتے ہوں گے۔ میرا سرمایہ تو صرف ایک چنگاری تھی۔ اسی کو راکھ میں دفن ہونے سے بچانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ بس ایک لگن ساتھ رہی ہے جس نے تھکنے نہیں دیا۔ اور میرے لیے یہی بہت ہے۔

کہ نامہ شوق • جو لکھا ہے
وہ نامہ بر ہوا کی
کھلی ہتھیلی پہ دھر دیا ہے

میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ انسانی شعور کا نقطہ آغاز بھی حیرت ہے اور مرکز انجام بھی حیرت۔ اس ابتدا اور انتہا کے درمیان گمان و یقین کی پناہیں تراشتے عمر بیت جاتی ہے۔ مدتوں پہلے وقت کے جادوگر سے اپنا پتہ پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں نے گردش ماہ و سال کی نیرنگیاں دیکھیں اور میں ہوں کہ آج بھی قلم کاغذ ہاتھ میں تھامے اسی طرح پلنگ کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ اور وہی جستجو اور وہی آرزو۔ بھید تو جاننے والا ہی جانتا ہے ۔

میں اندھیروں کو اوڑھ بھی لیتی
راہ میں ماہتاب آوے ہے